

مکتبہ اہل بیت علیہ السلام کے ادارہ

# نئے افق



کراچی کے نوگوریاز.....!!

پریم کورٹ آف پاکستان نے کراچی بد امنی کیس میں ریجنل زور کراچی پولیس کو یہ حکم دیا ہے کہ آئندہ سات روز میں کراچی سے تمام نوگوریاز کو لازمی ختم کر دیا جائے۔ ویسے تو کراچی پولیس نے اپنی حالیہ رپورٹ میں جناب چیف جسٹس کو سب اچھا ہے کی رپورٹ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چیف جسٹس صاحب ان کے اس جھانسنے میں نہیں آئے اور انہوں نے نہایت سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے ریجنل زور کو اور سندھ پولیس کو حکم دیا ہے کہ سات دن کے اندر اندر کراچی کے تمام نوگوریاز کو واقعی ختم کر دیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کس طرح کی جاتی ہے کیونکہ اب تک تو یہی ہوتا رہا ہے کہ عدلیہ کے احکامات کو ایک کان سے سنا جاتا ہے تو دوسرے سے نکال دیا جاتا ہے۔

کراچی شہر کے ہر محلہ اور گلی کو اتنی بیریزز لگا کر نام صرف عام لوگوں کے لیے بند کر دیا گیا ہے بلکہ اکثر و بیشتر تو خود وہاں کے مکینوں کو بھی اپنے گھر محلہ میں آنے جانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کے باوجود لوٹ مار مل و غارت گری کا بازار گرم ہے چین و امن نصیب نہیں۔ کراچی میں تمام ای سی سی جہاتوں کے عسکری ڈنگز کے بعد اب تو طالبان کی آمد کا بھی طبل بج چکا ہے سندھ خصوصاً کراچی ٹارگٹ کلرز کے ہاتھوں ریغال و محصور ہے اس تمام بد امنی مل و غارت گری کا بائسز بانڈ گون ہے کہاں ہے؟ جب تک اس کا پتا نہیں چلتا اس پر ہاتھ نہیں پڑتا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ تمام ملک دشمن قوتیں جو ملک میں بد امنی و ہشت گردی لوٹ مار مل و غارت گری میں ملوث ہیں وہ نہیں جانتیں کہ ملک میں کبھی بھی طرح امن چین کا زور ہو کہہ نہ لے بلکہ کہہ رہے ہیں کہ ان تمام کارروائیوں کے پیچھے خود انجینیئروں اور پولیس کا ہاتھ ہے ان سب کے منہ کو خون لگ چکا ہے جرائم کے ذریعہ ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ پولیس اور دیگر فعال انجینیئروں کو جاتا ہے تب ہی تو کراچی میں خصوصاً ہر قسم کے جرائم مکمل عام اور بڑی دلیری و جرأت کے ساتھ مسلسل ہو رہے ہیں کہتے والے کہہ رہے ہیں کہ کراچی میں بد امنی مل و غارت گری بہت خودی اٹھا برائے تاوان میں پولیس پوری طرح ملوث ہے پولیس کی نگرانی میں جرائم پیشہ افراد خصوصاً ایسے جرائم پیشہ جو حالات یا جیل میں بند ہیں وہ پولیس کی موبائلوں میں بیٹھ کر واردات کرتے ہیں اور اپنا آپریشن مکمل کر کے واپس اپنے محفوظ ٹھکانوں پر پہنچا دیے جاتے ہیں ایسے لوگ بے دھڑکتے ہیں اور اپنا کام کر کے مطمئنان سے چلے جاتے ہیں اگر کہیں کوئی ان کی شناخت بھی کرے تو خود پولیس اہلکار اس کی صفائی یہ کہہ کر پیش کرنے کو تیار رہتے ہیں کہ یہ شخص تو کب سے جیل میں بند سزا کاٹ رہا ہے اس پر تو مقدمہ چل رہا ہے۔ سنایا گیا ہے کہ پولیس کراچی کے ان جرائم پیشہ افراد سے روزانہ دو سے ڈھائی کروڑ روپے کماداری ہے۔ جس میں حصہ بقدر جیشیم ہو جاتا ہے۔

قاتلون و ہشت گردوں کی گرفتاری اور قاتلوں کی شناخت کے باوجود ان کی فوری گرفتاری سے ہماری پولیس معذور ہے اگر کہیں کوئی بد نصیب مجرم ان کے لگ بھی جاتا ہے تو کہہ سکتا ہے کہ گناہی ثابت کرنے کے لیے کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا کوئی ایم این اے یا ایم پی اے تھانے پہنچ کر اسے چھڑا کر لے جاتا ہے اور پولیس افسر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری سے معذوری ریجنل زور پولیس کی بدترین ناکامی کہلاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پولیس کے حمام سب ہی ننگے ہوں ان میں بڑی تعداد فرض شناس افسروں کی بھی ہے لیکن وہ بے چارے ان مفاد پرست اور جرائم کے

فروغ میں ملوث افسران کے آگے اپنی نوکری بچانے کے لیے مجبور و بے بس ہو جاتے ہیں ایسے ہی جیسے کوئی ڈاکو یا لہیرا صرف ایک ٹی ٹی یا کلاشنکوف سے پورے مجمع کو اپنے قابو میں کر کے اپنی مرضی کے مطابق قتل کر لیتا ہے بالکل ایسے ہی نوٹوں کی بارش برسانے اور سینے والے لوگ اپنی من مانی کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے ہتھیار استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پولیس اور خفیہ انجینیئروں میں جب تک ان کالی بھینڑوں کا صفایا نہیں کیا جائے گا نہ تو عدلیہ کے احکام پر عمل ہوگا نہ کراچی میں جرائم کی سطح کئی ہو سکے گی۔ فہشت گردی کا نیٹ ورک بڑی بے رحمی سے شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے جس سے پریم کورٹ بھی اضطراب محسوس کر رہا ہے۔ دہشت گرد اب اس لیے بھی کر رہے ہیں کہ شہری خوف میں مبتلا ہو کر اس کے مطالبات کو جلدی اور خاموشی سے تسلیم کر کے ان کے مطالبے کے مطابق جلد از جلد رقم ادا کرتے رہیں اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس اہل اور ذہین افراد کی کمی ہے۔ جرائم پیشہ گینگ اور جنگجو افراد پر قابو پانے کے لیے چوکس ذہین اہل جنس افسران کی فرض شناسی بھی ناگزیر ہے کبھی بھی خود کش حملہ آوروں کو حلالہ در ہونے سے پہلے ایسے ہی ذہین اہل جنس افسران نے گرفتار بھی کیا ہے۔ گزشتہ دنوں کورنگی کے حساس علاقے نمبر 5 ریجنل ہیڈ کوارٹر کے مرکزی دروازے پر جو ہلاکت خیز دھماکا ہوا جس میں پانچ ریجنل کارشید پانچ ریجنل اہلکاروں کے ساتھ دیگر چندہ افراد زخمی ہوئے تھے ریجنل کے ہیڈ کوارٹر پر دہشت گردوں کا حملہ باب اختیار کے لیے۔ تقیہ ایک کھلا چیلنج ہے۔ سابقہ وزیر داخلہ جس طرح اپنے دور میں پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رابطہ براہ راست دہشت گرد تنظیموں سے رہا ہے جن کی حرکات و سکنات کی خبر انہیں قبل از وقت ہو جاتی تھی اس کے باوجود ان کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا بس خبر نشر کر کے عوام کو خوف میں مبتلا کرنے کا کام انہوں نے بڑی خوبی سے اور محنت سے ادا کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت انبی اہمیت جتانے کے لیے اب بھی کہیں سرگرم عمل تو نہیں۔ یہ دیکھنا ایشیئن میں حصہ تولے گے ہی اور انکیشن کمیشن کی جانب سے مقرر کردہ ریٹرننگ افسران جس طرح سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اس سے اندازہ ہے کہ ان کا حراج ای بھی کہیں گل نہ ہو جائے۔ ان بے جا رول کو تو مسودۂ اخلاص بھی درست یا نہیں چھانیکھا یہ لکری یاد دہانی قوت کا پوچھا جاتا ہو سکتا ہے ایسے ہی محکمہ عناصر انکیشن کے اس عمل کو کووانا چاہ رہے ہوں اور تاک لگا رہے ہوں کہ کسی طرح انکیشن نہ ہوں۔

انکیشن کمیشن اور ان کی تمام پوچھ گچھ اور طریقہ کار سے لوگوں کو اعتراض تو ہو رہا ہے لیکن دیکھنے میں آیا رہا ہے کہ اس چھنی سے بڑے بڑے نامور چھنے سے ناکام رہے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو رہا ہے۔ بیشتر جنفاوری سیاست دان جو عسکرانی کے چکر میں عوام اور انکیشن بحث کو بے وقوف بناتے رہے ہیں تعلیمی اہلیت نا ہونے کے باوجود جعلی ڈگریوں پر سوار ہو کر ایوان اقتدار کے مزے لوٹتے رہے ہیں۔ اب اللہ اللہ کہ کے ملی کے بھاگوں چھین کا ٹوٹ گیا ہے اور ایسے جعل ساز ایوان اقتدار کی جگہ ایوان و لات یعنی جیل کی ہو اٹھا رہے ہیں اور آئندہ کے لیے سزا یافتہ ہونے کے سبب انکیشن کے لیے نال ٹرار پار ہے ہیں ہو سکتا ہے اللہ جو بڑا ہی مسبب الاسباب ہے وہ وطن عزیز پر اپنا رحم و کرم برسانے والا ہو اور ان پرانے گھاگ لوٹ مار کرتے والوں قتل و غارت میں ملوث سیاست دانوں سے وطن عزیز کو نجات دینے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ اہل وطن کو عقل سلیم عطا فرمائے اور انے والے اختیارات میں واقعی اہل اور پارسا امیدواروں کا بھی انتخاب کرے اور آنے والے حکمرانوں کے لیے صراط مستقیم پر چلنے والوں کا ہی چناؤ کر سکے اللہ تعالیٰ ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور ہمیں صراط مستقیم پر چلنے والا بنائے آمین

**عمران احمد**

عزیزان محترم۔۔۔ سلامت باشد۔

شہناز بانو۔۔۔ کراچی۔

**فقر افق 10**

ناز سلسلوش نشتر۔۔۔ ہیر پور، آزاد کشمیر۔ محرم چناب نهران بھیا۔ بعد از تسلیما ت خدا آپ سب کا پوئی حفظہ امان میں رکھے تھیں۔ اپنے بارے میں کیا لکھتا تھا کہ کتوں کو اس چیمبر کوئی کہتے اور فہم نہ تھی گزری ہو ہے۔ کچھ دار کے لیے استاد بہت سے ہندو باجھ کے لیے لفظاً اتنی گزارش ہے کہ میرے حق میں دعا کیجئے گا کہ خدا مجھ راہ راہت عجب کہے اور میری انھوں سے لائی شکایت میں کسی کرے مجھے سکون عطا کرے۔ بہت وقت بعد ظہور گری ہو۔۔۔ مصروفیات تو تھیں ہی، بس ذاتی طور پر اس قدر تھیں جتنے ہوں کہنا کچھ کرنے کو دل کرتا ہے نہ



[illegible]

لیے آپ کو اگلے ماہ 14، 15 دن قبل خدیجہ لکھ کر بھجوانا پڑتا ہے کہ جس کی راز ہے اس کی سی کار ریاض حسین قمر شکر یہ اور اب سرور شاد اور ذویہ شاد کو سیری طرف سے دینے کی بہت بہت مبارکباد۔ خدائے اس کی عمر دوا کرنا تین عصمت قبل غزالیہ طویل کار کا شکر ستر و آخر میں: داتا سے نئے افق میں اس سے قبل بھی ان کی بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ سید عبداللہ شاہد بھائی، اپنی پاکستان میں راز کرنا کی سیر میں ستر و آخر میں: داتا سے نئے افق تو بچھلے، مائیں نے خدیجہ لکھا جس میں قتاوہ و شائع کیے ہوئے۔ باقی رسالے پر کیا تبصرہ کر دلاؤ دھاپڑا حاسبانچی پھر مصرعہ فیات بھی بہت ہیں۔ ابھی بھی ایک شادی پر اک جانا ہے سو وقت بہت کم ہے۔ ہاں جاتے جاتے جاتے آپ کو ایک اچھی خبر دے جاؤں کہ پاپر میں مل جیسے ماہنامہ بشم کی طرف سے ایوارڈ دیا جاتا ہے میرے لیے عوام کیجیے گا۔ والسلام

ایک شاہین..... کراچی..... اسلام علیکم ورحمہم السلام! میرا نام احمد بھائی صاحب۔ امید ہے رب کریم سے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ اللہ پاک آپ پر اور ہم سب پر اپنی رحمتیں و برکتیں نازل فرمائے اور مصائب و ناگہانی آفات سے محفوظ و مامون فرمائے۔ میں۔ باقی سب قارئین محترمین، حاضرین و غائبین کاوش شاہین کی طرف سے سلام اور دعائیں اور خصوصی دعاؤں کی خواستگار عمران بھائی آپ کا کہنا بالکل بجا ہے، ہم و صول پر تو فکر کتے ہیں مگر آپے میں جھانکنا بالکل بھی بیوقوفی کرتے اگر تم سب اپنا غائب کر دیں تو ہمیں سب دشمن ہو جائے گا کہ تم کہیں ہیں اور کس رخ پر جا رہے ہیں۔ اگر ایک بار ہم نے اپنا غائب کر لیا ہے گریباؤں میں اپنے داؤں میں جھانک لیا ہے اعمال کو درست کر دیا ہے یا تو کایہ پلٹ سکتی ہے ہم خود کو سدھار سکتے ہیں و یسے بھی تو ہمارے 24 گھنٹے مصروفیات میں گزرتے ہیں کام کرتے آگئے بیٹھے سوتے جاگتے کھاتے پیتے کچھ کام کسی مقصد کے تحت ہوتے ہیں اور کچھ بے مقصد بھی کبھی کام ہوتا ہے مگر مقصد کے بغیر حقیقت میں کوئی بھی کام بے مقصد نہیں ہوتا اس کی تردید میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور چھپا ہوتا ہے اگر ہم چاہیں تو ہمارے چلتے بھاڑ اور اگلے قدم بھی ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتے ہیں اور ہمیں دونوں جہاں کا ثواب مل سکتا ہے اور دونوں جہاں کی کامیابی کے لیے اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو برکت ہر جگہ ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہمارا منظر ہے چاہے کوئی اس طرف آئے نہ آئے لیکن یہ سچی کے لیے باعث خبر و برکت ہے اور ہمارے اعمال کی اصل اور افادیت کے لیے اللہ نے ایسا فارمولہ تلاش کیا ہے جو ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جس نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا وہ قاض بھی ہوا تو ایسے شخص کو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہی ملتا ہے اور ایسے بندے پر تو کوئی خوف ہوگا اور ناسی و ناممکن ہوگا غرض یہ کہ احکام الہی اور اتباع سنت میں ہی ہمارے بھائی ہیں اور حصول زندگی ہے جس ہمارے قدم بڑھانے اور پہچاننے کی دہر ہے خیر جس طرح برائی کے پیچھے برائیوں کی لائن لگ جاتی ہے اسی طرح ایک منگی کے بعد نیکیوں کا تانتا گفتگو میں کرسی صدارت پر عالیہ انعام الہی تشریف فرما ہیں سلام تبصرہ خوب تھا۔ دوسرے نمبر پر جناب صدیقی صاحب بیٹھ کی طرح جاعاد اور شامدار کے ساتھ حاضر تھے پھر ریاہت بھائی کا نمبر آیا سلام بھائی چوڑی فروش بھی خوب رہی۔ ”آؤ دھم دھم“ کی آخری لائن سمجھ سے باہر بھی کر دی، آؤ دھم دھم ہی ہے۔ اب اس کا کچھ جواب تو آپ ہی دے سکتے ہیں انجمن صاحب اور عصمت صاحبہ مختصر تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ صابر اور نگاہ اسلام صاحبزادہ کو یاد کیا کئے گا شکر ہے۔ ویسے میں غیر حاضر نہیں کیا گیا ہم خود ہی غیر حاضر تھے یہ تھا شاد و بہت کی بنا پر۔ شیر احمد بھی صاحب کے بعد عبداللہ شاہ صاحب طویل ترین تبصرے کے ساتھ شامل گفتگو تھے۔ ارے گفتگو کی محفل والو، ہم کچھ عرصے غیر حاضر کیا ہوئے (باعث حالات) آپ نے تو مجھے یاد رکھا تھا یہ چیزیں ہمیں سب یاد یوں کوئی یاد کرنے کے آخر میں عبداللہ صاحب بھی کی ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضری لگوائے آ ہی گئے۔ بانی شہناز خانی شہنائی آئی اور بہت سے لوگوں کی کئی محسوس کی گئی ارے سب اپنی مصروفیات سے نکالیں کچھ وقت اور حاضری لگوا دیں ورنہ.....! اقر اسے سبق حاصل کرنے کے بعد جو رہتے ہیں نوشا، عادل صاحب کے ناول ”مفرد“ کی جانب جو کہ نہایت کشادہ طوفانی ہو گیا۔ زریں قرقر کی ”گناہ گار“ زبردست تھی بہت پندتانی چونکہ ماں کے حوالے سے بھی سو ایں محسوس تھی کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے کیونکہ ماں تو آخر ہے نا احمد حنیف صدیقی صاحب کی ”تیسرا گامک“ بھی شامدار ہی۔ شریک سفر ابھی پڑھی نہیں۔ شہناز بانو آئی کی ”گروش“ ابھی خوش گروش ہے اب یہ انجان شخص کہاں سے اور کیوں ایک پڑا خیر خواہ لگے سینے ہی پر تالچا۔ چوڑی فروش کے بارے میں تو تم کہہ ہی چکے ہیں واقعی حقیقت جاننے کی ضرورت بھی جو کہ غم و غمش کے وجہ سے جاننے کی کوشش نہ کی۔ ذات کا ٹکڑا کار کا غاڑ و دھوؤں میں ہوا جو کا کٹھنہ قسطوں میں ہی بھجوائے گا۔ دلاخو مسجد بھی اچھی لگی۔ نامتے جیسی کہناؤں کی واقعی میں ضرورت ہے شاید کہ انہیں پڑھ کر لوگوں کو کچھ فائدہ نہ ہو جائے۔ خوش تو بخش میں عبداللہ شاہ کی غزل اور ریحانہ صاحبہ کی نظم کر جیسا اور دونوں نے محر کی نظم جرجاں میں مل کر ہے۔ وہ پسند آئی اور سب بھی اچھی تھیں۔ ذوق اب گہمی ہمیشہ کی طرح زبردست ہوا۔ آخر میں گنگا کا پھیلاؤ پائینس اب پاروئی کے لیے کتے پاؤں پلٹے پڑیں گے۔ تکلیف وہ باتوں کے لیے معذرت اور کوئی بھول چوک ہوگی ہو تو رگڑ کر دیکھیں گا خصوصی دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت۔ اللہ ہم سب کا اور پاکستان کا حامی و ناصر ہو۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال..... السلام علیکم ورحمہم السلام! میرا نام اہل بریل 2013 کا شمار مغز ضرور ورق ہے 20 مارچ کو ہی بے قرار نگاہوں کے

فنی افق 13 مئی 2013ء

تہذیب افق 12 مئی 2013ء

سائے طاوہ اور ہر ہو گیا۔ کیا خوب صورت سروق ہے۔ آگے بڑھتے تو قبرست میں اپنی کہانی دیکھ کر بے اختیار نعران بھائی اور سنے افق کے دیگر علماء کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ خدا آپ سب کو سلامت رکھے اور ہمارا پیارا چچا اور اہل و عیال کو اور اہل و عیال کو بڑی برکت دے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب بھارت کے گھناؤنے اور ہرے چرے سے پردہ افکار ہے اور ہر ایک کے اصل مقصد اور چہرے سے بھی پردہ افکار ہے ہیں۔ اب سنا ہے کہ انکسٹن ہونے جا رہے ہیں ہماری دلی خواہش کو روکا جائے کہ ایسے اہل اور محض حکمران آئیں جو صرف پاکستان کا مفاد و مصلحت خاطر رکھیں۔ ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ فتنہ کھڑا کر کے روکنا اور تاریخ ہمیں بھی معاف نہیں کرے گی۔ اب بڑھتے ہیں اپنی بیداری عقل کی طرف غالبہ انعام، بہن حسب معمول اپنے خوب صورت اور گھبراہٹ لیے ہوئے تبصرے کے ساتھ بہت خوب۔ ہر بات پر سیر حاصل بحث کرتا آپ کا ہی کمال ہے۔ اللہ کرے اس کمال کو بھی ذرا دل نہ دے۔ میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکر ہے۔ این مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ جتنے اچھے لفظوں سے یاد کرتے ہیں میری کہانیاں پسند کرتے ہیں اور ان کے مختصر ہوتے ہیں بہت احسان ہے میری بات ہے آپ کا تبصرہ ولا جواب ہے اس بات کی کہانی تو جیسے اور اراہدہ جیسے انجم غبار حق ساطی صاحب یاد کرنے اور کہانی پسند کرنے کا شکر ہے۔ ریاض حسین قرآنی نے بڑے دلچسپ موضوع کو چھیڑ دیا۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا یہاں سید ہارے کے کس کس بات کا رد کیا تو میں۔ آپ کی غریبیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں۔ میری کہانی اچھی نیز میری پسند کرنے کا بے حد شکر ہے۔ عصمت اقبال عین بہن کسی ہو بھائی کی کہانی پسند کرنے کا شکر ہے۔ آپ کو ہوں کہ حوصلہ افزائی کی وجہ سے لکھ رہا ہوں۔ محترم فقیر بخش رنگہ صاحب آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے محفل میں برکت ہے آپ کے خطوط کا انتظار رہتا ہے اسی طرح جس طرح آپ میری کہانیوں کے مختصر رہتے ہیں اور ان میں پسند کرتے ہیں۔ خدا آپ کا دم ہمیشہ قائم رکھے اور آپ کے اہل و عیال کے ساتھ برکت اور توازن رہے۔ عبد اللہ شاہد بھٹی شکر ہے۔ عبد الملک صاحب موبائل شاپ کا افتتاح مبارک ہو۔ اس بار بہت سے بہن بھائی غیر حاضر ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ فوراً آجائیں۔ ان کے بغیر نفل سوئی ہے۔ اب کہانیوں کی طرف کی طرف ہیں۔ بہن شہناز بانو کی گزارش کی یہ قسط پہلی قسطوں سے زیادہ شاندار رہی۔ اب دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے؟ صحیح بیانیوں گھر وہندہ حقیقت خائفہ اور دوشیہ اندام شہادت کٹ سب کی سب اچھی ثابت ہوئیں۔ غریبی ادب سے انتخاب بھی خوب رہا۔ ناول ابھی زیر مطالعہ ہیں اس لیے آئندہ جرمہ کروں گا۔ اب بات وہاں سے باقی سلسلوں کی خوشبو خوشی میں سلی غزل کی غزل سید عبد اللہ شاہد کی غزل غالبہ انعام کا انتخاب یہاں عیدہ کی کرچیاں عصمت اقبال ریاض حسین قرآنی تدریرا اور ڈاکٹر واجد گدوئی کی غزلیں بھی پسند آئیں۔ ذوق آگئی میں بشیر احمد بھی خالصہ محمود خان میرانی کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ جبکہ بانی انتخاب بھی تشریف کے قابل ہے۔ صفحہ پندرہ بھی نہیں لکھی اپنی جو جگہ سے پر سچ کی شان بڑھادی ہیں۔

**ریاض حسین قیصر..... منگلا ٹیم.....** محترم اکرم جناب نعران احمد صاحب سلام شوق امید سے مزاج گرامی خیر ہوں گے۔ امید واثق سے آپ اور آپ کا سامی ٹم۔ پوری لگن اور تدری سے سروق کار ہوں گے۔ اللہ رب اعز آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور سب کو عیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ خوب صورت مگر پر اسرار نائل والا اپریل کا شمار میرے سامنے ہے۔ بزرگوار جناب مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ہمارے لیے چشم کشا ہے آپ نے دستک میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم سب جانتے ہیں پھر بھی بھارت جیسے ازلی اور ابدی دشمن کو پسندیدہ ملک قرار دینا ان سے بیاری کی تنگیں بڑھانا ان سے تھپاری رابطے پر جانے ہمیں مذہم و مروتوں سے ہم بائیں آتے ہم میں جیسے میر جعفر میر صادق اور اوداد جیسے رسوائے زمانہ لوگ ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے خدا کے واحد میں سمجھ عطا فرمائے آئیں۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے جو احادیث ہم تک پہنچائی ہیں ان سے ایمان کو بہت تازگی نصیب ہوئی ہے۔ آقا کریم کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ ہی ہمارے دلوں کا رنگ صاف کرنے کے لیے کافی ہے۔ افراس جناب طاہر قریشی صاحب ہمیشہ ہی ہمارے لیے زندگی گزارنے کے سنبھلے اصولوں سے متعلقہ احادیث سے ہمیشہ ہماری رہنمائی فرماتے ہیں خدا انہیں اور عظیم عطا فرمائے گفتگو میں اس بار پھر سے غالبہ انعام اپنی صاحب ایک بھر پور تبصرہ کے ساتھ کر سید صدارت پر متحکم ہیں جس وہ ایک اچھی کو سن کر دانی اچھی تبصرہ نگار ہیں۔ وہ کہانی کا تمسک مطالعہ کرتی ہیں اور پھر اس پر بہت ہی اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ میری محترم سے گزارش ہے کہ براہ دانا غلط گفتگو میں حاضری کو کھینچنا نہیں امید ہے وہ میری اس گزارش کو بخیرہ لیں گی۔ پیار سے بھائی این مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب نے جس طرح اس ناچیز کی بات کا بیان رکھا اس بات نے میرا سفر سے بلند کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے اور اس کے بدلے آپ کو خوشیاں عطا فرمائے آئیں۔ محترم ریاض صاحب بھر پور تبصرے اور اپنی صحیح بیانیہ جڑی فروش کے ساتھ تشریف لائے ہیں میری رائے میں انہیں اپنے قدم پر پوری کمان حاصل ہے وہ بہت اچھی اچھی تخلیقات ہمارے لیے لا رہے ہیں اللہ کرے ذہن و قلم اور زیادہ۔ عصمت اقبال عین صاحبہ مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔ ان کے بارے میں میں نے پہلے بھی ایک بار لکھا تھا کہ وہ شہادت بینڈ کی ماہر معلوم دیتی ہیں۔ بہت ہی محترم فقیر بخش صابر رنگہ صاحب اپنے بہت ہی پیارے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے گفتگو میں شمولیت کے لیے میں اپنی طرف سے اور محترم زنگہ زنگہ نے افق کی طرف سے دل کی اتھارہ گہرائیوں سے شکر ہے ادا

کرتا ہوا آپ جس طرح سے بیارعت کے یہ پاری ہیں اس میں آپ کا مقنا بلکہ کوئی نہیں کر سکتا۔ خدا نے ہم پر آپ کو ہم میں مادہ موجود رکھے اور آپ کی محبتوں سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے آئیں۔ آپ کی مالی صاحبہ کے انتقال کی خبر سے دلی صدمہ ہوا اللہ کریم مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور انہیں کو ہمیں قریل اور اس پر اجر عظیم عطا فرمائے آئیں۔ آپ نے محفل سے مسلسل غیر حاضر لوگوں کو جس پیار اور محبت سے صدارتی سے یاد کیا ہے ان کی منفرد شخصیت کو زیادہ امید ہے سب سامنے آپ کی صد کو کھدا مسخر انہیں ہونے دیں گے۔ جناب بشیر احمد صدیقی صاحب اپنے مخصوص انداز کے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ بشیر بھائی تبصرہ پسند فرمائے گا شکر ہے۔ برادر سید محمد عبد اللہ شاہد کا تبصرہ حسب سابق بڑھ چڑھ پورا اور جادہ تھا۔ انہوں نے قلم کاروں کے دیکھ کا احساس جس طرح دیہیہ محترم کو دلایا ہے وہ بین حقیقت پر مبنی ہے۔ ہمارے بہن عزیز میں فکر کروں کہ وہ پیراں نہیں لکھیں جو ان کا تعلق ہوتا ہے اور قلم کاروں کی طور پر عجیب عجیب باتیں سوچنے لگتا ہے۔ مگر میں نے گزشتہ ماہ ان مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب آپ کے بارے میں ایک گزارش کی تھی جس کو ان مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کی طرف سے کافی پذیرائی ملی کہ آپ کی طرف سے ان کے لیے ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا۔ شاید بات طبع ناگزیر یا ناگوار گزری ہے۔ پیار سے بھائی اگر ایسا تو اس گستاخی پر دل کی اتھارہ گہرائیوں سے معذرت فرمادیں۔ اس خرم جناب عبد الملک کیف صاحب تشریف لائے ہیں کیف محفل کو رونق بخشے رہا کیجیے۔ تبصرہ پسند فرمائے گا شکر ہے۔ اس بار محفل میں آئی شہناز بانو کی شدت سے محسوس ہوئی۔ قسط دار کہانیاں تو خیر اپنی مثال آپ ہیں خاص کر آئی شہناز بانو کی گزارش آپ پر جاری ہے اپنی جگہ کہانیاں اور مغرب سے انتخاب اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ تمام مصنفین لائق صد مبارک ہیں۔ روحانی مسائل کا دل کھل کر دو کے ماروں کے لیے دو ماہ سے کہیں۔ ربہم محترم شہیر احمد صاحب کو سخت تندرستی اور اشتیاق عطا فرمائے آئیں۔ خوشبوئے سخن میں سلی غزل کی دونوں غزلیں خوب تھیں آپ اچھا لکھتی ہیں۔ اسے سید عبد اللہ شاہد آپ کو اتھارے خاص غزل گوشا فرمیں۔ آپ نے خواہ اور اپنے آپ کو گیت نگاری تک محدود کیا ہوا ہے۔ غزل احمد اور غزل میں طبع آزمائی کیجیے جو اور غزل اس یقین کے ساتھ لکھیں کہ رب العالمین اور رحمتہ اللعالمین کے حضور پیش کیا گیا کوئی ایک شعر بھی ہمارے لیے تو شاد خرت ثابت ہو سکتا ہے۔ جناب سید جمال قدر اور ڈاکٹر واجد گدوئی صاحب عصر حاضر کے شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا سارا کلام قابل ستائش ہوتا ہے۔ عصمت اقبال عین صاحب بھی اچھی غزل لکھتی ہیں اور یہاں عیدہ صاحبہ اور فروزہ صاحبہ کا گیت صاحب کی نظمیں بہت اچھی ہیں۔ محمد فہیم اختر شجاع جعفری اور اسلم جاوید کا کلام بھی اچھا ہے۔ ذوق آگئی میں بشیر احمد بھی حسن اختر عبد النور انصاری خالد محمود خان شکیل احمد اور جناب ریاض بہت صاحب بہت خوب صورت تحریر لائے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

**شجاع جعفری..... تلہ گنگد۔** السلام علیکم نعران بھائی امید ہے کہ آپ کا سارا ایشاف خیریت سے ہوں گے۔ سنے افق کا نائل بہت اچھا آگے سلسلہ اقرابہ کر ایمان اور مضبوط ہوا۔ اس کے بعد کہانیاں پڑھنا شروع کیں۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ناخوش گوشت کا پیچاری تو میری فوٹ سے۔ وہ بہت اچھی جاری ہے۔ خوش خوش میں فوٹ پر یہ حیرت انگیز کتابت کی فکر ہم اچھی کی پسند آتی۔

**محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد۔** بڑی آرٹھیلی ملاقات کی۔ سدا سلاست رہو جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں موسم کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے اس دل اور تھکے تھکے جذبات کے ساتھ شہر جانے کا اتفاق۔ واکانی ڈوں بعد وہاں ایک اسٹال پر سنے افق ماہ اپریل 2013ء کا تازہ پریچہ کد کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ سروق پہلے سے زیادہ بہتر تھا۔ اسرا خوش نما پر چڑھنا آگے اپنی کا کام ہے مبارک باذوق کر میں۔ غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ جس طرح ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں آپ دلوں کے سخن ہیں۔ یہی جذبہ میں آپ کو خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ اس پہچانی کے دور میں کا سب تحریروں اور گردش رگوں سے مزین پرچہ کا کلاس کا سہرا آپ کے ساتھ ہے۔ ویسے پرچے کے سارے عنوان اپنی جگہ پر اچھے ہیں جیسے انگوٹھی میں گلیہ فٹ ہو۔ مثلاً اقرا گفتگو دستک میں خطوط پڑھ کر قارئین کے نیک خیالات سنے افق کے بارے میں خوش ہوئی ہے جن کہانیوں سے میں متاثر ہوا مثلاً گھر دندہ نامت، حقیقت شریک سفر، گناہ گار گردش ان فکر کاروں کو میری طرف سے مبارک باد۔ خوش بوٹوں ذوق آگئی اور روحانی مسائل بھی اچھا سلسلہ ہے۔ ہر لحاظ سے سنے افق اپنی مثال آپ ہے۔ پرچے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ براہ پرچہ کامیں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے خدا آپ کی تکرار کرے اور صحت سے تحریریں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ پرچہ کو معیاری بنانے کے لیے کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر۔ دیکھ۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

**سلمیٰ غزل..... کرچی۔** محترم نعران صاحب السلام علیکم! کبھی کبھی تو آپ اس طرح چونکا دیتے ہیں کہ شکر کے الفاظ گم لگتے ہیں اور شکر کا بھی رنج لکھ دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ اپریل کے سنے افق میں آپ نے میرے مضمون کے ساتھ ایک نشہ و شور و دوزخیں لگا دیں دل خوش ہو گیا اور اس کو کشش میں ایک مضمون تیار ہو گیا۔ "رضوتوں" حیرت کے بارے میں اتنا ہی کہوں گی کہ بالکل سچی کہانی ہے صرف



**طہارہ جبین تارا۔۔۔ لاہور۔** محترمی مرزا صاحب! واجب امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ ابھی نئے افق زیر مطالعہ ہے کیونکہ اسلام آباد اور کراچی کے سلسلے میں جانا پڑا اور وہاں سے واپسی 23 مارچ کو ہوئی اور یہاں کانٹنمنٹ ورکشاپ کے سلسلے میں ریفرنسنگ اور پھر لوکل ورکشاپ بھی کرانا پڑی جس کی وجہ سے نئے افق کے چند سلسلے ہی پڑھ کر ہی ہوں ان شاء اللہ اگلے مہینے بھرے کے ساتھ حاضری دیں گی۔ اب ایک کہانی اور نظم ارسال کر رہی ہوں امید ہے کہ نئے افق میں جاوے کے منگھو فرمائیں گے۔ نئے افق جانے والے سب لوگوں کی خدمت میں پشواں سلام۔

فقیر محمد بخش صاحب لنگاہ..... خانیوال۔ محترمی دکنی عمران احمد صاحب خوش رو مولانا ارماداد آباد ہوں۔ میں آپ سب دوستوں بزرگوں بہن بھائیوں کی دعاؤں کے طفیل خیر خیریت سے ہوں اور آپ سب بھی بفضل خداوندی خلیک شاک ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ مایہ ناز سے اسی مہینہ 18 مارچ کو بذریعہ ڈاک وصول کیا مرسول پر پندرہ اسی مہر صاحب کو مبارکباد پیش ہے۔ ماضی و اشتہادات سے گزر کر اسٹ مضامین میں حق بیانیوں سلسلہ اور تازہ جرحہ اور ناظر کے مفول مضمون کی لڑائیوں کے نام سے کہتے ہوئے ملے۔ وہ خوب انداز دل ربائی تھا۔ مگر ماشاء اللہ صاحب احمد صاحب کی صدا بہار کو نوازیں کے طفیل فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کے ہر سال کر وہ کسی بھی رنگ کو جگہ شدی کی گئی۔ جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں یہ بھی ایک سبق بتا ہے بڑھتے کا محنت کرو جو ان محنت سے کام ہوگا۔ دستک مل کر قریبی صاحب نے کچھ دوا دھر بھیجی جیسی سبق آموز دستک دے کر میں خیر واد کرنے کی کوشش کی کہ خوشی جاگوں و شیار ہو اور ساتھ ہی دعا کا اندھ پاک ہمارے حال پر دم کرے اور پاک چین دوستی کو نظر بند سے بچائے تو سامیں اگلی دستک کا انتظار ہے گا۔ خوش رہنا اور نہ غم نہی صاحب فقیر کی ولی دعا ہے۔ مختلف میں عمران احمد صاحب نے مسلم شریف سے حدیث نبوی خوش کر کے مغلل نئے افق کو جاہول طرف سے دینی خوشیوں سے مزور کر دیا دل خوش ہو گیا۔ مختلف کی مغلل میں دس بہن بھائیوں نے جھل لیا اور خوب دل قبول کر باتیں کیں۔ میں جس فقیر صابر لنگاہ کو بھی شامل کیا گیا جس کے لیے عمران صاحب کا شکریہ۔ باقی مغلل میں شامل تمام بہن بھائیوں صدارت کی کرسی سنبھالنے والی عہزہ کے ساتھ ساتھ جو مغلل سے دور ہیں ان سب کو بھی میری طرف سے ولی سلام دعا میں اور پیادہ کاغذ رائد پیش ہے اور درخواست ہے کہ میرے حق میں بھی دعا سے خیر کر دیا کریں۔ اقوام میں طاہر قریبی صاحب نے دل میں روشنی کی ایک کرن کی تبصرہ دیا اگلے حق کا انتظار ہے گا۔ باقی سلام محبت اور دعا میں۔ سامیں محنت کی گرمائی کی وجہ سے ناپائیدار ابھی مطالعہ نہیں کر سکا۔ یہ تو ایک قسم کی حاضری اپوری کی ہے محنت کی بحالی پر مایہ ناز کو پڑھوں گا پھر اگلے مایہ حاضری ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی السلام

[illegible]

بازوؤں کو پھیلائے کو کیلی سنا، چ ہلاڑی چٹاؤں پر یوں ازنا نظر آ رہا ہے جیسے لمبی مسافت طے کر کے پہنچا ہو اور اب کسی چوٹی پر ہمیں آ کر نہ کے لیے پیچھا کر رہا ہو۔ بے شک سرور علی لا جواب ہے لیکن اس کی منظر کشی کو بیان کرنے کے لیے الفاظ محدود ہے اور گوارا ملتا ہے کہ یہی کی جاسکتی ہے۔ آگے سے اتنے کی تعداد میں کھینچے ہوئے ہوتے ہوتے فرسٹ پر نظر میں دوڑا آئیں اس بار درگاہ رنگت ختب خبر میں ہیں محمد حنیف قادری اور محترم صاحبزادہ جادو دیتے ہیں کارادیوں کی کاشوں کو شال اشاعت کیا گیا تھا اس لیے گونا گونا طور طیت کا احساس، وہ اب قیاس اس کے منتخب کہاؤں پر درائے زنی کروں میرا خیال ہے کہ پہلے گفتگو کے احباب سے پرسش سوال ہو جائے گفتگو میں سب سے پہلے مسلم سے مروی حدیث کا مطالعہ کیا جو پہلے نکلے کی موثر اور عام فہم گفتگو میں توضیح تھی۔ 20 جملوں پر مشتمل تجرید میں بھائی عمران احصا نے زمرہ المعروف کے کسی حکم پر لیکر نہیں کیا تھا۔ بد عنوانی اور حرام غوری کی بد و جس موضوعوں تک وہ ملی پاکستانی قوم اور اس کے انٹر لبرل سیاست دانوں کو جو گوشہ 67 برسوں سے ہم پر حکومت کرتے رہے ہیں خوف خدا کے لیے کیسے چرے نہیں لگائے تھے لیکن معدلت کے ساتھ بڑی کارفرم ہے جو نہ تو لگی ہے۔ اس کرپشن کو اپنے لیے حق بجانب قرار دیتے ہوئے ہم، ہیئت پین سے کہتے ہیں کہ گھڑا چارہ سے دوسری کے گاتو تو کھائے گا کیا۔ پاکستانی حکمران اور سیاست دان ان کی کسی آؤ نہ کر ہمارے غریب عوام پر کیا کیا ظلم نہیں کرتے آئے ہیں اور یوں پروہ یہ بے ایمان وزراء، سپروڈھارٹی اور ان کے ہم کاب ساتھیوں کا دم بھرتے نہیں رہے ہیں اس لیے مختصر کہاؤں گا کہ ہمارے اداروں میں کرپشن کے خاتمے کے لیے انکیشن سے پہلے انقلابی طریقوں سے احتساب اور نظریہ کا مکمل ہونا چاہیے تاکہ ملک دو کامیاب اور اور بہترین قیادت میں آجائے گا۔ جناب مفسر باہر قریبی کی اتر کے ڈیرے دوسرے وفد کے اسلندہ دین اسلام کے پیاسے مسلمانوں کے لیے آب حیات ہے انہوں نے اتر کے صفحات کے حدود میں اس خطا اس ولایت کے موضوع پر بہل اور کھلے اظہار لفظوں میں مسلمان مومنین کی رہنمائی فرماتے ہوئے واضح کیا کہ رجوع الی اللہ کی طلب رکھنے والے بندوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اخلاص دل سب سے مضبوط اور پائیدار رشتہ ہوتا ہے جو بندے کو نصیبت کی برکات و فیوض سے بہرہ ور کرتا ہے اور نام و نمود و معزز کو مریب کی بھول بھلیاں ہیں۔ اس کی چکاچوند بھندے کا لے فیض کے لیے آئندہ کی زندگی مانفد ہوتی ہے جو اسے خوب صورت اور موصول و محبوب باور کرتا ہے اللہ عزوجل ہمیں صدق دل سے دینی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ اس وفد روحانی علاج میں حافظ شہیر احمد نے پانچ صفحات پر خواندین اور حضرات کے مسائل کے جوابات دیے اور دلائل و تجویز فرمائے۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ دعویٰ وظائف بیان کرتے وقت عام لوگوں کے استعمال کا نوٹ لکھ دیا کریں۔ اس سے رنگور کارکن بھی بعد ضرورت مستفید ہو سکے گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ بھائی عمران احمد آپ اعلاہ کر لیجے کہ گفتگو کے صفحات پر آپ سے بات چیت کرتے ہوئے میں نے آپ کے متراب احباب سے بھی مختصر اخبار خیال کیا ہے کسی فرد واحد کا کیوں آف اسپرٹ اس کی خوبی و کمالات کہاں تک ساتھ نبھاتا ہے کیا اس کی سیاف کا سر مشین کی حد نہیں ہوتی میرے بھائی؟ میں نے نہایت عاجزی سے اس کے مدد باب کی درخواست کر رہا ہوں کہ اکیلی وہی کے لیے ہر ایک نفسانی تقاضوں کو ہر بار خوش دلی سے نبھانا ممکن نہیں ہوتا مزید یہ کہ آپ میری کہانی ”خواب گاہ“ کو براہ کرم جلدی شائع کر دیجئے تاکہ گفتگو کی طوالت غیر نامہ نگاری سے جان کو خلاصی اور قلب و دنگا کو نون و لمانیت لے۔ اس وفد مسند اول پر سسر عالیہ انعام امین کو پر تمکنت لکھیں گفتگو کرتے ہوئے پایا تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ میری طرف سے ان کو صدارتی کرسی سے شرف یاب ہونے پر دلی مبارک باد۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ خواتین میں سب سے عمدہ تقادار۔ بیاتہ بصر کے القاب عالیہ جی کے لیے وقف کر دیے جائیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ ہر کہانی سے انشے و بیاب ہمالی اور پرسوں اثرات کو حقیقی مصائب رائے زنی سے تحریر میں لاتی ہیں دیگر خواتین بھرہ دنگوں میں ایسی سرور و گلمر چشیدگی پر چڑھتے کو نہیں ملتی۔ دوسرے گفتگو میں عالیہ جی کے جملوں میں وہ دل آویز کنندہ جملہ لاتا ہے جو لوگوں سے انگارہ ہوتی کسی بھائی سے دستیاب نہیں ہوتا۔ میرا ان سے ایک سی شکوہ ہے کہ وہ محفل میں دیگر شریک نہیں ہوتیں۔ سسر عالیہ ام نے کہا ہے کہ میں نے کچھ مرحل اور مربوط اعلاہ میں الفاظ کا چناؤ کیا ہے اور پے سٹے جملوں میں تبصرہ کیا ہے حالانکہ میں نے نارلی بیڑائے میں رائے زنی کی جسے تمہاری حسن نگاہ نے نکش اور خوب صورت قرار دیا۔ اس بندہ پروری کے لیے باتا مل کہنا چاہوں گا کہ نئے افق میں تم باحد کو لیک جو جو خوبی کچھ سکتی ہے کہ دراصل تم نے اس اور اس اور تحیراً سر نو کہ تم جان کر پذیرائی بخشی ہے جیہ خرداں پر نہیں مضروب دل پر گرگرتا ہے اور جسے کو تازہ نگاہ نہیں پرکھ سکتی۔ محترم امین مقبول صدیقی اس بار خلاف توقع سر میں سکدوسے نمبر پر کچھ مختلف اور مقبول انداز میں تبصرہ لیے حاضر باش و کمائی دے رہے ہیں لیکن بھائی عمران احمد چند منٹ تبصرہ بیان سے پہلے میرے تخلص دوست دانش حسین قمر سے عرض کروں گا کہ یاد قمر نے فروری کے پچیس میں صلیبی صاحب کچھ سے اشتعالی رویہ اور متصادم رائے زنی پر جو سب جہتی کا پیغام دیا ہے وہ پڑھتے ہوئے تمہاری عاجزی اور غیر مامعوم ہوتی ہے یوں مجھے صدیقی صاحب اور خود میں ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے ہوں۔ میرے دوست اشتعالی پانڈے دیگی کی صوبت اٹھانے والا ابا کاغیور ہوتا ہے جو اپنے اللہ کی رضا و خوشنودی سے اس آزمائش کو قبول کرتا ہے اور اس کا فیصلہ آنے والے وقت اور حالات پر چھوڑ دیتا ہے۔ صدیقی

صاحب اور میر سے درمیان تھے جس پر غلوس جذبے سے تاشکی کا کردار ادا کیا ہے اس کا عواضہ چکا پائیش جاسکا لیکن تمہارے لفظ لفظ سے عود کرتا ہے والی تیر کی احساس دلانی ہے کہ مجھے تمہاری پر غلوس اور پھر رفاقت پر غرور و تکبر کرنا چاہیے کہ تم نے ایک ناقول اور کردہ کی حمایت کو محسوس کیا باری تعالیٰ تمہیں جس نیک کام کی جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ لیکن ان مقبول جادو یا صدھ لیتی شہ آپ کی طرف ہو جاہوں یا نہیں بچا ہے ہوئے۔ غلوس دل سے بغل کیر ہو کر شکر ہو جا جس میں مجھے دہنوں ہاتھ اپنی انگلیوں سے باہم جوڑ ملا لیتی ہے سد اساتھ جھاننے کے لیے اور ایک جاں دو قلب ہونے کا اثر کر کے کے لیے لیکن آپ بھائی عمران انھوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ بھئی زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا اگر مصافحہ کرنے کے دوران آپ کا ہاتھ میری کمر کی چوٹ پر پڑے گا تو میں دروازہ کے لیے بیچوں گا بھی لیکن آپ سے ہرگز شکوہ نہیں کروں گا۔ بس ایک مہی گز ارش ہے کہ پر غلوس دوستی کے اس نئے عہد کو اس کے تقاضوں کو بھول مت جائے گا اور سنے رہا ہا آپ کا دلچسپہ تہرہ پڑھنے کو لے رہا ہے لیکن ہر لطف حقیقی اعتباراً قیاس کیوں نہیں لکھ رہے ہیں جن کو دین خصوصیت سے پڑھتا ہوں اور فحش شاعری بھی ارسال نہیں کرتے کیوں جناب مقتدر؟ محترم ریاض بہت متعلق داری کے تھانے کو نبھاتے ہوئے آپ نے میری تخلیقی صلاحیت کو بغیر طور پر سراہا بہت شکریہ۔

"راہداری" آپ کا چناؤ اقتباس اچھا لگا انہم نادر و ساعلی کا غالبہ ماہ بعد محفل میں حاضری لگائی ہے قدرے تاخیر سے ڈیڑ گھنٹہ پہلے سے ہوائے ہفت اقلیم کے منتخب شہزادے لیکن شکل شکوے کے باقوال کر رہا ہوں تمہاری کہانیوں کا ہوش یا طلسم ان دنوں "نئے افق" میں دکھائی نہیں دے رہا بلجادی سے کوئی بہترین پر اسرار قسم کی کہانی پڑھاؤ نا ڈیڑ ساعلی بھائی ریاض حسین قر جواب سے تو اڑے گا شکر ہے۔ گیت نگاری میں تم نے کس قسم کی کام لیا ہے اصلاح معاشرہ کے لیے تمہارے نیک مقاصد کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میری جھینجھن فریدہ عصمت اقبال میں یا بختہ تہرہ لے کر محفل میں شریک ہوئی ہو گشتا ہے ان دنوں مصروفیت حد سے بڑھ گئی ہیں۔ خوشیوں غن میں سینئر شاعروں کے درمیان میں اچھی اور عمدہ غزل لانی ہو محترم فقیر محمد بخش لکھا صاحب! بشیر احمد بھی فرام بہاد پور اور چند ماہ کا وفد کر کے آنے والے صادق آباد کے عبدالملک کیف کے تہرے محفل کی آ ن بان میں اضافہ کر رہے ہیں پچھلے مایف صاحب کی آواز لکھ بھی لا جواب بھی تھی آخریت کا شکر ہے برادر عبدالملک! محترم لڑکا صاحب کی تانی کرم اپنی صاحب کی وفات کا بڑھ کر دکھ ہوا۔ پر درگرجاوار رحمت میں کرم کرم آباد دے آئیں۔ ان کے علاوہ محترمہ سنجی ارشد اور اودی شہر کی پچھل اور نزد دل نازک لکھنے شے محفل سے نفاذ ہیں۔ اس انداز تعامل کی باز پرس ہونا چاہیے۔ ان شاہین اور طاہرہ جیسے تیار بھی چھٹی کر کے پینٹنگ کی ہیں کسی تعلق یا زمر سے تعلق جوڑنے اور اسے برقرار رکھنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں معزز خواہن میں بہر کیف فرصت ملتی ہے محفل میں حاضری لگاؤ۔ بھائی عمران اچھا بھی رسالہ پڑھتا ہوں ہے تاہم چندہ چیدہ کہانیوں میں ماضی و محضہ خاتونہ درویش نے بعد شاعر اور شاعر کا راجہ بیان کیا ہیں۔ محترمہ سلمیٰ غزل کی تین صفحوں پر مشتمل کہانی "عدامت" شائد اسٹوری میں عمدہ اور بے مثل نمونہ ہے۔ مغربی تراجم کہانیاں پڑھنے جیسا ہوں تو حسن جہانگیر کا گیت گوشتا ہے کہ عوچہ عوچہ۔ اس مرتبہ گانا گائے گا جسرا کا ایک اور شریک سفر ہے جد عمدہ کمریں تمہیں۔ پچھلے مینیٹ فیصل سے لگاؤ کا بچاری مفرد اور گردش پر فطرت سے رائے زنی کی کمی لہذا اس مرتبہ چھٹی دیجیے بھائی عمران! احمد۔ نیا ناول "ذات کا قاتلہ" اہمیتوں کو جمع کرنے کا یہ قیام دے رہا ہے۔ والسلام

**عالیہ انعام الہی..... کراچی۔** ایدہ نوی سے فیصل تعالیٰ آپ بخیر و عافیت ہوں گے زندگی کے پر شور استوں پر سی پیہم کو اپنا شعار بنائے والوں کے ہاتھ میں پورا مضبوطی سے قائم رہتے ہیں کہ وہ مصائب کا سیدھ جیتے ہوئے کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب گامزن رہتے ہیں آپ کا سفر مسلسل نئے افق کی صورت آپ کی کامیابیوں اور کامیابیوں کی دلیل ہیں کہ ہر ماہ رونق افروز ہو جایا کرتا ہے اور ہم سے ترقی کی دعا میں اور کامیابی کی مبارکباد میں سمیت کراچی کامیابی کی تلاش سے سرگراں ہو جاتا ہے۔ اس مادہ کا سرور و انتہائی دیدہ زیب اور پر اسرار ہوتا سان کو چھوٹی ہوئی ہیبت ناک فائدہ پہنچا پڑا یاں۔ جیسی ہوئی آبیشار اور درجہ لکھاؤ تا ہوا چوڑا رخ و فرما رخ غفریت جس کی اڑان ہی اس کے بدنامی اور دل کی دلیل ثابت ہو رہی ہے۔ کسی انتہائی پر اسرار مودی کی خوب صورت اور جامع تصویریں اظہار اور جھینجھن کا حقدار ثابت ہو رہا ہے۔ دسک میں بھی انھیں مشتاق مہارت کے بدنامی اور دل کو درگرفرب سے بچے ان کے درویش کی تصویر کشی بصورت الفاظ کرتے دکھائی دے۔ نجانے قول و فعل کے تضاد کی فیضا کب اور کیسے ختم ہوگی کہ سرحدوں پر تہاں لکھنؤ کی صورت سمیٹے رہنے کے عمل کو اب رک جانا چاہیے۔ گفتگو کی محفل رونقوں سے پر محسوس ہوئی۔ تمام دروہندہ ہتھیوں اور ہتھیوں کا شکر ہے کہ تم بھٹ جانا ہے تو اذیت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ عبداللہ شاہد بھائی کے سنجیدہ ہجرے گفتگو کی محفل کی جان بٹے جا رہے ہیں کہ لفظ ان کے نوک قائم سے لگتا ہے کہ تھر کے ہوئے نکتے ہیں اور پڑھنے والوں پر بحر طاری گردش ہے اور ہم خود کو نا اہلی کے جذبے میں سرشار محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شہناز بانجی شہنی قمر جہاں نازش طاہرہ ان سب کی غیر حاضری تہنائی کا احساس سوا کر دیا ریاض صاحب کی دہوئی بخش انگلی کی محبت، کیف بھائی کی محبت نیراض صاحب کی دلی ہمدردی بشیر صاحب کی دعا کی آواز مقبول صاحب کی تعزیت سب نے دل کر دل کو بڑا سنبھال دیا۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ بخش انگلی آپ کا شکوہ بجا کہ اظہار کے

محافل میں ذرا سنبھل واقع ہوئی ہوں جو بچانے والوں کو شکوہ کہانی پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ کی محبت کا یہ اظہار بھی یقین جانش کے میرے لیے سرمائے کا درجہ رکھتا ہے۔ "افق" اس ماہ ہمیشہ سے زیادہ معلوماتی اور اصلاحی تھا جو ہمارے لیے شعلہ راہ ثابت ہوتا ہے۔ ہم جیسے جھلکے ہوئے کو راستہ دکھاتا ہے۔ "مغز" اول نقطہ سے ہی اپنی تیر رفتاری کے باعث کامیابی کے جھنڈے کا زحمتی جاری ہے اور میں اگلی قسط کے انتظار کا نصف دہتی جا رہی ہے۔ "من، گار" جذبوں سے گذری تحریر بھی ہم غور کریں تو ایسے ہجرے کا ہم خود کو بھی حصہ محسوس کرتے ہیں۔ ماں کا تو شہر یہ ایسا ایشول ہے کہ جو غلط فہم ہوں سے اوچھل محسوس ہوتا ہے لیکن روح سے اس کا تعلق میرانی اور مضبوطی سے قائم رہتا ہے اولاد کے لیے وہ گاہوں سے اوچھل ہونے کے باوجود بھی سو جوار رہے فرار دستی ہے۔ جس کا تجربہ خود مجھے ہی بار ہو چکا ہے۔ اسی نہ ہوتے ہوئے بھی میں اپنی موجودگی محسوس کر دیتی ہیں کیا خرگوشاں کے، جو دکھا حصہ تھیں۔ اسی کو مجھے جگہ بھی نہیں ہوتے تھے کہ ایک رات میں نے اسی کو محسوس کیا وہ میرا بازو ہلا کر بھائی کا نام لے کر کہہ رہی تھیں کہ عالیہ شاہد کا خیال رکھو میں ہر بڑا کمری ڈال دے گا اس سے جانی ہوئی دکھائی دیں میں دوڑی کہ اسی کچھ کہہ رہی ہیں مجھے بالکل بھول گیا کہ اسی کو اب ہم نہیں نہیں ہیں میں نے ان کے ہاتھوں کا کس اور ان کی آواز پورے حواس میں محسوس کی مگر ان کا مطلب سمجھتا ہوں۔ دودن بعد ہی بھائی کا موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ انا گنگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گوشت کا بھاری ہوئی ٹکڑی گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بھائی نے حواس نہ کھوئے اور خود میں مطلع کیا اپنی چیزیں روڈ پر سے ڈھکیں دھت ہو کر پڑا کھن تھا آج بھی تصور کریں تو زور جاتے ہیں۔ ماں کی دعا میں اور اللہ کا کرم رہا کہ بھائی آج بھی صحت مندی کے ساتھ چل بھر رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ اللہ انھیں جنت نصیب کرے انھوں نے تین بڑے کامیاب پریشن کیے اور میں بھی کچھ بڑے نصیبان سے اللہ کی رضا سے محفوظ رہا۔ "تیسرا گنگ" دلچسپی اور معیار کی آئینہ دار تحریر تھی۔ انسانی روح میں ایمان بخاری اور سچائی کا عنصر غالب رہتا چھتا ہوتا ہے۔ اپنے کیے ہوئے دھوکے اور فریب پر شرمندگی کے جذبے نے اس مرتبہ ہر پور قلمے کا رنگ اختیار کر لیا۔ "شریک سفر" تاریخ کے ایوانوں سے کچی محبتوں کا گذرانہ تھی۔ دل میں محبوب سے محبت کمر فریب سے بالاتر ہو کر تو رفتی دنیا تانکے میں مثال بن جاتی ہے۔ تھوڑا دلیوی کی ثابت قدمی اور پیر یا محبت نے دل کو کافی متاثر کیا۔ ریاض بہت حسب سائینس "چھوٹی فرسٹ" میں اسکی سنکسی غیر واردات کا قصہ لیے موجود تھے۔ انسانی لغزشیں بڑے بڑے سائے جھم دے دیا کرتی ہیں پھر جھپٹناؤں کے بین ہی کاٹوں میں کو جھپٹے ہو جاتے ہیں۔ بٹ صاحب کا قلم بڑی مہارت اور دلالتی کے ساتھ قابل اظہار اور ناقابل اظہار باتوں کو بیان کرنے میں کمال انصاف کا مظاہرہ کرتا ہے جو قابل داد ہے۔ "گھر وعدہ" نئی نسل میں پردان چڑھتی دقت گزاری کے لیے کی جانے والی وقتی محبتوں کا بھی ایک انضمام کا اظہار تھی۔ مجھے سمجھے نہیں آتی کہ کسی بازار کی بھٹیوں میں کیا لطف ملتا ہے۔ نیت پر چینگ اور پھول پر طویل گفتگو خروگ کیے تھر کر لیتے ہیں اور ان طبعی جذبوں کی اشتہا آخراختی بڑھ کیوں رہی ہے۔ "حقیقت" سنگین غلطی کے باعث تباہ ہونے کا ڈر تھی۔ جذباتی کردار نگاری عروج پر رہی۔ الفاظ کی کارگیری سے تحریر میں جان ڈالی گئی تو نہ تو کہانی میں کچھ تھا۔ "ذات کا قائد" نئی جلی قسط ہی حواسوں پر چھانکائی۔ ایسی تحریریں ماضی میں بھی تھے افق کا جھومر ثابت ہوئی ہیں۔ تیز رفتاری سے بنا کسی جھول اور کسی اہمام کے بغیر بڑی بیاری اور جذبہ کو کواؤں میں لے لے کر اپنی تحریر تھی۔ پہلی قسط نے ہی سیلہ لوٹ لیا۔ آگے چل کر خوب جھنڈے گاڑنے کی۔ مصنف کا ہوم ورک اور معلومات کا خزانہ بے تحاشا ہے۔ جیسی کہانی میں کہیں کوئی جھول محسوس نہ ہو۔ "ماہو مسجد" ڈول کو چھو لینے والا تاریخی انتخاب تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ جرات شجاع پر بدہاری انسان دوستی اور انصاف پسندی سے عبارت رہی ہے۔ گفتگو کے تذکرے اور گزرب کا شکر کی فرمائش نے ماضی کو آج کی پسند کی ایک تعمیر صورت حال کو خوب صورتی کے ساتھ منشا دیا جو زرائع میں کی کہ کوئی تو تاریخ اپنے انجی اور ان کو خون سے دم کر رہی ہوتی۔ "خاتونہ درویش" بھی صلہ جو اگلی کردار اور مذہب سے محبت کرنے والوں کا قصہ تھی۔ عشق حقیقی عشق مجازی کے مابین فرق نہیں انسانی عقل کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ جب جذبے شدید اور صبح کی پہلی کرن کی طرح شفاف اور پاکیزہ ہوں تو پھر ایسے واقعات ہم لیتے ہیں۔ لاٹا بھوس اور مٹنے سے آج کے زمانے میں ہر شخص رشتے اور انسانیت کو غلاظت میں گم کر دیا ہے۔ اب مذہب بھی مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ "عدامت" دقت گزاری کے نام پر محبت اور غلوں کو ہوس اور مفاد پرستی کا کفن پہنا کر جس کی قبر میں دفن کر دینے والوں کا پراثر قصہ تھا۔ "شارت کت" آسان پسند ادبوں کا احوال تھی۔ ایمان و اعتقاد کی کمزوری انسان کو شہ زور کے بجائے کسی زہنی کٹرے میں تبدیل کر دیتی ہے جسے مذہب کی آواز لے کر چٹکی میں مسل دینے والوں کی دھانیوں کو بھی نہیں ہے۔ ذوق آگیا اور بزم غن میں رعنائیاں عروج پر ہیں۔ قسط وار سلسلے اچھی پڑھنے سے قاصر ہوں۔ جتنا غصہ ہو سکا ہو گا حاضر خدمت ہے اب ہمیشہ کی طرح اپنی محبت کا یقین "میں ہماری تحریر کو چھاپ کر دیتے جیسے گاہوں میں یاد رکھیں۔ اللہ حافظ





# اقرایہ

ترتیب: طاہر قریشی

ریا ایک درجہ کا شرک اور ایک قسم کا نفاق ہے۔

(۲۵۲)

(ترجمہ) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرہ مبارک سے) نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت ہم لوگ آپس میں مسج و جال کا کچھ تذکرہ کر رہے تھے تو آپ نے ہم سے فرمایا: کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے و جال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟ ہم نے عرض کیا: حضور ضرور بتلائیں وہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ شرک خفی ہے (جس کی ایک مثال یہ ہے) کتا دی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا پھر اپنی نماز کو اس لیے لمبا کر دے کہ کوئی آوی اس کو نماز پڑھتا دیکھ رہا ہے۔

(سنن ابی ماجہ)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب غالباً یہ تھا کہ و جال جس کھلے شرک و فکری دعوت دے گا اور جس کے لیے وہ لوگوں کو مجبور کرے گا مجھے اس کا زیادہ خطرہ نہیں ہے کہ میرا کوئی سچا امتی اس کی بات ماننے کے لیے آمادہ ہوگا لیکن مجھے اس کا خطرہ ضرور ہے کہ یہ شیطان تم کو کسی ایسے شرک میں مبتلا کر دے جو بالکل کھلا ہوا شرک نہ ہو بلکہ خفی قسم کا شرک ہو جس کی مثال آپ نے یہ دی کہ نماز اس لیے لمبی اور بہتر پڑھی جائے کہ دیکھنے والے معقد ہو جائیں۔

سنن ابن ماجہ ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنی امت کے شرک میں مبتلا ہونے کا خطرہ ظاہر فرمایا تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ایسا ہوگا کہ آپ کے بعد آپ کی امت شرک میں مبتلا ہو جائے؟ آپ نے فرمایا: یہ تو اطمینان ہے کہ میرے امتی چاند سورج کو اور پتھروں اور بتوں کو نہیں پوچھیں گے لیکن یہ ہو سکتا ہے اور ہوگا کہ ریادالے شرک میں مبتلا ہوں۔

(۲۵۳)

(ترجمہ) محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ ”شرک اصغر“ کا ہے بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ”شرک اصغر“ کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ریا (یعنی کوئی نیک کام لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرتا۔)

(مسند احمد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا اصل مقصد و منشاء اپنے امتیوں کو اس خطرہ سے خبردار کرنا ہے تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور اس خفی قسم کے شرک سے بھی اپنے دلوں کی حفاظت کرتے رہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان ان کو اس خفی قسم کے شرک میں مبتلا کر کے تباہ کر دے۔ جس محل میں شرک کی ذرا بھی آمیزش ہوگی وہ قبول نہ ہوگا۔

(۲۵۴)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں شرک اور شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں (یعنی جس طرح اور شرکاء شرک پر راضی ہو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ کسی کی شرک منظر کر لیتے ہیں اس طرح میں راضی نہیں ہوتا) اور کسی کی ادنیٰ شرک گوارا نہیں کر سکتا ہر قسم کی شرک سے بالکل بے نیاز اور سخت بیزار ہوں پس جو شخص کوئی عمل (عبادت وغیرہ) کرے جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے (یعنی اس سے اس کی غرض میری رضا اور رحمت کے علاوہ کسی اور سے بھی کچھ حاصل کرنا یا اس کو معتقد بنانا ہو) تو میں اس کو اور اس کے شرک کو دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بیزار اور بے تعلق ہوں وہ عمل (میرے لیے بالکل نہیں بلکہ) صرف اس دوسرے کے لیے ہے جس کے لیے اس نے کیا (یعنی جس کو اس نے شریک کیا۔)

(۲۵۵)

(ترجمہ) ابوسعید بن ابی فضالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے سب آدمیوں (اولیٰین و آخرین) کو جمع کرے گا تو ایک منادی یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی ایسے عمل میں جو اس نے اللہ کے لیے کیا کسی اور کو بھی شریک کیا تھا وہ اس کا ثواب اسی دوسرے سے جا کر طلب کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب شرکاء سے زیادہ بے نیاز ہے۔

(مسند احمد)

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)





# مفروضہ

## نوشاد عادل

ایک آشفہ سر کا احوال، حالات اور قانون نے اسے اپنی سبکی میں کا قائل قرار دے دیا تھا اور وہ قاتلوں کی تلاش کے لیے قانون سے چھٹا بھر رہا تھا۔ اس کے ایک طرف کھائی تھی دو دوسری طرف موت اور اس کے مقابلے میں اس کے پاس سوائے عزم کے اور کچھ نہ تھا۔

### قدم قدم ہنگامے لمحہ موت کی آہٹ لیے ایک پرخمس طویل ناول

طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ اپنے اگلے روپ میں اسی ساحل پر خان اور سلطان سے ملنے آیا۔ وہ وقت سے کچھ پہلے آ گیا تھا اور اس جگہ پر نظر رکھے ہوئے تھا جہاں انہوں نے ملنا تھا۔ وہ اپنی پوری احتیاط اور ہوشیاری برتتے ہوئے تھا۔

شام ڈھل رہی تھی اور سورج سمندر میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ انتہائی خوب صورت اور دلکش منظر تھا کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس منظر کا بھرپور لطف لیتا لیکن اب یہ تمام نظارے اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ ادھر ادھر کچھ پریمی جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈالے سمندر کنارے ٹہل رہے تھے۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا کر دوبارہ لوٹ رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک کاررکتے ہوئے دیکھی جس میں سے خان اور سلطان عام لباس میں باہر نکل کر اس مقام کی طرف بڑھنے لگے جو مخصوص کیا گیا تھا۔ وہی دس منٹ تک ان کو پرکھتا رہا اور پھر جیسے قدموں سے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے دیکھ کر خان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی جیسے اسے امید ہو کہ وہ واقعی آجائے گا۔

”کی! یہ سن کر تم کو یقیناً بہت تعجب ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ تم جو کر رہے ہو بہت اچھا کر رہے ہو۔ ان درندوں وان کے انجام تک پہنچا کر جو نیک کام کیا ہے

اس سے میں بہت خوش ہوں۔“ خان نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں تعجب تو ہو رہا ہے ایک پولیس انسپکٹر کی زبان سے ایسی باتیں سن کر اور دل ابھی بھی یقین نہیں کر رہا ہے۔“

”کی! اگر جاہر چنگیزی بھی اس رات تمہارے گھر میں تھا یا کسی طرح سے اس معاملے میں ملوث تھا تو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم اسے آسانی سے شکار کر لو۔“ خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر میرے پلان کے مطابق اسے مارنا نہیں ہے۔ وہ پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ دیکھو مسٹر خان۔ میرا جو پلان ہے میں آپ کے لیے اسے تبدیل بالکل بھی نہیں کرنا چاہتا۔ میرا پلان فول پروف ہے اور اگر اس کو چھیڑا گیا تو سب بڑ جائے گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ پلان بنایا ہے۔“

وہی نے خان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

”اگر میں بھی تمہارے پلان کے بارے میں کچھ جان لیتا تو آسانی سے تمہاری مدد کر سکتا تھا۔“

”پلان تو ابھی آپ کو نہیں بتا سکتا خان صاحب۔ لیکن ہاں جب پتا چلا کہ آپ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو میں نے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لی ہے اور میرے پلان کے مطابق آپ کی ترقی بھی ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو کوئی غلط کام نہیں کرنا پڑے گا۔“

آپ کے ہاتھ صاف رہیں گے۔ جو کرنا ہوگا میں کروں گا۔ آپ بس مجھے سپورٹ دیتے رہیں گے۔“ خان وکی کی بات سن کر سرکرایا پھر بولا۔ ”تم سچ میں ایک قابل ہی ای او ہو۔ ایک اعلیٰ ایڈمنسٹریٹر۔ سچی تو اتنی کامیابی سے بزنس چلا رہے ہو۔“

”یہ سب مدثر صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے خان صاحب۔ میں تو طیارے کے حادثے میں مٹی پاپا کی موت کے بعد یتیم ہو گیا تھا۔ یہ مدثر صاحب ہی تھے جنہوں نے نہ صرف میرے سر پر ہاتھ رکھا بلکہ مجھے اس قابل بنایا کہ میں اتنا بڑا بزنس سنبھال سکوں۔ اور کچھ ایم این اے چنگیزی جیسے لوگ ہیں جو کام تو ملک کی فلاح کے نام پر کرتے ہیں مگر دراصل اسے اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ دیکھ کی طرح چاٹ رہے ہیں اس ملک کو۔ میں اپنے بزنس کے ذریعے ملک دوم کی خدمت کرتا ہوں۔ پیر و زگاری کو کم کرنے میں حصہ لیتا رہتا ہوں اور یہ ظالم لوگ سب کچھ برباد کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ آپ ایک ایماندار پولیس آفیسر ہیں۔ اور آپ جیسے گئے جنے لوگ ہی اس ادارے میں ہیں۔ مگر کیا فائدہ وہ کتے آپ کے ہر اچھے کام میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ میرا نظریہ تو یہ ہے خان صاحب کہ اگر کسی آدمی نے ایک دکان کھولی اور اس دکان میں ایک ملازم رکھا تو سمجھیں کہ اس نے ملک سے ایک بیروزگار کم کر لیا۔ اگرچہ کام اس کا اپنا ہے مگر غیر شعوری طور پر وہ قوم کی خدمت کر رہا ہے اپنے طریقے سے مگر ہمارے سیاستدان کیا کر رہے ہیں؟ چند ایک کو چھوڑ کر ہر کوئی لوٹ مار میں لگا ہوا ہے۔ ان کو تو میں نہیں چھوڑوں گا۔“ وکی اس وقت انتہائی جذباتی ہو رہا تھا اور خان اس کے جذبات سے بہت متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ وکی کی باتیں سن کر سلطان کی بھی آنکھیں بھر

آئیں۔ ”کتنی سچائی ہے وکی کی باتوں میں۔“

تب خان وکی کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنا کام کرو۔ جیسے تم چاہتے ہو۔ تم آگے بڑھو۔ میں تمہارے آگے رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارا پلان بہتر ہے تو پھر اس پر بلا جھجک عمل کرو۔ میں تمہیں اور تمہارے آئیڈیالوجی کو جاننا ہوں۔ ڈی ایس پی اور ایم این اے چنگیزی نے میرا جناح حرام کیا ہوا ہے۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں کہ ان کا ظلم کب تک چلتا ہے۔ شاید یہی اوپر والے کی مرضی بھی ہے۔ شاید تم ہی اوپر والے کی بے آواز لاشی بن کر آئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کردگے ٹھیک ہی کرو گے۔ میں جاننا ہوں کہ تمہارے گھر میں جو کچھ ہو اس میں تم بے قصور ہو۔ میں تمہیں گرفتار کیوں کروں۔ گرفتار تو ان سالوں کو ہونا چاہیے۔ تم کو پھنسانے کا سارا پلان اسی چنگیزی نے بنایا ہوگا۔ جب تمہارے گھر سے مجھے دوسروں کے فنگر پرنس ملے میں تب ہی سب سمجھ گیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے سارے نشانات منادئے تھے۔ لیکن قدرت کی مار پڑتی ہے تو کہیں نہ کہیں کوئی چوک رہ ہی جاتی ہے۔“

وکی خان کا کندھا چھتیا تا ہوا بولا۔ ”تم مجھے اپنا پرائیویٹ نمبر دو۔ میں ضرورت پڑنے پر تم سے رابطہ کروں گا۔ اپنے پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی دو۔ مجھے اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اب میں آپ کو بتانا ہوں کہ اس رات پانچ افراد تھے میرے گھر میں۔ پڑا۔ اور اس نے پلان کے مطابق پیسے بھی زیادہ خرچ پانچوں کتوں نے مجھے باندھ کر میری آنکھوں کے سامنے میری بہن کی عزت تار تار کر کے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا سر غنہ جابر چنگیزی تھا۔ بعد میں استعمال ہونے لگا تھا اور نینا کو بھی پھر سے کام اس کتے کے لیے میں نے بہت ہی خاص پلان بنایا پر لگا دیا۔ جابر چنگیزی سے پہلے وکی جن دو آدمیوں کو پہلے اس سے پہلے دو باقی ہیں۔ پہلے انہیں سزا شکار کرنا چاہتا تھا ان میں سے ایک دوسرے شہر میں

دے دوں پھر جابر چنگیزی کی باری آئے گی۔ جو پلان میں نے بنایا ہے اس کے تحت اس وقت مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ پھر ڈی ایس پی اور ایم این اے کی باری بھی آئے گی۔ سب کچھ میرے دماغ کے کمپیوٹر میں فیڈ ہے کہ مجھے کب کیا کرنا ہے۔ بعد میں آپ کو سب بتا دوں گا مگر فی الحال دوسرے نمٹ جانے دو۔“

خان اور سلطان خوش خوش وہاں سے لوٹ آئے۔ خان اس روز خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ گھر میں بھی وہ اپنی بیوی اور فرحین سے بہت ساری باتیں اور ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ اس کی یہ بدلی ہوئی کیفیت اس کی بیوی بھی نوٹ کر رہی تھی۔

☆☆☆

خان کی باتیں سن کر اور یہ جان کر کہ اب خان بھی اس کے ساتھ ہے وکی کا حوصلہ اور بلند ہو گیا تھا۔ اس لیے وکی نے اپنے پلان میں بہت ساری تبدیلیاں کر لیں کیونکہ اب ڈی ایس پی اور اس کے ایم این اے بھائی کو بھی لپیٹے میں لیتا تھا۔ اور یہ بہت بڑا کھیل تھا جس میں ذرا سی بھی غلطی کی گنجائش نہیں تھی اور غلطی کا مطلب بھی ایک انجام تھا۔ خان کے ملنے سے پہلے اس کا کھیل صرف ایم این اے کے بیٹے جابر چنگیزی تک ہی محدود تھا۔ مگر اب دو بڑے مگر مچھو کو شکار کرنے کے لیے وکی کو اپنا پلان بڑھانا پڑا۔ اور اس نے پلان کے مطابق پیسے بھی زیادہ خرچ ہونے لگے۔

وکی نے مدثر صاحب سے مزید پیسے منگوائے جو بعد میں استعمال ہونے لگے اور نینا کو بھی پھر سے کام اس کتے کے لیے میں نے بہت ہی خاص پلان بنایا پر لگا دیا۔ جابر چنگیزی سے پہلے وکی جن دو آدمیوں کو پہلے اس سے پہلے دو باقی ہیں۔ پہلے انہیں سزا شکار کرنا چاہتا تھا ان میں سے ایک دوسرے شہر میں

رہتا تھا اور وہ اپنے شہر واپس جا چکا تھا۔ اس لیے وکی نے اگلا نشانہ اس شہر میں رہنے والے کو بنانے کے لیے نینا کو اس کے پیچھے لگا دیا۔

وہ ہر شام ایک ریسٹورنٹ میں جایا کرتا تھا جہاں کولڈز رنگ کی آڑ میں بہت کچھ پینے کو مل جاتا تھا۔ اور جس شام نینا اس کو پھنسانے کے لیے لگی تو دوسرے شہر والا بھی اس کے ساتھ تھا۔ یعنی دونوں شکار ایک ساتھ تھے۔ وکی بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔ نینا نے ایک گوشے میں جا کر وکی سے فون پر پوچھا کہ اب کیا کیا جائے کیونکہ دونوں ساتھ ہیں۔

وکی نے نینا سے کہا کہ پہلے انہیں کچھ پینے دے تاکہ وہ موڈ میں آجائیں پھر نینا بھی اپنے پینے کے لیے کچھ آرڈر کرے اور دونوں سے دوپٹی کرنے کی کوشش کرے۔ وکی کو اندازہ تھا کہ ایسے عورت باز لوگوں کو پینے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

نینا نے وکی کی ہدایت پر عمل کیا اور جلد ہی ان کے ساتھ دوستی کرنے میں کامیاب ہوئی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنے لگی۔ وکی اپنے پیسے والے گھیس میں اندر با اور ان سے دور ایک کونے والی میز پر بیٹھ کر ان تینوں پر نظر رکھنے لگا۔

ان کی آواز تو وکی کو سنائی نہیں دے رہی تھی مگر نینا کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اب تک سب ٹھیک چل رہا ہے۔

کچھ دیر بعد نینا اٹھ کر داش روم کی طرف جاتی دکھائی دی اور اگلے ہی پل وکی کا موبائل بجنے لگا۔ وکی نے دیکھا نینا کی کال تھی۔

”وہ دونوں ایک ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔“ نینا کی آواز آئی۔

”چلی جاؤ۔ تمہیں تو صرف وہی کرنا ہے جواب تک کرتی آئی ہو۔ باقی میں ان دونوں کو سنبھال لوں گا۔“



نیتا واپس ان کی میز پر آئی اور وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے فوراً کی نے دیکھا کہ نینا دوبارہ واش روم جا رہی ہے۔ اور دوبارہ اس کا موبائل گونجنے لگا۔ ”سریک بڑی پرالہم ہے۔“ نیتا کی آواز میں قدرے گھبراہٹ تھی۔

”اب کیا ہو گیا؟“ وکی نے پوچھا۔  
”وہ ہمارے بچکے پر نہیں بلکہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ اب کیا کروں؟“  
”ان دونوں میں سے کس کے گھر جانے کو کہہ رہے ہیں؟“ وکی نے استفسار کیا۔

”اس نیلی شرٹ والے کے گھر۔ کہتا ہے کہ آج اس کے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اس کا دوست بھی اسی کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ کیا آپ کے لیے ٹھیک رہے گا اگر میں ان کے گھر جاؤں تو؟“ نیتا نے سوال کیا۔

”تم نے ان سے یہ کیوں نہیں کہا کہ تمہارا شوہر تم کو گھر پر فون کر سکتا ہے اس لیے تم اپنے گھر کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ ان دونوں کو کسی بھی صورت میں اپنے گھر پر انویٹ کرو۔ کہہ دینا کہ تمہارا گھر سے باہر رہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ تمہارا شوہر بہت شکی ہے۔ وہ رات کو دفتے دفتے سے فون کرتا رہتا ہے۔ کوئی بھی بہانہ بنا دیا۔“

”میں نے کئی بار کہا لیکن وہ دونوں ضد کر رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ کہتے ہیں کہ گھنٹے دو گھنٹے میں مجھے فارغ کر دیں گے۔“ نیتا نے لاپرواہی سے کہا۔

وکی نے دیکھا کہ اب کوئی چارہ نہیں ہے۔  
”اوکے کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ دونوں کے ساتھ میں وہاں ناٹم پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر ابھی ان دونوں کو یہیں روکو میں گھر سے ہو کر آتا ہوں دس منٹ میں۔ تب تک تم یہیں رہنا۔ اوکے۔ نیلی شرٹ والے کا گھر تو

یہیں قریب میں ہی ہے۔ بس مجھے اس کے گھر کے اندر گھسنے کا راستا چاہئے تم دس منٹ تک انہیں یہیں روکو جب تک میں واپس نہ جاؤں۔“  
وکی نے بچکے پر جا کر کمرہ ٹرائی پوڈ لپٹ لیا اور چمڑا اپنے بیگ میں ڈال کر بندھے پر لا ڈال اور دس منٹ میں واپس ریٹورنٹ پہنچ گیا۔ نینا نے جیسے ہی وکی کو ریٹورنٹ کے باہر دیکھا تو فوراً اٹھ کر واش روم چلی گئی اور وکی کو فون کیا۔

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وکی نے کہا۔ ”غور سے سنو۔ میں تم لوگوں کے نکلنے سے پہلے اس کے گھر کے اندر داخل ہوں گا۔ میں ابھی وہیں جا رہا ہوں۔ اب تم سنو کہ تم کو کیا کرنا ہے۔ تم ان دونوں کو ایک ساتھ برہنہ کرو گی جس بیڈ روم میں بھی وہ لے جائیں۔ تم کو اپنا لباس نہیں اتارنا ہے کہتا کہ تمہارا اسٹائل الگ ہے پہلے تم مردوں کو بے لباس کرنی ہو پھر خود ہونی ہو اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آج تم اپنا موبائل فون اپنے ساتھ رکھنا۔ اس لیے کہ اگر مجھے تم سے کچھ کہنا پڑا تو فون کروں گا۔ پوچھیں تو کہہ دینا کہ شوہر یا کسی دوسرے عاشق کا ہے۔ سب سمجھ گئیں نا تم؟“

”ہاں سمجھ گئی۔“ نینا نے کہا۔ ”بالکل سمجھ گئی۔ مگر جب میں باہر نکلوں گی تو وہاں بھی نیکیسی میرا انتظار کر رہی ہو گی یا نہیں؟“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ تمہیں نیکیسی پہلے سے تیار ملے گی۔ اچھا میں جا رہا ہوں اگر کوئی تبدیلی یا پرالہم ہو تو کال کر دینا۔ اس کے گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد میرا فون سائیلنٹ پر ہوگا۔“ یہ کہہ کر وکی نے اپنی بانٹیک آگے بڑھادی۔

☆☆☆

اس گھر کے پچھلے حصے میں کچن کے ساتھ ایک

کھڑکی کچھ کھلی ہوئی پا کر وکی کو اندر داخل ہونے میں آسانی ہو گئی۔ اپنی بانٹیک اس نے ایک محفوظ جگہ پر چھپا دی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنا بڑا سائیک لے کر اندر آ کے دروازہ دوبارہ بند کر لیا۔ اب وکی نے گھر کے ایک ایک گوشے کا معائنہ کیا اور پورا نقشہ اپنے دماغ میں بٹھاتا چلا گیا۔ اور اس نے یہ بھی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ نینا کو کس کمرے میں لے جائیں گے۔ اپنا بیگ اس نے ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں سے وہ آسانی سے نکال کر استعمال کر سکے اور کسی کو نظر بھی نہ آئے۔

وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر ایک گھنٹے تک انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں آئے تو وکی کو پریشانی لاحق ہونے لگی کہ وہ لوگ اب تک پہنچے کیوں نہیں۔ وکی نے نینا کو فون کیا مگر وہ فون ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کیا جائے۔ کہیں انہیں شک تو نہیں ہو گیا کیا انہوں نے پلان بدل دیا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو نینا فون کر کے اسے ضرور بتاتی۔ مگر وہ تو فون ہی ریسیو نہیں کر رہی تھی اس نے ایس ایم ایس کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل لیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نینا کا موبائل ان لوگوں کے پاس ہو۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کو ذرا سی بھینک بھی لگ گئی کہ نینا تو ایک ذریعہ ہے انہیں وکی تک پہنچانے کا تو بنانا یا کھیل بگڑ جانے وہ الگ، نینا کی جان کو خطرہ پیش آ سکتا ہے وہ الگ۔ وکی پریشانی سے ٹپکتے ہوئے خود سے بڑبڑا رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے دیکھا ہو سکتا ہے۔ ایک گھنٹے میں تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نینا بے پروا بھی نہیں ہے اور اس کی اب تک کارکردگی بہت اچھی رہی تھی تو اب کیا ہو گیا تھا۔

انہی سوچوں میں آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا اور اب

وکی کی بے چینی عروج پر تھی۔ اس نے دوبارہ نینا کا نمبر ڈائل کیا۔ نیلی جا رہی تھی مگر وہ اسے ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ اس نے تین چار بار کال کی مگر ہر بار نتیجہ صفر۔ اب وکی نے سوچا کہ اسی ریٹورنٹ میں جا کر حقیقت کا پتا کرنا چاہئے۔ وہ اسی کچن کی کھڑکی سے باہر نکل کر جیسے ہی گیٹ کی طرف آنے لگا تو اس کے موبائل پر نینا کی طرف سے ایک ایس ایم ایس آ گیا۔ ”ہم اب وہاں آ رہے ہیں۔ یہ کہتے مجھے انجوائے کرنے سی سائیڈ لے گئے تھے۔ میں نے فون اس لیے ریسیو نہیں کیا کہ وہ دونوں مجھ سے چپکے ہوئے تھے۔ مجھے بہت تنگ کیا ہے ان لوگوں نے، بہت مشکل سے ان کو روک کر گھر کی طرف لا رہی ہوں۔ اب ہم قریب پہنچ چکے ہیں۔“

ایس ایم ایس پڑھ کر وکی کی جان میں جان آئی اور وہ جلدی سے دوبارہ گھر میں داخل ہونے کے لیے اس کھڑکی کی طرف بڑھا اور اندر جانے سے پہلے اسے گیٹ پر ایک نیکیسی رکتی نظر آئی جس میں سے وہ تینوں اتر رہے تھے۔ وکی کو خطرہ ہوا کہ وہ اندر داخل ہو بھی پائے گا یا نہیں لیکن اس نے دیکھا کہ وہ نشے میں تھے اور نینا کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ نینا ان دونوں شیطانوں کے بیچ میں قید تھی۔ اس لیے وکی کو موقع مل گیا کہ وہ کھڑکی سے اندر کود جائے۔

اندر داخل ہو کر وکی ایک اندھیرے کونے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بی وی لائونج میں ایک بڑے سے صوفے کے پیچھے تھا جہاں اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ نینا گھر میں ٹہل کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہیں وکی نظر نہ آجائے۔ مگر اسے بھی پتا نہیں تھا کہ اس وقت وکی کہاں چھپا ہوا ہے۔ ایک آدمی کچن کی طرف چلا گیا اور دوسرے بے

صبر نے نینا کو دبوچ کر وہیں صوفے پر ڈال دیا۔  
بچن والا جب واپس آیا تو ہنس کر کہنے لگا۔ اب تم نے  
میں پر دو گرام شروع کر دیا۔

وکی سوچ رہا تھا کہ اگر ان لوگوں نے نہیں اپنا  
شیطان کھیل کھیلنا شروع کر دیا تو معاملہ کھٹن ہو سکتا  
ہے۔ مگر اسے نینا پر بھروسہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نینا انہیں  
وہاں سے ہٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی۔

اور وکی کی سوچ درست نکلی۔ نینا نے خمرے دکھانے  
شروع کیے اور نٹ کھٹ اوڑھنے کے ساتھ کہنے  
لگی ”کیوں تمہارے گھر میں بیڈروم نہیں ہے کیا؟ کیا  
تم لوگ صوفے پر ہی سوتے ہو۔“

نیل شرت والے نے کہا۔ ”بیڈروم کیوں نہیں ہے  
جان من چلو تینوں وہیں چلتے ہیں۔“

اس نے نینا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے بیڈ  
روم کی طرف لے جانے لگا۔ اس کا دوست نشے میں  
لڑکھڑاتے ہوئے ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اور وکی نے  
جو اندازہ لگایا تھا اسی بیڈروم میں چلے گئے تینوں۔

ان کے اندر جاتے ہی وکی فوراً اپنی پناہ گاہ سے  
باہر آیا اور بیک کھول کر اس میں کیمرو نکال کر ٹرائی پوڈ  
پر فکس کیا۔ رپوالور نکال کر اس میں گولیاں چیک کر  
کے سائیکلسر لگایا۔ لاٹھی کی رسی کو دائیں کلائی میں لپیٹا  
اور لوہے کا مکہ بائیں ہاتھ میں پہن لیا۔ پھر سارا  
سامان بیڈروم کے قریب رکھ کر وہ اندر کی سن گن لینے  
لگا۔

کمرے کے اندر نینا ان دونوں کو نہیں روک پا  
رہی تھی۔ پلان تو یہ تھا کہ وہ دونوں کو برہنہ کرنے کے  
بعد باہر نکلتی۔ مگر اس بار معاملہ الٹا ہوا رہا تھا۔ وہ دونوں  
نینا کو برہنہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ نینا  
بہت کوشش کر رہی تھی حالات کو سنبھالنے کی اور وکی  
کے پلان کو کامیاب کرنے کی مگر وہ دونوں نشے میں

تھے اور اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ اب نینا  
مجبور تھی۔

وکی دروازے سے لگا کافی کچھ سن رہا تھا۔ اور وہ  
سمجھ گیا تھا کہ نینا کا باہر نکلنا مشکل ہے اور اس نے  
فیصلہ کیا کہ وہ خود اندر گھسے گا چانک۔

پچھلے دو آدمیوں کا وکی نے کیا حشر کیا تھا اس کے  
بارے میں نینا کو کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ  
وکی کے پاس کوئی ہتھیار بھی ہے۔ وہ تو صرف ان  
آدمیوں کو اس کے حوالے کر کے چلی جاتی۔

اب وکی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اسے ہتھیار کے  
ساتھ دیکھ کر حیران نہیں ہوگی؟ کیا میں نینا کے سامنے  
گولی چلا پاؤں گا؟ اور کیا اس کے بعد بھی نینا چپ  
رہے گی؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ان میں سے ایک کا  
فون بجنے لگا۔ وہ بستر سے اٹھا اور فون سننے کے لیے  
دروازے کی طرف آنے لگا۔ ادھر کمرے کے باہر تو  
وکی نے ٹرائی پوڈ پر کیمرو فکس کیا ہوا تھا اور خود بھی  
نزدیک ہی کھڑا تھا۔

اگر وہ باہر نکلتا تو وکی کا دیکھ لیا جانا ظاہر سی بات  
تھی۔

”ہیلو۔ ہاں میں ہوں۔“ کہنے والے کی آواز دروازے  
کے پاس آئی سنائی دی۔ وکی ٹرائی پوڈ اٹھا کر دو قدم پیچھے  
ہٹ گیا۔

اندر جب نینا نے اس آدمی کو دروازے کی طرف  
جاتے دیکھا تو نینا جھٹ بستر سے اٹھی اور جا کر اس کی  
گردن میں جھول گئی اور خمرے بھرے انداز میں بولی۔

”کیوں جی۔۔۔۔۔ اب کیا کسی اور دوست کو بھی یہاں  
بلا رہے ہو کیا؟“ نینا کا انداز شرمیلی تھا۔ وہ کسی بھی طرح  
اسے رنجھانے کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازے کا  
ہینڈل پکڑتے ہوئے وہ بولا۔

”ایک دوست کا فون ہے۔ بات تو کر لینے دو  
جان من۔“

”تو اس کے لیے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟“  
وہ اس کے کان کے پاس منسلک ہوتے بولی۔ ”آپ  
مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ جبکہ مجھے  
اس سے زیادہ آپ پیارے لگتے ہیں۔“

وکی کے کان اندر کی باتوں پر ہی لگے ہوئے  
تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ اندر نینا  
نے اسے روک لیا ہے۔

”بہت بچی ہوئی چیز ہے یہ نینا بھی“ وکی ہنسی بھرا  
تو یہ اور زیادہ بیسیوں کی حقدار بن گئی ہے۔ بلکہ اگر  
ممکن ہوتا تو میں اسے ایک گولڈ میڈل بھی دیتا۔۔۔۔۔  
واہ۔“

اندر اس آدمی کی باتوں سے پتا چلا کہ دوسری طرف  
جاہر چنگیزی تھا اور یہ بھی پتا چلا کہ جاہر چنگیزی اسی وقت  
ملک سے باہر جا رہا ہے۔ ابھی وہ ایئر پورٹ کے راستے  
میں ہی ہے۔ باتوں سے وکی کو یہ اندازہ ہوا کہ جاہر  
چنگیزی کو شک ہے کہ وکی اسے بھی مار ڈالے گا اس لیے  
وہ ملک سے بھاگ رہا ہے۔

”کمرے یا ریم دونوں تو اس وقت ایک معشوقہ کے  
ساتھ مڑے کر رہے ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔ عیش کریں گے۔“  
”تم ہی کرتے رہو۔“ جاہر چنگیزی نے کہا۔ ”مگر  
تم دونوں ہوشیار رہنا۔ وکی تم تک بھی پہنچ سکتا ہے۔“

یہ باتیں سن کر وکی پریشان ہو گیا کہ انجام تک  
پہنچنے سے پہلے ہی اس کا پلان ٹل ہو جائے گا۔ اگر  
جاہر چنگیزی ملک سے باہر نکل گیا تو کیا کروں گا؟

اندر بات ختم ہونے کے بعد نینا اسے دوبارہ کھینچ  
کر بستر پر لے گئی۔ اور دائیں دکھاتے ہوئے دونوں کو  
سے لباس کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ نینا کے نٹ کھٹ  
انداز پر داری داری جا رہے تھے۔

ادھر وکی گھر سے باہر نکلا اور ٹیئرس میں جا کر  
انکسٹر خان کو فون لگا کر گھبرائی ہوئی آواز میں  
بولا۔ ”خان صاحب۔ اب آپ کو اپنے جوہر دکھانے  
کا وقت آ گیا ہے جاہر چنگیزی اس وقت ایئر پورٹ پر  
ٹلے گا۔ آپ کیسے بھی کر کے اسے باہر جانے سے  
روکیں۔ اگر وہ نکل گیا تو میرا پلان ادھر مارا جائے گا۔  
وہ میرے اس کھیل کا سب سے اہم ممبر ہے۔ وہ  
آپ کی ترقی کی ایک کڑی ہے۔ آپ کسی بھی بہانے  
سے اس کا پاسپورٹ ضبط کر لیں۔ کیا آپ ایسا کر  
سکتے ہیں؟“

”کیا یہ اطلاع بالکل سچی ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے؟“  
خان نے پوچھا۔

”اٹن باتوں میں وقت برباد مت کریں انکسٹر  
صاحب۔ آپ جلدی سے ایئر پورٹ پہنچ کر اسے روکیں۔“  
”تم فکر مت کرو۔ میں ابھی اس کو روکتا ہوں۔“  
خان نے جواب دیا۔

وکی کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ نینا دواش روم کا  
بہانہ کر کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ٹرائی پوڈ اور  
کیمرو موجود تھا لیکن وکی کہیں دکھائی نہیں دے رہا  
تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ  
پریشان ہی اسی دروازے کے پاس کھڑی رہی کہ کہیں  
وہ کمرے سے باہر نہ نکل آئیں۔ پھر اس کو وکی باہر  
سے اندر آتا دکھائی دیا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اور  
سرگوشی میں وکی کو اندر کا احوال بتا دیا کہ وہ دونوں اس  
وقت کس حالت میں ہیں۔

”اوکے ٹھیک ہے تم جاؤ باہر ٹیکسی کھڑی ہے  
تمہارے لیے تمہارا کام ختم اور میرا کام شروع ہوتا ہے۔“  
نینا کے جانے کے بعد وکی نے دوبارہ اپنی بائیں  
منہی میں آنی مکہ پہنا اور دائیں کلائی میں لاٹھی کو  
چمڑے کی رسی سے باندھ لیا اور رپوالور ہاتھ میں لیے



ٹرائی پوڈ اٹھاتے ہوئے لیپ ٹاپ کو اپنی بغل میں دبایا اور کمرے میں گھس گیا۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں تنگ خاندان اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”کون ہوتا۔۔۔ اندر کیسے آئے؟“

ابھی اتنا ہی کہا گیا تھا کہ وہ کی نے سامان نیچے رکھا اور بغیر کوئی جواب دیئے اس کی ران میں گولی مار دی۔ تب تک اس کا دوسرا دوست چھلانگ مار کر بیڈ کے پیچھے چھپنے لگا۔

”اے یہ وہی ہوگا۔ ابھی ابھی فون پر جابر نے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔“

وہی ان سے بے نیاز بڑے آرام سے کھڑا ٹری پوڈ کو کھڑا کر رہا تھا اور اپنا لیپ ٹاپ ایک میز پر بچھا رہا تھا۔ جسے گولی لگی تھی کمرے میں اس کی کرائیں گونجنے لگی تھیں۔ بستر کی چادر اس کے خون سے لت پت ہو چکی تھی۔ اس کا دوست بیڈ کے پیچھے سے گردن نکال کر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”باہر نکلو۔۔۔ درختہ تہااری کھوپڑی اڑا دیوں گا۔“ وہی کا لہجہ انتہائی سفاک تھا۔ جو اسے لڑانے کے لیے کافی تھا۔

وہ تھر تھر کاہنے لگا۔ ”مم۔ مجھے پیشاب لگ رہا ہے۔ مجھے واش روم جانے دو پلیز۔“

”ننگا ہے نا ہمیں پرگوسوٹو۔ کیوڈو گولی مار کر پیشاب اپنے آپ ہی باہر نکال دیوں۔“ وہ بیڈ کے پیچھے کھڑا ہوا اور ننگا ہی بڑی تیزی سے دوڑتے ہوئے وہی کی طرف لپکا۔ وہی کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ وہی کو گولی چلانے کا موقع ہی نہیں ملا اور وہی پر ٹوٹ پڑا۔ وہی کو مار تو نہیں سکا مگر وہی کے کان کو اپنے دانتوں سے کاٹ لیا۔ بدن میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے دانت وہی کے کان میں گڑے ہوئے تھے۔

تب وہی نے اس کی ران پر یو یو لور کور کھتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا اور گولی لگتے ہی اس کا پیشاب بچ میں خطا ہو گیا۔

وہی نے وارڈ روم کے آئینے میں اپنے کان کا جائزہ لیا۔ اسے درد تو ہو رہا تھا مگر اس کا کام اس درد سے کہیں زیادہ ضروری تھا۔

وہی کو اب اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا وہ ابھی ادا تہی تھے اسے ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

”تم دونوں نے میری بہن کی عزت کوئی تھی نا؟ کیا سمجھتے تھے بچ جاؤ گے؟ جابر چنگیزی تمہیں بچا لے گا؟ وہ تو خود اپنی جان بچا کر بھاگ رہا ہے میری بہن کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے تو اب انصاف بھی ہو گا دیکھو اپنی حالت اس وقت کون ہے جو تمہیں بچا سکتا ہے کہاں ہے تمہارا وہ جابر چنگیزی؟ بلاؤ اس کو کرا کر تمہیں بچالے۔ بلاؤ اسے کہیں کو۔“

وہی اندھا دھند دونوں کو مارتا چلا گیا۔ دونوں کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ کر جسم کو بے دم کر رہی تھی۔ ان ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بہت واضح تھیں۔ دونوں گر گڑا رہے تھے۔ معافی مانگ رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ مگر وہی کچھ بھی سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ وہ جو کبھی کسی کو غصے میں نظر نہیں آیا۔ اس وقت جوالہ بھی بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جو شاید اس وارغ کو دھونے کی کوشش کر رہے تھے جو اس کی معصوم بہن پر لگ چکا تھا۔

جب وہی خود مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے دیکھا کہ دونوں خون میں لتھڑے ہوئے بستر پر بے ہوش پڑے تھے۔ وہی نے وہاں رکھے ہوئے جگ سے ایک گلاس پانی پیا اور سگریٹ سلاگ کر ان دونوں کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس بار وہی نے نہ ہی ان کی مودی بنائی تھی اور نہ ہی ان کا بیان ریکارڈ کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اس کا پلان بدل چکا تھا۔

جب وہ دونوں کراہتے ہوئے ہوش کی دنیا میں واپس آئے اور ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے تو وہی ریوا اور تانے بستر کے پاس پہنچ گیا۔

”اب اس دنیا کو الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ کیونکہ جہنم کا دروازہ تم دونوں کے لیے کھل چکا ہے۔ وہیں جا کر ایک دوسرے کے گھٹل لینا۔“

یہ کہہ کر وہی نے ساری گولیاں دونوں کے سر میں اتار دیں۔ اور اس کے بعد وہی نے ان کی لاش کی تصویریں اور ویڈیو بنائی۔ بستر خون سے لتھڑا ہوا۔ دونوں کے چہرے ٹوٹے پھوٹے۔ پھر کھوپڑی میں کھلے رشتہ داران۔ اپنا سامان اٹھا کر وہی وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆☆

انسپکٹر خان نے جابر چنگیزی کو روکنے کے لیے کسی سپاہی کو اپنے ساتھ نہیں لیا بلکہ صرف سلطان کو سادہ لباس میں لے کر گیا تھا۔ اور طیارے میں سوار ہونے سے پہلے جابر چنگیزی کو ردک لیا۔ جابر نے خود کو روکے جانے پر بہت شور مچایا لیکن خان نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

عین اس وقت جب وہ کاؤنٹر پر اپنا بورڈنگ کارڈ پیش کر رہا تھا تب خان نے معمول کے مطابق اس سے انکوائری کے لیے پاسپورٹ طلب کیا اور بڑے اطمینان سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

”آپ اس طیارے میں سوار نہیں ہو سکتے۔“ خان نے کہا۔ ”آپ سے ایک بہت ضروری بیان لینا ہے۔ اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

جابر غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ”اوئے تم کر کیا سکتے ہو میرا۔ دیکھنا ابھی میرا چاچا کیسے تمہارا بیٹا بجاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے موبائل سے اپنے ڈی ایس پی چاچا کو فون کرنا چاہا لیکن سب انسپکٹر سلطان نے اس

**اپنے دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں**

# چٹل نئے افق

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

میل انسٹ ایٹیا افریقہ یورپ کے لیے 6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ مئی آرڈر مئی گرام پوسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔

رابطہ طاہر احمد قریشی۔ 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کمرہ نمبر 7 فرید جیمیز زعمندانہ بادل روڈ کراچی۔

فون نمبر 2/20771-3562 +922-5620773 فیکس +922-5620773 Email: circulationngp@gmail.com

کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور دھیرے سے ادا کے “مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جناب۔ آپ اس وقت اس موبائل کا استعمال بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ساتھ تعاون کرنے میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔“

جابر غصے سے چلانے لگا۔ ”وہاں دی سیل اڈس آپ لوگ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں ایم این اے چنگیزی کا بیٹا ہوں۔ تمہاری بیٹی اتر جائے گی دو منٹ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں مجھے چلنے دو ورنہ تم دونوں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ جتنی بجائے ہی تم کو معطل کر داسکتا ہوں۔ مجھ سے مت الجھو تمہارے لیے بہتر ہوگا انسپکٹر۔“

جابر کے چلانے پر آس پاس لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انسپکٹر خان نے ان سب کے سامنے جابر کو ایک زوردار تھپکڑ مارا۔ اور سلطان نے بھی ثواب حاصل کرنے کی نیت سے اس کے چہرے پر گھونسا دھردیا۔ پھر دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور اسے پیچھے ہوئے ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر لے آئے جہاں ان کی کار پارک تھی۔

پارکنگ میں بھی جابر کا شور مچا رہا تھا۔ ”تم دونوں جانتے نہیں ہو کہ کس سے الجھ رہے ہو۔ میرے باپ کو پتا چل جائے دو۔ عمر بھر پچھتاؤ گے تم دونوں۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر دیکھتا ہوں تم دونوں کو۔“

خان نے دھکا دے کر اسے اندر دھکیلا۔ تبھی اس کا موبائل بجنے لگا۔ خان نے اسکرین دیکھی۔ وہ کی کال تھی۔ اس نے سرگوشی میں سلطان سے کہا۔

”تم اس کے پاس کار میں بیٹھو۔ بھاگنے مت دینا۔ دکی کی کال ہے۔ اسی کی اطلاع پر میں نے جابر کو ایئر پورٹ سے گھیرا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

تم دونوں کی ہیکڑی نکالنے کے لیے۔ سادی سرکار ہاتھ جوڑے کھڑی ہوگی وہاں پر۔“

خان نے اس کو ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”اے سالے۔ تمہیں پولیس اسٹیشن لے کر ہی کون جا رہا ہے؟ لڑکیوں کا رپیہ کرنے میں بہت مزا آتا ہے نا تمہیں۔ آج ہم دونوں مل کر تیرا رپیہ کریں گے۔ پھر دیکھنا کتنا مزا آتا ہے اسے جس کا رپیہ کیا جاتا ہے۔“

سلطان نے جابر کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے خان سے کہا۔ ”خان۔ اس کی تو ابھی سے ہوا نکل رہی ہے۔ دیکھ چہرہ کیسے لال ہو رہا ہے اس کا۔“

”سوچو ذرا۔“ خان بولا۔ ”ابھی جب یہ اپنے باپ سے ملے گا تو اس کا کیا حال ہونے والا ہے۔“ خان اور سلطان اسی طرح جابر کا مذاق اڑاتے ہوئے فون پر بتائی ہوئی اس جگہ پر پہنچے جہاں وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا وہی تھا جہاں ابھی بھی جابر کے دونوں دوستوں کی الائنس پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کی پیپی کے بھیس میں تھا اور گاڑی کے رکتے ہی ڈرائیونگ سائیڈ پر آ کر خان کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ پھر واپس اسی مکان کے اندر چلا گیا۔

”سلطان۔“ خان نے پیچھے مڑتے ہوئے کہا۔ ”اے ہتھکڑی لگا کر مکان کے اندر لے چلو۔“

جابر احتجاج کرنے لگا۔ قانون کی باتیں کرنے لگا۔ ”میرا جرم بتائے بغیر تم لوگ مجھے ہتھکڑی نہیں لگا سکتے۔ تمہانے کے علاوہ کہیں اور نہیں لے جا سکتے۔ مجھے یہاں نہیں تھانے لے چلو۔“

وہ بہت جھد کر رہا تھا۔ سلطان سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے ایک مکہ اس کے چہرے پر رسید کر کے اس کی بولتی بند کرتے ہوئے ہتھکڑی پہنا دی



اسی کے کہنے پر وہ ملک چھوڑ کر جابر ہاتھاکہ معاملہ دب جانے یا وہ کسی کے پکڑے جانے اور اسے پھانسی کی مرہ بونے کے بعد واپس آئے۔ ایئر پورٹ پہنچتے ہی تک وہ خوش تھا کہ وہ اب بالکل محفوظ ہے۔

☆☆☆.....

دوسری طرف چنگیزی براوران بھی پریشان تھے۔ ڈی ایس پی اس وقت اپنے ایم این اے بھائی کے ہنگلے پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں اسی پوائنٹ پر بات کر رہے تھے کہ کیا جابر کے دونوں دوستوں کی موت کے پیچھے وہی کا ہاتھ ہے یا کوئی اور معاملہ ہے۔ جبکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اسی مولناک واردات میں جابر کے ساتھ تھے۔

وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن اسپیکر خان سچ کا پتا لگا ہی لگا۔ اور وہ وقت آنے سے پہلے ان کی پلاننگ بھی کی جابر پکڑ میں نہ آئے۔

☆☆☆.....

خان جانتا تھا کہ جابر کو بچانے کے لیے اوپر سے نیچے تک ساری کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ اور اسے خواہ مخواہ سچ میں پیسا جا رہا ہے۔ اس لیے اس نے سچائی اور انصاف کی خاطر وہی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خان سوچ رہا تھا کہ غلط صحیح لیکن اس طرح کر پٹ اور ظالم ڈی ایس پی اور ایم این اے سے تو قوم کی جان چھوٹ جائے گی۔

اب وہی چلتا ہوا جابر کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ جبکہ جابر کانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر ڈر چھایا ہوا تھا۔ خان نہیں چاہتا تھا کہ وہی اس کے سامنے کوئی غیر قانونی قدم اٹھاتے ہوئے جابر کو گولی مارے یا کوئی سزا دے۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک پولیس آفیسر کا فرض ہوتا ہے لوگوں کی جان بچانا اسے

مردانے کے لیے کسی کتا گے ڈالنا نہیں۔

خان کی رگوں میں ایمانداری کا خون دوڑ رہا تھا اور اس کا ضمیر رہ رہ کر اسے کوس رہا تھا کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ جابر کو لے کر تھانے چلا جائے۔ مگر جب ڈی ایس پی اور ایم این اے کے بارے میں سوچتا تو اپنا ارادہ بدل دیتا۔ اس کے دماغ میں ایک کشمکش سی جاری تھی ان باتوں کو لے کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ملازمت۔ اپنے فرض سے غداری کر رہا ہے۔ مگر پھر بھی وہی کے پلان کے مطابق چل کر دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سے اسے سکون ملتا ہے یا نہیں۔

”وکی“ خان نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا باہر چلو ایک بات کرنی ہے تم سے۔“

”کبو خان صاحب کیا بات ہے؟“ وکی نے اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے کہا۔

”دیکھو وکی صاحب۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہے۔ رتبہ ہے۔ شہرت ہے۔ میں تمہارا ایک معمولی پولیس انسپکٹر۔ گھریا سے میرا۔ بہت مشکل سے عزت کی زندگی جی رہا ہوں۔ چنگیزی جیسے مگر چھوٹے کے بیچ رہ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ آپ اپنی دولت کا سہارا لے کر بیچ سکتے ہیں۔ لیکن میرا ایمان مجھے روک رہا ہے۔ وہ رہ کر میرا ضمیر مجھے کچھ کے لگا رہا ہے۔ لگتا ہے میں کچھ غلط کر رہا ہوں۔ آپ کا پلان سچ ہے۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ میرا ضمیر مجھے زندگی بھر چین سے جینے نہیں دے گا کہ میں نے غلط طریقے سے اس کام کو انجام دیا۔ میں اپنے ضمیر سے کسے بھاگ پاؤں گا وکی آپ تو مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن مجھے تو ساری عمر یہ بوجھ لے کر زندہ رہنا پڑے گا میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا پلان بدل لیں۔

خان کی باتیں سن کر وہی کو غصہ آ رہا تھا۔ ”میں اسی لیے آپ کے ساتھ ملنا یا کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اکیلے ہی یہ کام انجام دینے نکلا تھا۔ مگر آپ خود مجھ سے نے میرا ساتھ دینے کے لیے اور آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔ تو پھر اب کیا ہوا؟ اب آپ کا ضمیر سچ میں کہاں سے کود پڑا؟ کیا آپ نہیں چاہتے کہ گناہ گار کو سزا ملے؟ تم پولیس والوں کی نیکی پر اترتے ہو؟ خان صاحب۔ جو ایماندار ہوتے ہیں کچھ زیادہ ہی ایماندار ہوتے ہیں اور جو بے ایمان اور ظالم ہوتے ہیں وہ کرپشن کے سمندر میں غوطے لگاتے رہتے ہیں اور ایماندار پولیس افسران ان کے پیروں تلے چلے جاتے ہیں۔ مگر ایمانداری کا دامن نہیں چھوڑتے۔ کمال ہے یار۔“

خان سر جھکائے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”میرا دل اس کام کو انجام دینے کے لیے نہیں مان رہا وکی صاحب۔ میں کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ میں کیسے ایک بے قصور کو تمہارے جال میں الجھنے دوں؟ کیا کروں میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

وکی نے خان کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا۔ ”وکی صاحب۔ آپ اندر لے جا کر جابر کے سامنے کھڑا کر دیا اور چلا کر بولا۔

”یہ کتا بے قصور لگتا ہے تم کو؟ اس نے میری معصوم بہن کی عزت لوٹی“ میری آنکھوں کے سامنے۔ مجھے ہانڈہ کر نیے بے قصور لگتا ہے تم کو؟“ وکی پھٹ پڑا تھا۔ ”میں پل پل مرتا رہا اس رات۔ لیکن کچھ نہیں کر پایا اپنی معصوم اور نازک بہن کے لیے اور یہ معصوم لگتا ہے تم کو؟ بے بس لا رہا تھا میں خان صاحب اس وقت کہاں تھا آپ کا ضمیر کہاں تھے آپ اس وقت کیوں نہیں بچایا میری بہن کو۔“

وکی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور چلاتے ہوئے دو سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔

”میری معصوم بہن روٹی رہی۔ چلاتی رہی اور

میں سب دیکھتا رہا یہ کتا اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ اس کی ایک ایک پوٹی نوچتا رہا اور میں اپنی بہن کی حفاظت نہیں کر سکا۔ سب میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا اور میں مجبور تھا۔ ایک پنجرے میں قید پرندے کی طرح تھا اس وقت میں اور اس وقت یہ کتا بس بس کر میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ یہ آپ کو بے قصور لگتا ہے خان صاحب؟ مجھے تو لگتا ہے کہ اب آپ کو بھی اس کے ساتھ ہی گولی مار دی جانی چاہئے۔ کیونکہ آپ بے گناہ اور گناہ گار کا فرق ہی بھول چکے ہیں۔“

وکی نے جوش میں آ کر خان پر ریوالتان لیا۔ تب سلطان نے جلدی سے اٹھ کر وہی کو سنبھالا۔ اس نے دکی کے ریوالتانے ہاتھ کو نیچے کیا اور دکی اندر سے ٹوٹ پڑا وہ زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ سلطان نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

”میری پیاری صاحب۔“ وہ ہلکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”رہ ز میرے خوابوں میں آئی ہے اور اس کا ایک ہی سوال ہوتا ہے کہ بھیا تم نے مجھے بچایا کیوں نہیں تم نے میری حفاظت کیوں نہیں کی۔ میں راتوں کو چونک چونک کر اٹھ جاتا ہوں۔ اپنا چین و سکون کھو چکا ہوں اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کیسے جی رہا ہوں اس رات کا ایک ایک لمحہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ منظر کسی فلم کی طرح چلتا رہتا ہے میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں جانتا تھا میں نے تو کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ صاحبہ نے کسی کو کیا تکلیف پہنچائی تھی؟ ہم دونوں بہن بھائی تو آئے دن ہزاروں لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرتے رہتے تھے تو پھر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو..... کیوں ہوا یہ سب؟“

پھر وہی غصے میں سلطان کی بانہوں سے نکلا اور دوڑ کر جابر پر جھپٹ کر اسے زمین پر گرا کر اس پر چڑھ

جیسا۔ خان اور سلطان اسے دیکھنے کے چنگل سے نکال نہیں پارہے تھے۔ دیکھنے کی جنگی جانور کی طرح جابر کو اپنی پلیٹ میں لیا ہوا تھا کہ دو دو پولیس آفسر بھی اسے چھڑائیں پارہے تھے۔ جبکہ جابر کا پتہ ہونے چلا رہا تھا۔

”بچاؤ..... مجھے بچاؤ یہ مجھ کو مار ڈالے گا یہ ہوش میں نہیں ہے یہ کچھ بھی کر سکتا ہے انسپکٹر خان بچاؤ مجھے بچاؤ“

انسپکٹر خان اور سلطان نے بڑی مشکل سے جابر کو دیکھنے کے چنگل سے نکالا۔ دیکھنے کو نے میں بیٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اس رات کا منظر اس کی پیاری بہن کی چٹخیں اسے بے چین کیونے رہی تھیں۔

خان نے سلطان کو ایک طرف بلایا اور دونوں دھیمی آواز میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ پھر خان دیکھنے کو سہارا دے کر ایک الگ کمرے میں لے گیا۔

کمرے میں بیٹھ کر خان نے دیکھنے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے آرام سے باتیں کیں اور دیکھنے کو نے ایک بار پھر اپنا پلان اسے بتایا جس کے تحت وہ ڈی ایس پی اور ایب ایم اے کی ظلمت کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ خان کسی قدر راضی ہو گیا تو دیکھنے کو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

دیکھنے کو کیمرہ لاؤنچ میں لایا اور جابر پر زور کرتا ہوا بولا۔ ”تو جابر آج تم نے دو خون کیے ہیں اس گھر میں اپنے ان دوستوں کو تم نے مار ڈالا جن کے ساتھ مل کر تم نے میری بہن کو بے عزت کیا تھا کیوں.....؟“ ان دونوں نے پولیس کو سب کچھ بتانے کی ٹھان لی تھی۔ کیا اس لیے تم نے ان دونوں کو قتل کر دیا؟ مگر وہ دونوں تو پہلے ہی انسپکٹر خان کو سب کچھ بتا چکے تھے۔ پوچھ لو ان سے۔“

یہ سن کر جابر ہکا بکا رہ گیا اور ڈرتے ہوئے

کہا۔ ”نہیں میں نے کسی کو نہیں مارا میں تو ایئر پورٹ سے لایا گیا ہوں یہاں۔“

”ان دونوں کا خون کر کے تم ملک سے فرار ہو رہے تھے۔ اسی جرم میں تو پولیس نے تم کو ایئر پورٹ سے پکڑا تھا۔ ان میں سے ایک کے موہاں پر تھماری کال بھی ہے۔ دوسرے ثبوت بھی ہیں اور ان کا بیان بھی ہے تم تو گھسے کام سے پیلا جی۔“

اصل میں تو ان دونوں کا کوئی بیان لیا ہی نہیں گیا تھا اور نہ ہی دیکھنے کو نے کچھ ریکارڈ کیا تھا اور نہ ہی اس وقت ریکارڈ کر رہا تھا وہ تو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ کب جابر یہ قبول کرے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صاحبہ کا رپ کیا تھا تب وہ ریکارڈ کرتا۔ دیکھنے کو نے جابر کو اتنا بوکھلا دیا کہ وہ توقع سے پہلے ہی سب کچھ گلے لگا اور دیکھنے کو نے ریکارڈنگ کا مشن بجا دیا۔

”میں مانتا ہوں کہ میں نے آپ کی بہن کا رپ کیا تھا اس رات کو اور وہ سب میرے ساتھ تھے۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم لوگوں نے آپ کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے۔“

اجانگ دیکھنے کو اس کے پاس گیا اور اسے کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کمرے میں لے گیا جہاں دونوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کو اقرار کرنے پر مجبور کیا کہ اسی نے ان دونوں کو مارا ہے۔ جابر آسانی سے ماننے والا تو نہیں تھا۔ اس لیے پہلے لات گھونے اور پھر جب دیکھنے کو نے ریوالت کی نال اس کی کپٹی پر رکھی تو وہ شروع ہو گیا۔

”مجھے مت مارو۔ میری جان مت لو۔ میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے زندہ رہنے دو۔ میں جیل جا کر زندہ رہ لوں گا۔ میری جان مت لو۔ مجھے بخش دو۔ مجھے معاف کر دو۔ تم جو بھی کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

کہتے ہیں تاکہ جب سوت سامنے نظر آتی ہے تو بڑے بڑوں کی اکڑ فوں نکل جاتی ہے۔ جابر جانتا تھا کہ اس کے پہلے دو دوستوں کو اور اب ان دونوں کو بھی دیکھنے کو نے قتل کیا ہے۔ اور اب اس کی باری ہے تو کیسے اس پیرارے کی زبان نہ نکلتی۔ سب کچھ اپنے آپ اس کی زبان سے ادا ہوتا چلا گیا۔

خان اور سلطان مسکراتے ہوئے دیکھنے کو کے پاس آئے۔ خان نے کہا۔ ”ارے وہاں کی تم کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ تم بات اگلو انے کا فن خوب جانتے ہو۔“

اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر جابر پر خوف چھایا ہوا تھا کہ اب اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس لیے وہ ہر بات بتانے کو تیار تھا۔ دیکھنے کو نے اسے پیڈ پر ان دونوں لاشوں کے پاس بیٹھنے کو کہا اور کیمرہ فکس کر کے اس کی باتیں ریکارڈ کرنے لگا۔

”تم یہ بتانا کہ تم نے ان دونوں کو اس لیے مارا کہ یہ پولیس کو بتانے والے تھے کہ تم نے ان کے ساتھ مل کر صاحبہ کا رپ کیا اور یہ دونوں تمہیں بلیک میل کر کے پیسے اکٹھا چاہتے تھے۔“ ریکارڈنگ سے پہلے دیکھنے کو نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”میں سب کچھ کہنے کو تیار ہوں۔“ جابر بولا۔

”میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں بس میری جان بخش دو۔ جیسے تم نے ان چاروں کو مارا ہے پلیز مجھے مت مارنا۔“

اتنا کہنے کے بعد جابر خان اور سلطان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”آپ پولیس والے ہو۔ پلیز مجھے اس دیکھنے کو سے بچالو۔ میں سب قبول کرتا ہوں۔ اپنے چاروں دوستوں کو میں نے ہی مارا ہے میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔“

دیکھنے کو نے اس کا بیان ریکارڈ کر رہا تھا۔ پھر

اس نے اپنے ریوالت کو اچھی طرح صاف کر کے جابر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ خان نے جابر کو اس کے اقبالی بیان ادا کر کے اس کے ساتھ گرفتار کیا اور اسے تھانے لے گیا جبکہ دیکھنے کو وہاں سے اپنے بیٹھنے پر چلا گیا۔

مگر اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ڈی ایس پی چنگیزی اور جابر کا باپ ابھی بچے ہوئے تھے۔ دیکھنے کو کا بھی شکار کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ بھی اس کے پلان کا حصہ تھا۔ جو کچھ اس نے خان کو سمجھا تھا اس کے مطابق ہی کام کرنا تھا۔ اور خان نے اس کا ساتھ دینا تھا۔

☆☆☆

جابر کے گرفتار ہوتے ہی میڈیا میں ایک طوفان سے کھڑا ہو گیا کہ انسپکٹر خان نے ایم این اے چنگیزی کے بیٹے کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ دوسری طرف دیکھنے کو کی بے گناہی کو بھی اچھالا جانے لگا۔ اب ہر کوئی یہ کہنے پر مجبور تھا کہ دیکھنے کو بے قصور ہے۔ اس کی بہن کی عزت لوٹی گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

ایک رپورٹر نے خان سے پوچھا کہ دیکھنے کو کا کچھ بتا چلا یا نہیں تو خان نے دیکھنے کو کے مطابق بتایا کہ ابھی تک تو کوئی بتا نہیں دیکھنے کو کا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ اپنی بے گناہی ثابت ہونے پر سامنے آجائے۔ جہاں کہیں بھی وہ روپوش ہوگا۔

ادھر ڈی ایس پی چنگیزی آگ بگولہ ہو رہا تھا اور اس نے خان سے استعفیٰ مانگ لیا۔

”استعفیٰ میں نہیں آپ دیں گے ڈی ایس پی صاحب۔“ خان نے پر یقین لہجے میں کہا۔ ”آج رات کو کوئی آپ سے ملنے کے لیے آئے والا ہے۔ آپ گھر پر ہی رہیں گا پلیز۔ آج رات آپ کی بہن ہی اہم میٹنگ ہے کسی کے ساتھ۔ ویسے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے فائدے کی میٹنگ ہوگی۔ یہ بھی دیکھنے کو کی ہی الفاظ تھے جو اس وقت خان



کے منہ سے ادا ہو رہے تھے۔  
.....☆☆☆.....

اگلے دن وکی نے مڈر صاحب سے دس کروڑ روپے منگوائے اور اس رات ڈی ایس پی چنگیزی سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ وکی کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو ڈی ایس پی الجبرا گیا۔ اس کے نتیجے نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر وکی کی بہن کا رپ کیا تھا اور اس نے خود وکی کو بے قصور ٹھہرایا تھا۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈی ایس پی اپنے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ سجا کر بائیس پھیلا کر وکی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”ارے آؤ آؤ وکی صاحب۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم بے قصور ہو۔ بھلا تم جیسا شاندار انسان اپنی بہن کے ساتھ ایسی گھناؤنی حرکت کیسے کر سکتا ہے۔ آؤ بیٹھو۔“

وکی اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مڈر صاحب اور آفس کی طرف سے چار اکاؤنٹ آفیسر بھی تھے۔ ایک کے پاس اسپاکی کیمرہ تھا سب کچھ ریکارڈ کرنے کے لیے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد ایک ذمہ دار بزنس مین کی طرح وکی نے ڈی ایس پی سے کہا۔

”میں یہاں آپ کے ساتھ ایک بزنس کے لیے حاضر ہوا ہوں ڈی ایس پی صاحب۔ میں جانتا ہوں کہ آپ رشوت خور ہیں۔ کیونکہ پیسہ آپ کا ایمان ہے اور میں آپ کو پیسہ دینے آیا ہوں کہ آپ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں اور ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کینیڈا آسٹریلیا یا جہاں آپ چاہیں باقی کی زندگی عیش آرام سے گزاریں۔“

وکی کی باتیں سن کر چنگیزی نے ایک گھمبیر مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کیسی

باتیں کر رہے ہیں وکی صاحب۔ بیرون ملک جا کر کسی ملک میں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے کتنے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے کیا آپ دیر گے مجھے؟ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اتنے پیسے دے سکتے ہیں۔ اور مجھ پر اتنی مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”یہ مہربانی صرف اس لیے ہے کہ انسپٹر خان جیسے ایماندار آفیسروں کے کام میں آپ رکاوٹ بنتے ہیں۔ ملک کی ترقی میں آپ جیسے لوگ رکاوٹ بنتے ہیں میں اپنی دولت سے ملک کے لیے جو کچھ بن سکتا ہے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور آپ سرکار کا مال کھاتے ہوئے بھی سرکاری کاموں میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ میں آپ کو منہ مانگی رقم دوں گا تاکہ آپ کے جانے کے بعد خان جیسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع ملے۔“

چنگیزی نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر ماتھے سے ہتی پسینے کی ہلکی ہلکی کپکپ پونچھتے ہوئے گلا کھڑک کر کہا۔ ”لگ..... کتنا پیسہ دے سکتے ہیں؟“

”جتنا آپ نے کبھی سوچا نہیں ہوگا۔“

”پھر بھی میں سننا چاہتا ہوں کہ میری کیا قیمت لگائی جا پئے۔“

”آپ بتائیں۔ کتنی رقم کا خواب دیکھ سکتے ہیں آپ؟“

”مم میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ آپ صاف صاف بتائیں کہ کیا دے سکتے ہیں؟“

جسے ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ اپنا فرض اچھی طرح نبھاتا تھا۔

”دیکھیں ڈی ایس پی صاحب اگر گھر آئی دولت کو آپ قبول نہیں کرنا چاہتے تو میں چلتا ہوں۔ میں آپ کا اور اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔“

وکی کی باتیں اس کا لالچ بڑھا رہی تھیں۔ وہ بولنے انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔ ”آپ کے اس بیگ میں کتنی رقم ہے وکی صاحب؟ کیا اس بیگ میں میری قیمت ہے؟ آپ بہت مال دار ہیں۔ آپ تو کچھ بھی دے سکتے ہیں۔ دیکھیں اگر آپ اتنا دے سکتے ہیں کہ میں کسی یورپی ملک میں اپنا گھر خرید کر باقی کی زندگی عیش آرام سے گزار سکوں تو پھر ٹھیک ہے۔ میں استعفیٰ دے دیتا ہوں اور آپ مجھے میری ضرورت کے مطابق مال دے دیں۔“

”ارے آپ بولیں تو۔“ وکی نے پھر پوچھا۔ ”کتنا چاہئے آپ کو آپ اپنا مطالبہ پیش کریں۔ اگر بیگ میں پیسے کم ہیں تو میں اور منگوا سکتا ہوں۔“

”پانچ۔“ چنگیزی نے اٹکتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ زیادہ نہیں بول رہا۔ ”اگر پانچ کروڑ مل جائیں تو میرا کام بن جائے گا وکی صاحب۔“ چنگیزی نے تھوک نچلتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

وکی نے بیگ اس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں دس کروڑ ہیں چنگیزی صاحب۔ آپ ایک تو کیا پانچ مکان خرید سکتے ہیں اس رقم سے۔ ایک دو مکان کرائے پر اٹھا دیں اور باقی رقم سے دل کھول کر عیش کر سکتے ہیں۔“

دس کروڑ کا سن کر تو چنگیزی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی۔ اس نے فوراً بیگ کھولا اور اس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر نمیدوں کی طرح چومنے اور ان کی خوشبو سونگھنے لگا۔

”واہ۔ اتنی رقم سے تو میں بھرپور آرام کی زندگی گزار سکتا ہوں۔ مجھے آپ کی یہ آفر قبول ہے وکی صاحب۔ اب میں لات لاتا ہوں اس سرکاری نوکری پر تھو۔“

سب کچھ ریکارڈ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد وکی نے اپنے ساتھیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور جاتے ہوئے مڑ کر بولا۔ ”جہولنا مت۔ آپ نے فوراً ہی اپنا استعفیٰ دے دینا ہے۔“

وکی جیسے ہی باہر نکلا انسپٹر خان انتظار کر رہا تھا اس ریکارڈ کی ہوئی ویڈیو کا۔ خان یہ ویڈیو لے کر عوم منسٹر صاحب کے ہنگامے پر پہنچا اور یہ ویڈیو انہیں دکھائی۔ فوراً ہی ڈی ایس پی چنگیزی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ اور اسے گرفتار کرنے کا فریضہ بھی خود خان نے ہی ادا کرنا تھا۔

خان اکیلا نہیں گیا تھا اس مگر کچھ کو پکڑنے کے لئے۔ اس کے پیچھے میڈیا کی اور ی فوج بھی۔ یہ ماجرا دیکھ کر چنگیزی کی حالت دیدنی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی سوچ سے بہت آگے تھا۔

”میں تو اپنا استعفیٰ پیش کرنے والا ہوں اس لیے اب میں ڈی ایس پی نہیں رہا۔“ چنگیزی انسپٹر خان کو ایک الگ کمرے میں لے جا کر بولا۔ ”دیکھو خان تم ابھی بچے ہو۔ تم کو نہیں پتا کہ ذمہ داری کیسے نبھائی جاتی ہے۔ تم یہ غلط کر رہے ہو میں..... میں اچھا ٹھیک ہے آدھا مال تم لے لو۔ ہم دونوں کے لیے کافی ہے یہ ٹل بانٹ کر کھا لیتے ہیں۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ ہم دونوں کی لائف بن جائے گی۔“

تب خان نے اس کی کلائی میں چھتکرتی پہنائی اور اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لایا۔ میڈیا والوں کی لائیں جل اٹھیں اور کئی چینلز تو یہ سب براہ راست پیش کر رہے تھے۔ اس وقت سابق ڈی ایس پی چنگیزی کی جتنی عزت افزائی ہو رہی تھی اس کے بارے میں اس نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ خان اس کو لے کر باہر نکلا۔ چنگیزی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے اس

کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆.....

ایک چینل نے کسی نہ کسی طرح دکی کولامیو انٹرویو کے لیے راضی کر لیا۔ اور لائیو کی ضد بھی دکی کی ہی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ پروگرام ریکارڈ ہو کر ایڈٹ میں کانٹ چھانٹ کر پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھ انسپکٹر خان اور سب انسپکٹر سلطان بھی تھے۔ پروگرام پیش کرنے سے پہلے اس شو کی بہت پلٹنی کی گئی تھی۔ اور اس وقت تقریباً سب ہی اس چینل پر اپنی نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ دکی کی باتیں سننے کے لئے۔ سب یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ وہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہا تھا۔

خان اور دکی نے آپس میں مل کر پہلے سے طے کر لیا تھا کہ چینل والوں کو کہا بتانا ہے اور کیا نہیں۔ دکی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام کسی کے قتل کے سلسلے میں لیا جائے۔ سچ میں سلطان کو لاکر سارا کریڈٹ اسے دے دیا گیا تھا۔

”خان تم نے میڈیا پر یہی کہنا ہے کہ تم نے سلطان کو جھوٹ موت کی چھٹی پر بھیج دیا تھا لیکن اصل میں وہ خفیہ طریقے سے ساری نفیثیں کر رہا تھا۔ ساری ویڈیوز کا کریڈٹ اور جو کچھ میں نے کیا اس کا کریڈٹ بھی سلطان کے کھاتے میں جائے گا۔“

سلطان خوش ہو گیا کہ اسے اتنے بڑے کیس کا کریڈٹ مل رہا ہے۔ جس سے اسے شہرت بھی ملی اور اب اسے ترقی ملنے کا بھی امکان تھا۔

انٹرویو کے دوران دکی نے بتایا کہ اس ادنیائی سے کودنے کے بعد وہ شدید زخمی ہو گیا تھا اور وہاں کے کچھ دیہاتی لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے اور ہفتوں اس کا علاج کرتے رہے۔ اور کل ہی وہ شہر واپس آیا تو سنا کہ انسپکٹر خان نے جابر چنگیزی کو گرفتار کر لیا ہے تو وہ

خود سب انسپکٹر سلطان سے ملنے گیا اور سلطان نے اس کی خان سے ملاقات کر دلی۔

”آپ نے ڈی ایس پی چنگیزی کو رشوت دینے کی کوشش کیوں کی؟“ انسپکٹر پرن نے سوال کیا۔ ”یہ سب خان صاحب کا پلان تھا۔“ دکی نے بتایا۔ ”وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈی ایس پی پیسوں کو اہمیت دیتا ہے کہ یا اپنے عہدے کو۔ اور یہ سب ریکارڈ کرنا تھا اس لیے اسے پیسے دیئے گئے تھے۔ میں تو صرف ڈی ایس پی چنگیزی کا اصلی چہرہ سامنے لانے کے لیے پولیس کی مدد کر رہا تھا۔“

خان نے سچ میں بولتے ہوئے کہا۔ ”اب کئی اور لوگ بھی سامنے آ گئے ہیں جنہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ڈی ایس پی نے ان کا کیس رفع دفع کرنے کے لیے ان سے رشوت لی تھی۔ ایک ایک کر کے ان کے سارے کروت سامنے آ رہے ہیں۔ عدالت نے کسی بھی صورت میں جابر اور ڈی ایس پی کی ضمانت قبول نہیں کی ہے۔ اور ان کی ضمانت ہونی بھی نہیں چاہئے۔“ شو کی میزبان ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے دکی سے سوال کیا۔ ”کیا آپ ہمارے ناظرین کو بتائیں گے کہ اس رات کو کیا ہوا تھا؟“

اس شو میں حاضرین کو بھی رکھا گیا تھا۔ دکی کا چہرہ لال ہو گیا اور وہ سامنے بیٹھی آڈینس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا بتاؤں؟ اس کالی رات کو یاد کرتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ قیامت کی رات تھی وہ۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں سب بیان کر پاؤں۔“

خان نے اس کی بات کانٹتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں۔ میرے خیال سے دکی سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہئے۔ دیئے بھی سب کو بتا ہے کہ اس رات

کیا ہوا تھا۔“

”مہانوں میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر بولنے لگا۔“ ”مگر ہم جانتا چاہتے ہیں کہ اس وقت آپ نے کیوں کچھ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی بہن کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“

”میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں۔“ دکی نے جواب دیا۔ ”میں اکیلا پانچ آدمیوں سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اس رات میرے گھر میں کسی فلم کی شوٹنگ نہیں چل رہی تھی اور حقیقی زندگی میں انسان مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اپنے گھر کے اندر لوگ خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔ اپنا گھر وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا۔ میں بھی اپنے گھر میں مطمئن تھا کہ اس رات اچانک پانچ آدمیوں نے مجھ پر حملہ کر کے مجھے باندھ دیا تھا۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ کے گھر میں پانچ آدمی اچانک آپ کو گھیر کر باندھ دیں تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔ صرف فلمی ہیرو ہی ایسی شوٹنگ میں دشمنوں کی ایسی ہمتی کر سکتا ہے۔ عام زندگی میں ہمیں حالات کے ساتھ ہدایتی ہی پڑتی ہے۔“

سوال پوچھنے والا سر جھکا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”میں اس رات کے واقعات تفصیل سے لکھ کر پولیس والوں کو دے دوں گا۔“ دکی نے حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر آپ جاہل تو اخبار میں سب پڑھ سکتے ہیں کہ کیا ہوا تھا اور میں کیوں کچھ نہیں کر پاتا تھا ٹھیک ہے۔“

انسٹوڈیو کے کوریڈر میں خان کی بہن فرحین اور اس کی بیٹی ریحماں بھی موجود تھیں۔ فرحین دکی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی اور خان نے خود اس کو دکی سے ملوایا تھا۔ دکی نے فرحین کو ایک نیا موبائل گفٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

میزبان نے خان سے سوال کرتے ہوئے کہا۔ ”تو

آخر میں یہ بتا چلتا ہے کہ ڈی ایس پی چنگیزی کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس کا بھتیجا اس واردات میں ملوث تھا اور وہ آپ کے کام میں دخل اندازی کر رہا تھا۔ تاکہ آپ جابر تک نہ پہنچ سکیں اور لٹا دکی پر ہی اپنی بہن کے ساتھ ملے گا۔۔۔۔۔ اسے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔“

خان نے آرام سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ظاہری بات ہے۔ اور اب تو سب سامنے آ چکا ہے۔ اپنے نتیجے کو بچانے کے لیے چنگیزی نے میری نفیث میں بہت سی رکادیں پیدا کی تھیں۔ تب میں نے سب انسپکٹر سلطان کو بیواری کے بہانے سے چھٹی پر بھیج دیا کہ وہ بات کہ تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ سلطان نے اپنا کام بہت محنت سے انجام دیا اور ہر بات کی خبر مجھے دیتا رہا اور میں اس کو گائیڈ کرتا رہا۔ سلطان نے پہلے مرنے والے دوا میوں سے سچ اگھوا لیا تھا جس کی ریکارڈنگ آپ دیکھ چکے ہیں۔ جابر کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ جب سلطان نے مجھے بتایا کہ بیان دینے والے دونوں آدمیوں کو قتل کر دیا گیا ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ہے۔ سلطان بعد کے دو لوگوں کے پیچھے لگا رہا۔ اور جابر پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جابر نے ان میں سے ایک کو قتل کر کے پتہ لگایا کہ وہ کہاں ہیں اور پھر انہیں قتل کر کے ملک سے فرار ہونے کا منصوبہ بنالیا۔ ہم اس کا فون ٹیپ کر رہے تھے اسی سے ہمیں پتا چلا کہ جابر ان سے ملنے والا ہے۔ مگر افسوس کہ سب انسپکٹر سلطان کو ٹریفک جام میں پھنسنے کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی اور جابر اپنا کام کر چکا تھا۔ جیسے ہی ہمیں اس واقعے کا پتا چلا تو ہم دونوں جابر کو ایئر پورٹ سے گرفتار کر کے موقع واردات پر لے گئے۔ ان لاشوں کی موجودگی میں جابر نے اپنا جرم قبول کیا اور سارا سچ اگل دیا جو ویڈیو میں آپ سب نے بھی



دیکھا: وگا۔

حاضرین کی تالیوں سے بال گونج اٹھا سب ہی خان اور سلطان کی تعریف کر رہے تھے۔ صرف اسنوؤ پر ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں یہ پروگرام دیکھا جا رہا تھا ہر جگہ ان دونوں کی واہ واہ ہو رہی تھی۔

میزبان نے بھی تعریف کرنے کے بعد آخری سوال کیا۔ ”سنا ہے کہ اب ایم این اے چنگیزی جو سابقہ ڈی ایس پی کے بھائی ہیں وہ کچھ کاؤٹیں ڈال رہے ہیں؟“

اس پر خان نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ ایم این اے ہیں جی۔ وہ اپنا کام کریں ہم پولیس والے اپنا کام کرتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے۔“

تالیوں کے شور میں پروگرام کی میزبان نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام ختم کیا۔

میڈیا پر جو بھی کہا گیا وہ سارا وہی کا اسکرپٹ تھا۔ وہی نے اپنی صاحبہ کے ہونے والے شوہر سلطان کو سارا کرڈٹ دے دیا تھا۔ اور انسپٹر خان کی عزت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

وزیر اعلیٰ بھی یہ پروگرام دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی کابینہ کے سامنے خان اور سلطان کا ذکر کرتے ہوئے انہیں حکمانہ ترقی کا حقدار قرار دے دیا تھا۔

ہفتے بھر میں ہی خان کو ایس پی اور سلطان کو ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

☆☆☆.....

اب وہی جابر سے اپنا بدلہ لینے اور ایم این اے کو پھنسانے کے لیے اپنی آخری چال تیار کر چکا تھا۔ مگر اس سے پہلے اس نے فون کر کے نینا کو ملنے کے لیے بلایا۔

وہی نینا سے ملا کر اس کی پی پی والے جھیس میں۔ نینا کو ذرا برابر بھی شک نہیں تھا کہ وہ وہی ہے۔ وہی نے

اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اسے پانچ لاکھ روپے زیادہ ادا کئے۔ اتنی رقم دیکھ کر نینا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پھر وہی نے نینا سے کہا کہ وہ اس کا گھر دیکھنا چاہتا ہے تو نینا خوش خوش اسے اپنے گھر لے گئی۔

وہی کا اندازہ صحیح تھا۔ نینا ایک غریب لڑکی تھی جو کچی آبادی کے ایک ٹوٹے پھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ گھر میں صرف بوڑھی ماں تھی۔ جس کے بارے میں نینا نے بتایا کہ اس کے پیروں میں کوئی مسئلہ ہے جس کے لیے آپریشن کی ضرورت ہے۔ نینا کے حالات دیکھ کر وہی کا دل بھرا آیا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہی جلدی سے باہر نکل آیا اور کسی کوفون کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک بڑی سی دین وہاں آگئی۔ اور وہی کے اشارے پر وہ نینا کی ماں کو ایک بڑے ہسپتال کی طرف لے گئے۔ وہی نے مڈر صاحبہ کو فون کر کے سب سمجھا دیا تھا کہ نینا کی ماں کے آپریشن میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہئے۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہی نینا کو مڈر صاحبہ کے ساتھ بینک لے گیا اور دس لاکھ روپے سے اس کا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ ساری کارروائی مڈر صاحبہ انجام دے رہے تھے۔ وہی اب بھی یہی کہہ جیس میں تھا اور مڈر صاحبہ صرف ان سے ضروری کاغذات پر دستخط لے رہے تھے۔

کارروائی مکمل ہونے پر نینا بینک میں ہی سب کے سامنے وہی کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ وہی اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”آپ کون ہیں میں نہیں جانتی۔“ نینا نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ ایک فرشتہ کے روپ میں میری زندگی میں آئے۔ اور اتنا کچھ دے دیا مجھ غریب کو۔“

اپنے جسم کا سودا کرنا میری مجبوری تھی۔ میں ایسی بالکل نہیں ہوں۔ ماں کا کام کرتی تھی اور میں گھر سنبھالتی تھی۔ لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوئی۔ کیونکہ میں زیادہ بڑھی لکھی نہیں ہوں اور کہیں اچھی نوکری نہیں مل رہی تھی۔ فیکٹریوں میں مل رہی تھی مگر وہاں بھی ہر طرف بھیڑیے ہو جوتھے۔ تو میں نے سوچا کہ ان کے ہاتھوں لٹنے سے اچھا ہے کہ میں اپنا خریدار خود چنوں۔ اس لیے کھانے اور ماں کی دوا کی خاطر میں نے اپنا سودا کرنا شروع کر دیا۔ ہر روز میں اسے گناہوں کی معافی مانگتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ اس گندگی سے نکل جاؤں۔ خدا سے دعا کرتی تھی کہ مجھے کوئی راستہ دکھائے تاکہ میں اس ماحول سے اپنا دامن بچا سکوں۔ اور خدا نے میری مدد کے لیے آپ کو بھیج دیا۔“

نینا کے آنسوؤں سے وہی کی شرٹ بھیک چکی تھی اور خود اس کا دل رور ہا تھا۔ اس نے نینا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”چلو اب تم کو وہ سب نہیں کرنا پڑے گا۔ تم کو حق پیسے دیئے ہیں ان سے تم اپنی زندگی آراہم سے گزار سکتی ہو۔ اور ضرورت پڑنے پر اور بھی دولں گا۔“

میرے آوی مجھے تمہارے حالات کے بارے میں آگاہ کرتے رہیں گے۔ اور ہاں تمہارے لیے ایک مکان دیکھ لیا ہے میں نے۔ اب تم وہیں رہو گی اپنے نئے مکان میں۔ ماں کا آپریشن ہونے کے بعد انہیں اسی نئے مکان میں لے جانا اپنے ساتھ۔ بعد میں تمہیں ایک اچھی کمپنی میں نوکری بھی ملو ادوں گا مگر تمہاری ماں کے گھر لوٹنے کے بعد تاکہ تم ان کی تیارواری کی وجہ سے ڈسٹرب نہ ہو جاؤ۔ جاؤ خوش رہو اور خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ یہ سب اسی کا دیا ہوا ہے۔ خدا تم سے یقیناً خوش ہوگا کہ تم نے ان حالات

میں بھی اپنی ماں کا اتنا خیال رکھا۔ اور شاید اسی لیے اس نے مجھے تمہارے لیے وسیلہ بنایا۔“

نینا نے رورور کر اپنے دل کے سارے غم دھو ڈالے تھے اس دن۔ پھر وہی نے نینا کو اس کے نئے مکان میں چھوڑا ایک نئی زندگی گزارنے کے لئے۔

☆☆☆.....

وہی نے اپنے پلان کے مطابق ایک ڈرگ ڈیلر سے ہیرن اور کافی ہتھیار خریدے تھے اور ساتھ ہی دو ٹائم بم بھی۔ خریدے تو اس نے تین ٹائم بم تھے لیکن ایک ٹائم بم وہی اپنے پلان کے مطابق الگ سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ سب سامان ایم این اے کے گھر رکھنا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ کیسے رکھا جائے۔ سیکورٹی انتہائی سخت تھی۔

وہی نے خان اور سلطان سے مل کر ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ سامان ایم این اے کے گھر کے اندر رکھنے کے لیے کوئی طریقہ سوچیں۔

پلان یہ تھا کہ جیسے ہی یہ سامان ایم این اے کے گھر رکھا جاتا خان کوفون آتا کہ ایم این اے فشیٹ اور اسلحہ کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہے۔ تب خان اور سلطان نے اس کو گرفتار کرنا تھا۔ مگر مسئلہ وہی تھا کہ اس کے گھر میں نقب کیسے لگائی جائے۔

اس مسئلے کو خان اور سلطان پر چھوڑ کر وہی اپنے دفتری معمولات میں مصروف ہو گیا۔

آخری فائل پر دستخط کرنے کے بعد وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ میں بیٹھ ہوئے واقعات کی یادیں گردش کرنے لگیں۔

”میں امیر ہوں۔ مالدار ہوں۔ سب سے بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہوں اپنے پیسے کے بل پر۔“ وہ خود سے ہم کلام تھا۔ ”مگر میری طرح اور نہ جانے کتنے بے گناہ ہوں گے جو چنگیزی جیسے کتوں کی سازش کا

شکار ہو کر گھٹ گھٹ کر جی رہے ہوں گے۔ پتا نہیں دنیا بھر میں روزانہ کتنے بے قصور لوگ ایسے حالات سے گزرتے ہوں گے۔ مجھے ان سب بے قصور لوگوں کا بدلہ لینا ہے۔ چاہے اس کام میں کتنا ہی پیسہ لگ جائے۔ کیونکہ یہ مالِ دولت میری صاحبہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ کسی بے قصور غریب سے بڑھ کر نہیں ہیں میرے پیسے۔ دولت تو میں پھر کمالوں کا گران کتوں کو میں کسی حال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ان درندوں کو سزا دینے کے لیے میں اپنا تنکا تنکا داؤد لگانے کے لیے تیار ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے ان کتوں کو مارنا ہے یا جیل میں سڑانا ہے اب۔“

پھر اچانک وہی کامو بال بجنے لگا۔

”ہیلو کون؟“

”آپ بتائیں۔ میری آواز پہچانی آپ نے؟“

”نہیں تو۔ یہ بستر بھی پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ کون ہیں آپ؟“

”ارے وہی صاحب۔ میں فرحین ہوں۔ آپ ہی کے گفت کیے ہوئے موہاں سے کال کر رہی ہوں۔ آئی لو یو کی صاحب۔“

اس کی باتیں وہی کو عجیب لگ رہی تھیں۔ ”فرحین پلیز ویسے نہیں بولتے۔“

فرحین نے بچکانہ انداز میں کہا۔ ”کیوں سر؟ کیوں ایسے نہیں بولتے۔ میں تو بولوں گی اور بار بار بولوں گی آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“

اھر فرحین نے یہ کہتے ہوئے فون کا ناڈر پیچھے مڑ کر دیکھا تو خان اور اس کی بیوی پیچھے کھڑی اس کی باتیں سن رہے تھے۔ فرحین گڑبگڑائی۔

”کیا تم سچ میں اس سے پیار کرتی ہو؟“ خان نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

فرحین شرم سے لال ہو گئی اور دوڑ کر اپنی بھابھی کی

بانہوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ بیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا اور خان کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اسی دوپہر خان وہی کے دفتر میں موجود تھا۔ اور اس سے فرحین کی بات کو لے کر پوچھا کہ کیا وہ فرحین سے شادی کرنا پسند کرے گا۔

”ابھی میں شادی کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں خان۔“ وہی نے کہا۔ ”میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا۔ ایم این اے ابھی آزاد ہے اور تمام کام ختم کرنے کے بعد ہی میں تم کو کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں گا۔“

☆☆☆

خان نے یہ بات اپنی بیوی کو بتائی۔ اور سسر خان نے اس کے سامنے ہی فرحین سے کہا۔ ”تم انیس سال کی ہونے کو آ رہی ہو مگر اب بھی بچپنا نہیں گیا

تمہارا۔ یہ سب تمہارے بھائی کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ یہ اب بھی تم کو بچی کی سمجھتے ہیں اور چھوٹی بچی کی طرح ہی تمہاری ہر فرمائش پوری کرتے رہتے ہیں۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو دیکھتی کہ تم کیسے اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتی ہو۔ مگر کیا کروں کچھ کر بھی نہیں سکتی نہیں تو تمہارا یہ بھائی مجھ سے خفا ہو جائے گا۔ اور

میں تم دونوں بہن بھائی کے پیار کے بیچ میں دیوار نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے تمہیں ہمیشہ چھوٹ دی۔ لیکن آج کے بعد تم وہی کر دو گی جو میں کہوں گی۔ اب

اپنا یہ بچپنا چھوڑ دو بچھوڑ ہو جاؤ۔ یاد رکھو کہ مردوں کو بچکانہ باتیں پسند نہیں آتیں۔“

فرحین کو اپنی بیوی کے ہاتھوں ڈانٹ پڑتے دیکھ کر خان سر جھکا کر سسکا رہا تھا۔ پھر فرحین جا کر اپنے بھائی کے سینے لگ گئی اور بھابھی کی شکایت کرنے

لگی۔

”بھائی دیکھو نا بھابھی کیا کہہ رہی ہیں۔“

خان اس کو ایک طرف بٹاتے ہوئے بولا۔ ”اب میں تم دونوں کے بیچ میں پڑنے والا نہیں ہوں۔ ویسے تمہاری بھابھی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اب تمہیں یہ بچکانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔“

فرحین کو سب پتا تھا۔ وہ صرف اپنے بھائی اور بھابھی سے ہی ایسے پیش آتی تھی۔ اور وہی سے تو اس نے فون پر وہ سب کہہ بھی دیا تھا سامنے ملتی تو الگ بات ہوتی۔

وہ اپنے کمرے میں گئی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک اداسے اپنی کمر لچکاتے ہوئے بولی۔ ”سب یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں بچپنا ہے۔ لیکن میرے دل کا حال

کوئی نہیں جانتا۔ اگر میں تنہائی میں وہی سے ملی تو وہ دیوانہ ہو جائے گا میرا۔ کسی نے میری اداسوں کا جادو دیکھا ہی کہاں ہے ابھی۔ یہ اداسوں تو صرف وہی کے لیے ہیں۔

بھلی اور بھابھی کو کیوں دکھاؤں۔“

☆☆☆

خان اپنے آفس میں سلطان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ”کوئی بندوبست کیا اس ایم این اے کا؟“

”نہیں۔ میں ابھی اس کے سیکورٹی آفیسر سے ملنے والا ہوں۔ اگر وہ پھسل گیا تب دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے۔“

”اوکے ابھی اسی وقت نکل جاؤ۔ کام جتنا جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ یاد رکھنا کہ وہی کو ایک نام بم استعمال کرنے کی جلدی ہے۔“

☆☆☆

ایم این اے کی غیر موجودگی میں سلطان اس سیکورٹی آفیسر سے ملنے پہنچا۔ بات چیت کے دوران پتا چلا کہ وہ سیکورٹی آفیسر بھی وہی کا مداح ہے۔ اور وہی پر وہی کا انٹرویو اس نے بڑی چاہ سے دیکھا تھا۔ وہ خان اور

سلطان کا بھی مقرب تھا۔ اس کی چاہ دیکھ کر سلطان نے کہا۔

”کیا تم کی صاحب سے ملنا چاہو گے؟“

سیکورٹی آفیسر نے سن کر بہت خوش ہو گیا۔ ”اگر تم ہمارے کاموں سے سچ میں خوش ہو تو تم کو ہم پولیس والوں کی مدد کرنی چاہئے۔ ہم عوام کو ظالم

لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں اور تم بھی تو عوام میں شمار ہوتے ہو۔ اگر عوام ہی ہمارا ساتھ نہیں دے گی تو ہم اپنا کام کیسے انجام دے پائیں گے؟“

”ہم تو آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ مگر ہوتا کیا ہے کہ اس ایم این اے جیسے لوگوں تک کوئی پہنچ سکتا ہے کیا اصل طاقت تو ان کے ہاتھ میں

ہے۔ یہ اپنے فائدے کے لیے جب چاہیں قانون بناتے ہیں اور جب چاہتے ہیں توڑتے ہیں۔ جب ضرورت دیکھی نیا قانون بنایا۔ ہم جیسے لوگ تو ان کے بیچ میں آ کر کچلے جاتے ہیں۔“

”دیکھو۔ تم مجھے ایک سچے انسان دکھائی دیتے ہو۔ میری بات غور سے سنو۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ تمہارا

ایم این اے کالا دھندلا کرتا ہے اور مافیا والوں سے ملا ہوا ہے۔ بہت ہوشیار بھی ہے وہ ہمیں کسی طرح اس کے گھر میں گھس کر تلاشی دینی ہے۔ اگر اس کے گھر

سے کچھ ایسا ویسا سامان برآمد ہو تو سمجھو وہ کیا۔ تم اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتے ہو یا نہیں؟“

اس کے جواب میں سیکورٹی آفیسر نے جو کہا اسے سن کر سلطان حیران ہو گیا اور خود پر ہنسا پھر فوراً ہی خان اور وہی کو فون کر کے بتایا۔

”سر بہت عجیب بات ہو گئی ہے۔ ہم جسے دھوکے سے پھنسانا چاہتے ہیں وہ حقیقت میں بھی مافیا سے ملا ہوا ہے۔ اور وہ واقعی میں منشیات اور اسلحہ کی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اس کے سیکورٹی آفیسر سے کافی سراغ ملے ہیں



لیکن اس کے کالے دھندوں کا اڈہ کہاں ہے یہ ابھی پتا نہیں چلا۔ سیکورٹی آفیسر نے یہ بھی بتایا ہے کہ رات کے اندھیرے میں اس کے گھر پر مافیا کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں جان کر دیکھنے والے ان دونوں کو بیننگ کے لیے اپنے آفس میں بلا لیا۔

”وہ سیکورٹی آفیسر ہم سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔“ دیکھنے والے نے پوچھا۔

”ہاں بالکل تیار ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے ذریعے ہم گھر کے اندر گھس سکتے ہیں اور اس کے لیے ساری درست اطلاع وہی دے گا ہمیں۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ مارو ہتھوڑا۔“ دیکھنے والے نے کہا۔

☆☆☆.....

آخر وہ وقت آ ہی گیا جس کا ان کو بے صبری سے انتظار تھا۔ ایم این اے کے سیکورٹی آفیسر نے رات کو فون کر کے سلطان کو بتایا کہ آج رات ایم این اے اپنی فیملی سمیت کسی پارٹی میں جا رہا ہے اور گھر پر صرف سیکورٹی والے ہی موجود ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ باقی کے سیکورٹی گارڈز سے بھی اس نے بات کر لی ہے اور وہ ان کے ساتھ ہیں کیونکہ وہ بھی ایم این اے سے تنگ آئے ہوئے ہیں جسے کسی کی عزت نفس کا خیال رکھنا آتا ہی نہیں۔ کسی کو سب کے سامنے بے عزت کر دینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

سلطان نے دیکھ کر گاہے گاہے کہ وہ درخان ایم این اے کے ہنگلے پر جا رہے ہیں۔

☆☆☆.....

دیکھ کر فوراً اپنے پانچ نقاب پوش آدمیوں کے ساتھ تھانے کے پاس پہنچا اور جس لاک اپ میں جابر قید تھا اس کے باہر دیوار پر ناٹم بم فکس کیا۔

اس کے لیے اس کی خان سے پہلے بات ہو چکی تھی کہ جابر کو دوسرے لاک اپ میں منتقل کر دیا جائے ورنہ وہ زخمی بھی ہو سکتا تھا۔ اور دوسرے لاک اپ کی چابی خان نے دیکھ کر پہلے ہی دے دی تھی۔

ناٹم بم نے دیوار کو پھانسی ڈالا۔ ایک سب انسپکٹر اور ایک حوالدار بڑا بڑا کر باہر نکل آئے جبکہ باقی سپاہیوں کو نقاب پوشوں نے اسلحہ کے بل پر بینڈز اپ کر لیا۔ ایک حوالدار الماری کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ دیکھنے والے پہلے سے اطلاع تھی کہ تھانے میں کتنے لوگ ہوں گے۔ دیکھنے والے نقاب پہن کر بم سے ڈال گئی دراڑ سے اندر داخل ہوا اور جابر کو اس کے لاک اپ سے نکال لیا۔

”مجھے آپ کے والد ایم این اے چنگیزی نے بھیجا ہے آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے۔ جلدی

”مگر اب ہم اس کے اصلی دھندے کو پکڑ میں لینا چاہتے ہیں۔“ میں نا؟“ خان بولا

”وہ اپنے آپ سب اگل دے گا۔ تم لوگ میرا دیا ہوا سامان اس کے گھر کے اندر تک پہنچاؤ۔ میں بھی چلوں گا۔“ جیسے بدل کر۔ یاد رکھنا کہ مجھے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر بہت ہی ضروری کام کرنا ہے۔ اور ساری بات کا انحصار درست وقت پر ہے۔ کیونکہ جس وقت ہمیں فون آئے گا تو تم دونوں فوراً نکل پڑنا۔ میں پانچ نقاب پوش آدمیوں کے ہمراہ تھانے پر حملہ کروں گا۔“

”جلد بازی سے کام مت لو دیکھ۔“ خان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے سیکورٹی آفیسر ہمیں بتادے کہ کب وہاں جانا مناسب ہوگا۔ تب ہم وہاں جائیں گے اور تم یہاں اپنا کام کرنا۔ اوکے۔“

دیکھنے والے نے کہا اور تینوں مل کر اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے لگے۔

چلیں وقت کم ہے۔“

جو والد الماری کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس نے سنا کہ ایم این اے چنگیزی کے آدمی آئے تھے جابر کو پولیس کی حراست سے نکالنے کے لیے۔

جابر خوش ہو کر دوڑتا ہوا دیکھنے والے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ نقاب پوشوں نے بینڈز اپ کیے ہوئے پولیس والوں سے کہا۔

”ہم سب ایم این اے چنگیزی کے آدمی ہیں اور ان کے بیٹے جابر کو چھڑانے کے لیے یہ کارروائی کی گئی ہے۔ تم لوگوں میں سے کسی نے کچھ کہا تو اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔“

اس کے بعد وہ سب جابر کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔

☆☆☆.....

ادھر خان اور سلطان بھی ایم این اے کے گھر منشیات اور اسلحہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ کسی کو پتا نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں کیا چھپایا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کو ہی واپس آ کر وہ سامان برآمد کرنا تھا۔

☆☆☆.....

دیکھنے والے اپنے چہرے پر نقاب اوڑھے جابر کو اپنی لینڈ کرور میں لے جا رہا تھا۔ اپنے آدمیوں کو اس نے راستے میں اتار دیا اور خان کو فون کر کے بتایا کہ کام ہو گیا اور اب وہ واپس جا رہا ہے۔ جابر نے اس سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی لیکن دیکھنے والے اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہا۔ جابر خاموش ہو گیا۔ وہ تو ای بات سے خوش تھا کہ اس کے باپ نے اس کو چھڑانے کے لیے پولیس اسٹیشن کی ڈیفنڈ سے اسٹینڈ بجادی تھی۔

☆☆☆.....

اقوال زریں

☆ ایک کی حیاقت سے دوسرے کی قسمت بنتی ہے۔ (ہیکن)

☆ بدقسمتوں کو دیکھو۔ تم انہیں احمق پاؤ گے۔ (ینگ)

☆ انسان جب حیوان کا ساعمل کرتا ہے اس وقت وہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ (ٹیگور)

☆ خود کو بدل دو۔ قسمت خود بخود بدل جائے گی۔ (کہاوت)

☆ دکھ کا خیال ترک کر دینے سے انسان کو خوشی ہوتی ہے۔ (ڈاکٹر بارڈن)

☆ دنیا میں کبھی عجوبے ہیں لیکن انسان سے بڑا عجوبہ کوئی نہیں۔ (سوفوکلز)

☆ موجودہ دور میں انسانیت کا خطرناک دشمن انسان ہے۔ (ٹیکسیٹر)

خان جب پولیس اسٹیشن پہنچا تو سب نے ایک ہی بیان دیا کہ ایم این اے چنگیزی کے آدمی ہم سے راستہ بنا کر اندر داخل ہوئے اور ان کو اسلحہ کے زور پر روک کر جابر کو لاک اپ سے نکال کر لے گئے۔

خان نے سلطان کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”چلو ابھی اب ایم این اے کو گرفتار کرنا ہے۔ اس نے پولیس اسٹیشن میں بم لگایا ہے قیدی کو چھڑایا ہے۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس کے گھر کی تلاشی لینی ہے کیا ہے اس کے گھر سے مزید بم برآمد ہو جائیں۔ چلو تم لوگ بھی۔“

سلطان پیٹ دبا کر ہنسے جا رہا تھا۔ پھر وہ خان سے بولا۔ ”سر۔ ایم این اے بھی سوچے گا کہ کس سے پالا پڑ گیا ہے اس کا۔“

خان نے شش کہہ کر اسے خاموش رہنے کو کہا اور پھر پولیس فورس لے کر ایم این اے کے بنگلے کی طرف چلا۔ جاتے جاتے خان نے وزیر اعلیٰ کو فون کر کے بتایا کہ کیا ہوا ہے اور وہ اس ایم این اے کو گرفتار کرنے جا رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے بھی اس کے اقدام کی تائید کی۔

☆☆☆.....

دوسری طرف دکی کی گاڑی اب شہر کی حدود سے باہر نکل آئی تھی۔ جابر حیران ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

ایم این اے صاحب کا حکم ہے کہ تمہیں شہر سے دور لے جایا جائے۔ جہاں پولیس تم تک نہ پہنچ پائے۔“

خان کا جواب سن کر جابر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ خان اسی جنگل کی طرف جا رہا تھا جہاں اس سرداری کی حکومت تھی۔ جسے دینے کے لیے دکی نے ایک بیگ میں ایک کروڑ روپے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اور گاڑی میں وہ ہتھیار اور سامان بھی تھا جس سے ان بچھلے چار شیطانوں کو جہنم واصل کیا تھا۔ جس میں ریوا اور بھی تھا۔ آہنی مکہ بھی اور لاشی بھی جس سے ان کی ہڈیاں توڑی تھیں۔

ڈرائیونگ کے دوران اس رات کے واقعات رہ رہ کر اس کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔ اور خاص طور سے جب صاحبہ خود کشی کرنا چاہ رہی تھی اور ایک دوست نے اسے روکنے کی کوشش کی تو جابر نے کہا تھا کہ اسے خود کشی کرنے دو اچھا ہے۔

دکی نے جنگل کے ایک کونے میں لا کر گاڑی روک دی اور پیچھے جا کر آہنی مکہ پہن لیا اور کلائی لاشی باندھ لی اور دوسری طرف سے آ کر جابر کے سر پر

مکے کا وار کیا۔ جابر چونک گیا اور اپنا سر پکڑ کر دکی کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”پاگل ہو گئے ہو کیا۔ مجھے کیوں مارا..... میرا باپ تمہاری ایسی کی تیمی کر دے گا۔“  
دکی نے اسے کالر سے پکڑ کر گاڑی سے باہر اتاری زور سے بھینچ لیا جابر زمین پر جا گرا۔ دکی نے لاشی کا ایک بھر پور وار جابر کے چہرے پر کیا جس سے اس کا گال بھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔ جابر نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی مگر وہ قدم چل کر لڑکھڑا کر گر پڑا اور خوفزدہ نظروں سے دکی کو دیکھنے لگا۔

”کک..... کیوں مار رہے ہو مجھے کک..... کون ہو تم؟“

دکی نے چہرے سے نقاب اتارتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری موت تمہارے چار ساتھیوں کو مار ڈالا میں نے تو تم کیسے بچ سکتے تھے۔ ان شیطانوں کے گرد تو تم ہی تھے۔ تمہارا ہی حکم تھا کہ میری بہن کو موت بچاؤ اسے خود کشی کرنے دو۔ اب مرنے کی باری تمہاری ہے کتے۔“

پھر دکی پر وہی وحشت طاری ہو گئی اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ جابر کے جسم پر وار کرتا چلا گیا۔ ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں اور جابر کا بدن ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ جابر بے ہوش ہو چکا تھا مگر دکی کے ہاتھ چل رہے تھے۔ اب ایسا لگ رہا تھا جیسے جابر کے سانسوں کی ڈور ٹوٹ چکی ہے مگر دکی کا ہاتھ اسی مشینی انداز میں چل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بڑبڑاتے جا رہا تھا۔

”میری مصوم بہن مر گئی۔ تیری وجہ سے۔ اس کو بل پل مرتے دیکھا میں نے۔ تم نے میری آنکھوں کے سامنے اس کی عزت لوٹی۔ اور تم چاہتے ہو کہ تم کو چھوڑ دیا جائے۔ دیکھو صاحبہ۔ دیکھو۔ میں نے ان

سبھی شیطانوں کو مار ڈالا جنہوں نے تمہارے پاک جسم کو ناپاک کرنے کی جسارت کی۔ آج میرا بدلہ۔۔۔ میرا انتقام پورا ہو گیا میری گڑیا۔ میں نے سب کو ایک ایک کر کے کتے کی موت مارا ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا صاحبہ۔ میں کمزور نہیں ہوں میری بہن۔ میں ڈر پوک نہیں ہوں۔ اب تو تم خوش ہو نا۔ سب کو مار ڈالا..... مار ڈالا سب کو۔“

جب وہ تھک گیا تو گھٹنوں کے بل جابر کی لاش کے پاس بیٹھ گیا اور ریوا اور نکال کر چھ کی چھ گولیاں اس کے مردہ جسم میں اتار دیں۔ مگر شاید اب بھی اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سرد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے

آہنی مکے سے جابر کے چہرے کے نقوش لگاڑ دیئے۔ اس کی ایک آنکھ باہر نکل آئی۔ ہونٹ کٹ کر لٹک گئے۔ کھوپڑی بچ چکی تھی۔

کچھ دیر دکی وہیں بیٹھا باغیاں رہا۔ پھر تھکے ہوئے قدموں سے گاڑی کے پاس جا کر پانی کی بوتل لی اور غماخت پینے لگا اور چیزے اور سر پر بھی پانی انڈیلا۔ ہاتھ منہ دھوئے اور گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جنگل کے اندر لے گیا سرداری سے ملنے کے لئے۔

☆☆☆.....

خان اور سلطان نے ایم این اے کے گھر سے برآمد ہونے والے سامان اور تھانے پر حملہ کروانے کے الزام میں اسے گرفتار کر لیا۔ خان اس بار بھی میڈیا کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اور ساری برآمدگی اس نے کینٹروں کے سامنے ہی کی تھی۔ تاکہ پوری قوم اس بات کی گواہ رہے۔ اس سامان میں جدید اسلحہ تھا۔ گولیوں سے بھرے ہوئے کئی صندوق تھے۔ منشیات تھیں۔

خان ایم این اے کو پھنکڑی پہنا کر پولیس اسٹیشن لے آیا۔ اور لاٹک اپ کے اندر دھکیل دیا۔ میڈیا کی موجودگی میں ایم این اے سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆.....

دکی نے ایک کروڑ روپے سرداری کے حوالے کیے تاکہ وہ اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے خرچ کر سکے اور کہا کہ وہ کبھی کبھار ان لوگوں سے ملنے جایا کرے گا۔ وہ ان سب سے ملا جنہوں نے اس کی مدد کی تھی۔ اس نے کالپا کو لاشی لوٹاتے ہوئے کہا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور ریوا اور بھی اس نے سرداری کو دے دیا۔ وہ اس لڑکی سے بھی ملا جس نے اسے زندگی میں پہلی بار جسمانی آسودگی سے روشناس کیا تھا۔ اس لڑکی نے اسے اپنے قبیلے کے ایک مرد سے ملوایا اور اشاروں سے بتایا کہ وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ دکی کو ایسا لگا جیسے ایک بوجھ سال کے سینے سے اتر گیا ہو۔

☆☆☆.....

شہر واپس آ کر دکی اپنے بزنس میں اور خان اس کیس کے سلسلے میں مصروف تھا۔ ایم این اے نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کے ماٹا کے ساتھ تعلقات تھے اور اس نے اپنے گینگ کو گرفتار کروانے میں تعاون بھی کیا۔ سابقہ ڈی ایس پی کو بیس سال اور ایم این اے کو بیس سال کی سزا سنائی گئی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ ایم این اے نے جابر کو فرار کر دیا اور وہ جنگل میں ریل حادثے کا شکار ہو گیا۔

☆☆☆.....

دکی نے نینا کو اپنی ایک کمپنی میں ملازمت دلوائی اور فنانس منیجر سے کہہ دیا کہ اس کی تنخواہ زیادہ رکھی جائے۔ نینا کی ماں کا آپریشن کامیاب رہا اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اس نئے گھر میں آگئی تھی۔ جو دکی نے نینا کو خرید کر دیا تھا۔

☆☆☆.....

صاحبہ کے مرنے کے بعد سلطان کے دل کی دنیا اجڑ چکی تھی اور اب کسی اور لڑکی کی طرف اس کا دھیان



# شاہر

## انجم فاروق ساحلی

کہاوت ہے کہ اولاد جب تک پہاڑ تلے نہیں آتا وہ خود کو دنیا کی عظیم ترین شے تصور کرتا ہے لیکن جب بلند و بالا پہاڑ اس کی حقیقت واضح کر دیتے ہیں تو اس کی جال ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔  
شاہروں کی اک ٹولٹی کا احوال وہ خود کو سیر سمجھتے تھے مگر جب انہیں سوا سیر نکرایا تو.....

### انگریزی ادب سے انتخاب ایک دلچسپ اور پرتشک کہانی

پولیس کے حلقوں میں بھی مجھے سنہرے دانت والا کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ ان دانتوں کی وجہ سے ہی ہیں آج تک پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا کیونکہ ہر مرتبہ میں واردات کے بعد دانتوں پر پڑھا ہوا یہ سنہرا خول اتار لیتا۔ اس کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ وقت آنے پر منہ کو ہاتھ لگائے بغیر اسے نکل بھی جاتا تھا۔

اس وقت جب میں کوا پریٹو کمپنی کے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس وقت بھی خول میرے دانتوں پر چمک رہا تھا۔

جب میں لون کمپنی کے مختصر سے دفتر میں داخل ہوا تو ننھی سا کیشیر کرسی میں دھنسا حساب کتاب میں مگن نظر آ رہا تھا۔ میری موجودگی سے آگاہ ہو کر اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں نے جیسے ہی جیب سے اعشاریہ چار پانچ کا کوئلہ روٹا اور نکالا اس کی نظریں گویا میرے ہاتھ پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ایک گہری سانس لیتا ہوا کرسی میں کچھ اور دھنسنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں تیشی نکال دی مقصد یہی تھا کہ وہ میرے دانتوں پر چڑھے ہوئے سنہرے خول کو واضح طور پر دیکھ سکے۔

”گھبرنے کی ضرورت نہیں ڈیرا“ میں نے دوسرے ہاتھ سے بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

جب منصوبے کا آخری بار تنقیدی جائزہ لینے کے بعد میں اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے اور یہ ایسا وقت تھا جب میری معلومات کے مطابق لون کمپنی کے دفتر میں ابھی خاصی رقم موجود ہوتی تھی اس وقت کسی کی مداخلت کی توقع نہیں تھی۔

میں منصوبے کے مطابق اپنی کمین گاہ سے باہر نکلا تو میرے چہرے پر چار دن کی شیونگی ہوئی تھی۔ اس منصوبے پر غور شروع کرتے ہوئے میں نے چار دن پہلے ہی شیوہ بنانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ ایسے کاموں میں ان باتوں کا بطور خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اصل حلیہ کسی کی نگاہوں میں نہ آئے۔ آنکھوں پر سیاہ عینک اور اوپر کے دو دانتوں پر چڑھے ہوئے سونے کے خول نے میرا چہرہ بڑی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ دانتوں کا یہ سنہری خول بھی میں نے اس مقصد کے لیے بطور خاص بنوا رکھا تھا اور اسے صرف ایسے مواقع پر استعمال کرتا جب کسی منصوبے پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ میں نے آج تک جتنے بھی کارنامے انجام دیے تھے۔ ان میں پولیس کو میرا حلیہ بتاتے وقت میرے اوپر کے دو سنہرے دانتوں پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ اس طرح میں تقریباً درجن بھر وارداتیں کر چکا تھا اور ہر دفعہ میرا حلیہ نشر کرنے میں سنہرے دانتوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا

ایک سال بعد وہی اور فرحین شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور معنی مومن کے لیے سوئیٹزر لینڈ روانہ ہو گئے ابھر رہے شام بھی آخر سلطان کا دل جیتنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور وہی کی شادی کے ایک سال بعد وہ دونوں بھی شادی کی ڈور میں باندھ دیے گئے۔ وہی اور فرحین بھی اس شادی میں مدعو تھے۔ اس وقت فرحین کی گود میں ایک پیارا سا منہ آچکا تھا۔ سلطان کی شادی کا سارا خرچہ وہی نے اپنے ذمہ لیا اور ان دونوں کو بھی معنی مومن کے لیے سوئیٹزر لینڈ بھیج دیا۔

وہی نے اپنے گھر کے لائفنگ میں صاحب کا ایک قد آدم پورٹریٹ آویزاں کر رکھا تھا۔ جس میں وہ نشی۔ مسکرائی کھلکھلائی نظر آتی تھی۔ وہی ہر روز اس تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی بہن کی یاد تازہ کرتا تھا۔ صاحب فرحین کی بھی سیلی تھی اور وہی کی غیر موجودگی میں وہ بھی اکثر صاحب کی تصویر سے باتیں کیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ پیار میں وہ طاقت ہوتی ہے کہ ہر دم آہستہ آہستہ مٹتا جاتا ہے اور وقت بہت مہربان ہوتا ہے جو ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ یہی کچھ وہی کے ساتھ بھی ہوا کیونکہ کچھ سالوں کے بعد وہ صاحب کی زندگی میں آئی اس منحوس رات کے بارے میں فرحین سے باتیں کرنا بند کر دی تھیں۔ وہی اب بھی صاحب کی تصویر کے سامنے کھڑا ہوتا تھا مگر اب اس کی آنکھوں میں درد نہیں پیار ہوتا تھا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ زخم بھر جاتا ہے اور تیار بڑھ جاتا ہے۔



ہی نہیں جاتا تھا۔ اب لگتا تھا جیسے اس نے اپنے فرض سے ہی شادی کر لی تھی اور پوری زندگی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ رہے شام بھی اس کی طرف پھینکنے لگی اور وہ دونوں اکثر کہیں نہ کہیں مل لیا کرتے تھے۔

☆☆☆.....

فرحین اب سیانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا بچکانہ پن ختم ہوتا جا رہا تھا اور اس کے دل میں وہی کے لیے پیار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اکثر وہی کو فون کر کے تنگ کرتی رہتی تھی۔ اور آخر میں یہ نوبت آ گئی کہ جب کسی وجہ سے فرحین اسے فون نہیں کر پاتی تھی تو اسے بے چینی سے فرحین کی کال کا انتظار رہنے لگا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ پورا دن فرحین کی کال نہیں آئی اور رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہی بے چین ہو گیا اور اس نے خود ہی فرحین کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف فرحین کی بھانجی نے فون اٹھایا اور کہا کہ فرحین کو بہت تیز بخار ہے اور وہ بار بار بے ہوش بھی ہو چکی ہے۔ اور اب ڈیوٹی سے واپس آنے پر خان اسے ہسپتال لے جا رہا ہے۔

وہی فوراً ہسپتال روانہ ہو گیا اور فرحین کے ٹریسٹمنٹ کے بعد جب اسے ہوش آ گیا تو وہی سے رہا نہ گیا اور اس نے خان سے فرحین کا ہاتھ مانگ لیا۔ فرحین کو تو جیسے دنیا میں سب کچھ مل گیا۔ خان اور اس کی بیوی بھی بہت خوش تھے کیونکہ انہیں اسی موقع کا انتظار تھا۔ وہی فرحین کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور بخار نے اس کے گالوں میں لالی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہی نے آج پہلی بار اس کی خوب صورتی کو کھمبوس کیا تھا۔ پھر وہ سب ابھر ادھر کی باتیں کرنے لگے اور فرحین بات بات پر کھلکھلا رہی تھی۔

☆☆☆.....

کہا۔ ”اے سیف تک جاؤ اور اس بریف کیس کو نوٹوں سے بھرو۔ کوئی چالاکی دکھانے یا حفاظتی الارم بجانے کی کوشش مت کرنا۔ تم میری نظروں میں رہو گے اور یہ بات یاد رہے کہ سوفٹ کے فاصلے سے بھی میرا نشانہ سمجھی خطا نہیں ہوتا۔ تمہارے رویے سے ظاہر ہونا چاہیے جیسے تم اپنے کسی مڑکل کو قرض کی رقم فراہم کر رہے ہو۔“ کیشر نے تھوک نکل کر حلق کو تکیا اور بریف کیس اٹھا کر تجویر کی طرف چل دیا۔ نصف فاصلے طے کرنے کے بعد اس نے رک کر میری طرف دیکھا پھر میرے چہرے پر کڑھکی کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد جب وہ واپس لوٹا تو میں نے جھپٹ کر رقم سے بھرا ہوا بریف کیس اپنے قبضہ میں کر کے ریٹ روم کی طرف بڑھتے ہوئے غرا کر کہا۔

”اب اطمینان سے بیٹھے رہو اور کم سے کم پانچ منٹ تمہیں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنی چاہیے بصورت دیگر میری انگلی کی ہلکی سی جنبش تمہاری کھوپڑی کے پرچے اڑا دے گی۔“ میں نے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور فٹ پاتھ پر آ کر تیز تیز قدموں سے سڑک کے موڑ کی طرف چلنے لگا۔ میری خوش قسمتی بینک کا اکلوتا گارڈ میرے بینک میں داخلے کے وقت واش روم میں چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ بصورت دیگر اگر وہ حائل ہوتا تو بے ہوش کر دینے والی دوا وائر پستول میں بھر کر ساتھ لایا تھا اس کی پچکاری اسے کچھ دیر کے لیے بے ہوش کر دیتی۔ میں تیزی سے ٹیوٹا کرولا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ گاڑی چوری کی تھی اس کا مالک ایک ڈاکٹر تھا جو ان دنوں کسی میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے کسی دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ان وارداتوں میں میں کار بھی ہمیشہ چوری کی استعمال کرتا تھا۔ عقب میں ایک پرانی سیڈان اس

طرح کھڑی تھی کہ دونوں کے بمپر تقریباً ملے ہوئے تھے۔ اگلی طرف سیاہ رنگ کی ایک پک آپ بھی تقریباً اسی پوزیشن میں پارک تھی۔ میں نے یہ سوچ کر باری باری دونوں گاڑیوں کے دروازے آزمائے کہ انہیں وہاں سے ہٹا کر اپنی گاڑی نکالنے کا راستہ بنا سکوں لیکن دونوں گاڑیوں کے دروازے لاک تھے اور ماسٹر کی اس وقت میرے پاس موجود نہیں تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا میں اس وقت شہر کے ایک ایسے علاقے میں تھا جس کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اون لمپنی کا کلرک کسی لمحہ بھی دفتر سے باہر آ کر شور مچا سکتا تھا میں یہی سوچ رہا تھا کہ عین اسی لمحے ایک ٹیکسی موٹر پر کھڑی ہوئی نظر آئی ڈرائیور ایک ویلا پتلا مرل سا آدمی تھا۔ میں کرولا کا خیال دل سے نکال ٹیکسی کی طرف بڑھا اور پیچھلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور ابھی پورنی طرح بیٹھ ہی نہ پایا تھا کہ ٹیکسی کے عقبی آئینہ میں اون کمپنی کے کلرک کا ٹگس دکھائی دیا وہ یاگوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اچھل رہا تھا اور پیچھے پھروں کی پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ اس وقت گارڈ بھی پلٹ کر ایک ہاتھ سے گن پکڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ اسی لمحے ٹیکسی حرکت میں آئی اور ٹریفک کے جھوم میں شامل ہو گئی۔

”کہاں جانا ہے؟“ ڈرائیور نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”ایکسویں شاہراہ پر اور وہاں سے سینڈی کی طرف۔“ میں نے پیچھے مڑ کر لون کمپنی کے کلرک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ٹیکسی مشرق کی بجائے شمال میں براؤڈے کی طرف

جارہی ہے میرا خیال تھا کہ وہ اگلے چوراہے سے ٹیکسی کو ایکسویں شاہراہ کی طرف گھمائے گا لیکن ٹیکسی بدستور براؤڈے کے راستہ پر دوڑتی رہی۔ میں ڈرائیور کو ٹوکنے کی بجائے محتاط ہو کر پیٹھا رہا۔ بلا آخر ٹیکسی اشارہ دس شاہراہ پر گھومتی ہوئی سینڈی بلے وارڈ کی طرف نکل گئی اور چند منٹ بعد ہی ٹیکسی میرے ہوش کے سامنے رک چکی تھی۔

”ہیلے ایکسویں شاہراہ پر جانا وہاں سے کوئی دوسری ٹیکسی یا بس پکڑ کر سینڈی تک آنا کچھ ایسا ہی لگتا ہوگا۔“ ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہو اور ہر طرح سے محفوظ ہو۔“ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں لیکن ڈرائیور کی اس حرکت نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم میں کہاں رہتا ہوں؟“ میں نے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں اکثر یہاں آتے جاتے دیکھ چکا ہوں۔“ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میری طرف گھوم گیا۔ ”اور یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں ہوٹل کی لابی میں کونے والی میز پر بیٹھے ہوئے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے رک کر بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

”اب اسے اپنے کمرے یا کسی اور جگہ لے جاؤ جسے تم محفوظ سمجھتے ہو۔ پولیس بہت جلد ایک ایسا آدمی کو تلاش کرنا شروع کر دے گی جس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہو آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ اور ہاتھ میں بریف کیس ہو لیکن میرے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔“

”تمہارا داغ تو خراب نہیں؟“ میں نے اسے گھورا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے اطمینان سے ٹٹی میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی

پھر وہ بولا۔

”میں جرائم کی دنیا میں ایسے لوگوں کا قدردان ہوں جو ذہانت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں ہر مہینے چودہ پندرہ ایسے رسالے خرید کر پڑھتا ہوں جن میں جرائم کے بارے میں کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہیں اس وقت دیکھا تھا جب چھ ماہ قبل تم نے بیورٹن میں شراب کی ایک دکان لوٹی تھی۔ اسے تمہارا نشان وار کا نامہ کہا جاسکتا ہے۔“

”چھ ماہ پہلے۔۔۔۔۔۔ بیورٹن۔۔۔۔۔۔ شراب کی دکان۔“ میں تھوک نکل کر رہ گیا۔

”ہاں یہ درست ہے۔“ ڈرائیور کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور جب تم اسٹور سے نکل کر ایک سنسان جگہ پر پہنچے تھے تو میں اس وقت بھی تم پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ تم نے وہاں جا کر اپنا کوٹ الٹ کر پہن لیا تھا جس سے سرخ کی بجائے سبز رنگ اوپر آ گیا تھا۔ تم نے بڑی خوب صورتی سے ٹوپی کو بھی ہیٹ میں بدل دیا تھا۔ تمہارا اس بدلے ہوئے حلیے میں تو اسٹور کا مالک بھی تمہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ تم سرخ رنگ کی ایک کار میں پارل سے ہوتے ہوئے تیسویں شاہراہ پر پہنچے وہاں کار چھوڑ کر ایک بس میں سوار ہوئے۔ شہر کے زیریں علاقہ میں تم دوسری بس میں سوار ہوئے اور اس چوراہے پر اترے تھے۔“

”اگر تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو تو تم نے پولیس کو کیوں اطلاع نہیں دی؟“

”میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں قانون کا ٹھیکیدار نہیں۔“ ڈرائیور نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ”جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حقیقی جرائم اور ذہین مجرموں کی قدر کرنا میری خوبی ہے۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کسی اچھے ذکاوت کا کام کرتے



دوئے دیکھوں۔

”اور تم یہ سب کچھ محض اس لیے کرتے رہے کہ تمہیں حقیقی جرائم سے دلچسپی ہے؟“ میں ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”صرف یہی نہیں میں تمہارے بارے میں اور بھی بہت سی معلومات جمع کر چکا ہوں مثلاً تمہارا نام جوئے بانڈ ہے، عمر تیس سال، قد چھ فٹ، آنکھیں نیلی، وزن ایک سو ستر پونڈ، تم شراب کے عادی نہیں، جو کبھی نہیں کھیلنے اور کسی قسم کی آوارگی بھی تمہیں پسند نہیں۔“ نیکی ڈرائیور نے جواب دیا۔

”ہوئی۔“ میں نے بے اختیار ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”بہت گہری آدمی معلوم ہوتے ہو تمہارا منہ بند رکھنے کے لیے کتنی رقم دینا پڑے گی۔“

”کچھ بھی نہیں میں پیسے کے لالچ میں یہ سب کچھ نہیں کر رہا۔“ ڈرائیور نے منہ بگاڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات ہوتی تو تم نے جب سپراسٹور کو ملنا تھا میں اس وقت تمہاری گردن ناپ لیتا وہ تمہارا واقعی خوب صورت کارنامہ تھا۔ تمہارے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے اور تم لوگوں نے تقریباً پچاس ہزار ڈالر کی رقم لوٹی تھی۔“

”ہوں! تمہارا مطلب ہے کہ تم ہمارا یہ کارنامہ بھی اپنی ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھتے رہے تھے۔“ یہ کہتے ہوئے میرے جبرے جھنجھ گئے۔

”میرا نام ہاروے پلاک ہے۔“ ڈرائیور نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس دو ٹیکسیاں ہیں۔ ڈرائیور کی چھٹی کے بعد ایک ٹیکسی میں خود چلاتا ہوں یہ ملاقات ہماری دوستی کی بنیاد بن سکتی ہے میرا خیال ہے تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”مجھے حیرت ہے کہ تم یہ سب کچھ جرائم میں دلچسپی کی بنا پر کر رہے ہو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے

ہوئے کہا۔

”بہت عرصے سے میرے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پارہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے میں کم از کم ایک لاکھ ڈالر ہاتھ لگیں۔ میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ محض بڑے اچھے منصوبے معمولی سی غلطی کی بنا پر ناکام ہو جاتے ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ میرے منصوبے میں ایسا کوئی جھول نہ ہو۔“

”ہر شخص سہانے خواب ضرور دیکھتا ہے۔“ میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا اور جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نیکی سے نیچے اتر آیا۔ اب میں جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑالینا چاہتا تھا۔

”میں کسی وقت تم سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔“ نیکی ڈرائیور ہاروے نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ہاروے اپنے وعدہ کا پابند نکلا۔ تین دن بعد وہ میرے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ اس کی آمد سے ایک روز قبل سلیم اور اسکا راما منڈ میں بینک ڈکیتی کی دو وارداتیں ہو چکی تھیں۔

”الحق لوگ۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”نہ صرف یہ کہ ان وارداتوں میں ڈاکو بہت کم رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں بلکہ وہ پولیس کی نظروں میں بھی آچکے ہیں۔ ایسے لوگوں کو گدھے کا خطاب دینا ہی مناسب رہے گا۔“ اس نے ان وارداتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔ ”ذرا اسے ایک نظر دیکھ لو یہ میرا وہ پلان ہے جس کا تذکرہ میں نے گزشتہ ملاقات میں کیا تھا۔“ ہاروے نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک طے شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے کاغذ کھول کر سامنے رکھ لیا اور اس کے منصوبے

کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ اس دوران وہ منصوبے کے مختلف پوائنٹس پر تبصرہ بھی کرتا رہا۔ اس نے جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ بلاشبہ قابل عمل اور اس کی ذہانت کا ثبوت تھا۔ یہ منصوبہ بینک کے حفاظتی انتظامات اور پولیس کی کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس میں کوئی جھول یا خالی نہیں مل سکتی تھی۔

”راہ فرما اختیار کرنے کے لیے گاڑی کا کیا انتظام ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”اصل اور بنیادی چیز یہی ہے۔“ ہاروے نے جواب دیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی چمک تھی۔ ”جب تم بینک سے باہر نکلو گے تو میں اپنی ٹیکسی میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ تمہیں شہر کے کسی اور علاقے میں اتار کر میں اپنے دھندے میں لگ جاؤں گا۔ اس میں کسی قسم کا خطرہ بھی نہیں اگر پولیس کسی طرح مجھ تک پہنچ بھی گئی تو میں کہوں گا کہ میں نے تمہیں یونین انٹیشن پر اتار دیا تھا اور تمہاری حیثیت محض ایک مسافر کی تھی۔ کیسا زبردست کارنامہ ہوگا پورے ملک کے اخبارات میں شہ سرخیاں شائع ہوں گی اور ہاں اگر تم اپنے جیسے تین آدمیوں کا بندوبست کر سکو تو پھر ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“



فنشانے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا مطلب بھی وہی ہے۔

”تمہارا مطلب ہے۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم واقعی یہ کہنا چاہتے ہو کہ بینک لوٹنے کے بعد فرار کے لیے تم کوئی ٹیکسی استعمال کرو گے؟“

میرا خیال ہے کہ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے فنکر فنشا اور دو ساتھیوں موٹو اور رالف کا تعارف

کر دادوں۔ ہاروے کی تجویز کے بعد میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ فنکر نقل مکانی کا ماہر تھا اس کا دعویٰ تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ تجویز وہ چند گھنٹوں میں کھول سکتا ہے گزشتہ تجربات کی بناء پر میں یہ تسلیم کر چکا ہوں کہ وہ اپنے اس دعوے میں حق بجانب تھا۔ موٹو کسی زمانے میں ہالی ووڈ کی فلموں میں میک اپ مین کا کام کر چکا تھا۔ میک اپ کے فن میں اس جیسا ماہر آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ ہومر کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ ڈکیتی کے

معلومات میں وہ آل راؤنڈ رہتا۔ ہماری یہ ملاقات شہر کے نواحی علاقے میں واقع ہوٹل میں ہوئی تھی۔ موٹو اور ہومر تو وہاں آتے ہی حسب معمول ری کھیلنے میں مصروف ہو گئے تھے ہماری گزشتہ ملاقات میں موٹو بارہ ڈالر ہار گیا تھا اور اب وہ ہومر سے یہ رقم جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فنکر کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی شراب کی بوتل اور آئینہ کسی ڈکیتی کی منصوبہ بندی اس کے علاوہ اسے دنیا کی اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔

”اس مرتبہ طریقہ کار میں یہ تبدیلی میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔“ وہ بوتل سے شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ”ہم ہمیشہ سے چوری کی کاریں استعمال کرتے آئے ہیں۔ جنہیں واردات کے بعد کہیں بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ٹیکسی استعمال کرنا تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہم ٹی وی کے کسی ڈرامے کی عکس بندی کر رہے ہوں۔“

”یہ طریقہ کار پہلے سے مختلف تو ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ قابل عمل اور کارآمد نہیں۔ چوری کی کار استعمال کرنے کے سلسلے میں ایک وضاحت کر دوں کہ جب کبھی اس قسم کی واردات ہوتی ہے پولیس سب سے پہلے چوری شدہ کاروں کی لسٹ چیک

کر کے علاقوں کی ناکہ بندی کر دیتی ہے۔ اکثر وارڈا میں محض چوری کی کاروں کے استعمال کی وجہ سے ہی ناکام ہو جاتی ہیں جب کہ ٹیکسی میں ہم پورے اطمینان سے شہر میں گھوم پھر سکتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”بہ بھی تو سوچو فنگر کہ اخباروں میں کیسی سنسنی خیز سرخیاں لگیں گی۔ بینک لوٹنے کے بعد ڈاکو ٹیکسی میں فرار ہو گئے کیا یہ ایک منفرد کارنامہ نہ ہوگا۔“ فنگر کی آنکھوں میں چمک سی ابھرا آئی۔

”تمہارا یہ آئیڈیا تو بہت اچھا ہے لیکن عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں ریہرسل ضروری سمجھتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو ٹیکسی ڈرائیور اس معاملے میں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہے وہ اوٹ کی رقم میں سے کسی حصے کا طلب گار نہیں۔“

فنگر اس وقت پانی کا جگ لینے کے لیے اٹھ رہا تھا۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور مجھے گھورتا ہوا مخاطب ہوا۔

”ٹیکسی ڈرائیور کو اس سارے پروگرام کا علم ہے وہ لوٹ کے مال میں سے کوئی حصہ بھی نہیں لے گا۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے باجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ میں نے فنگر کو باروے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ وہ حقیقی جرائم کا دلدادہ ہے اور یہ کہ وہ میرے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہے اور قرض فراہم کرنے والی کمپنی لوٹنے کے بعد اس نے اپنی ٹیکسی میں مجھے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔

”اس کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ ہمیں یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے دیکھ سکے ڈرا سوچو تو۔۔۔۔۔“

”میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے بہر حال۔“ فنگر اس کے بارے میں متکون تھا پھر مجھے ملے میں

شبہ کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا اور یہی اس کی خصوصیت بھی تھی اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ پروگرام میں بددیانتی جھول یا گڑبگڑ خفی پہلو ہے تو کبھی شمولیت اختیار نہیں کرتا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کا شک و شبہ مشکل سے ہی غلط نکلتا تھا۔

”کیا ٹیکسی تمہاری اپنی ہے؟“ فنگر نے ہاروے کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ ہاروے نے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس دو ٹیکسیاں ہیں اور دونوں گاڑیوں کے لیے فل ٹائم ڈرائیور موجود ہیں۔ ڈرائیوروں کی چھٹی کے بعد فاضل ٹائم میں میں اور ایلی سے گاڑیاں چلا لیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے یہ تمہارا باقاعدہ بزنس ہے تمہاری اس کمپنی کا نام کیا ہے؟“ فنگر نے پوچھا۔

”ٹائیگر ٹیکسی سروس۔“ ہاروے نے جواب دیا۔

”ٹائیگر ٹیکسی سروس۔“ فنگر نے دھیرے سے نام دہرایا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرا آئی۔ اس کا مطلب ہے تم واقعی بہت خطرناک آدمی ہو تمہیں اپنے کاروبار میں کافی سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہوگا۔“

”زیادہ نہیں مقابلہ تو دراصل بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ میری چھوٹی سی کمپنی کا نام کچھ عجیب سا ہے۔ دراصل میرا بیچن ایری زونا کے کوسروں میں گزرا ہے میرے پھر تیلے پن کی وجہ سے میرا باپ بیچن ہی سے مجھے مانگیر کہا کرتا تھا۔ اپنے باب کا دیا ہوا نام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“ ہاروے نے کمپنی کے نام کی وضاحت کی۔

فنگر اس سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا ہاروے کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو آکٹا کر بھاگ جاتا لیکن وہ ہر بات کا جواب محل اور ممانت اور خوش دلی سے دیتا رہا۔ فنگر ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا اور یہ شعبدہ اسی کا

تھلا خرفنگر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا منصوبہ واقعی شان دار ہے۔ تمہارا پروگرام جرائم کی دنیا میں دلچسپ منفرد ہوگا۔“

”میں نے طویل عرصے سوچ بچار کے بعد منصوبے کو ترتیب دیا ہے اور ہر پہلو کا بغور جائزہ لے رکھا ہے۔“ ہاروے نے ایک بار پھر خوش گوار انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کے بحث مباحثے کے بعد بدھ کا دن اس کام کے لیے مقرر کر لیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ بینک بند ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے اپنے منصوبے پر عمل کیا جائے کیونکہ اس وقت کاروباری لوگ اپنی اپنی رقم جمع کروانے آتے ہیں۔ اس وقت نہ صرف یہ کہ بینک میں اچھی خاصی رقم موجود ہوگی بلکہ لوگوں کا ہجوم بھی ہوگا کیونکہ بینک انتظامیہ فائرنگ کر کے بینک کے گاہکوں کو زخمی باموت کے گھاٹ اتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ اس طرح ہمیں ہفتے سے منگل تک ریہرسل کے لیے مناسب وقت مل گیا۔ بلا آخر ریہرسل کے بعد عملی اقدام کا وقت پہنچا۔

مقررہ وقت سے تقریباً دس منٹ پہلے ہم سب بینک سے ایک بلاک کے فاصلے پر واقع ایک ہوٹل کی لابی میں جمع ہو گئے اس وقت ہم سب بے فکر اور ہشاش بشاش نظراً آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہاروے نے ایک بڑا سا بریف کیس میری طرف بڑھا دیا۔

”ایک لاکھ ڈالر کے مطالبے والا کاغذ اس کے اندر رکھا ہوا ہے۔“ اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فنگر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور بینک کے دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم بینک میں داخل ہوئے تو پروگرام پر عمل کرنے کے لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا کیونکہ اس وقت



بینک کا منیجر ایک قیمتی سوٹ والے آدمی سے باتوں میں مصروف تھا۔ اس آدمی کے اٹھتے ہی میں بھی حرکت میں آ گیا۔ میں سیدھا بینک کے صدر کی میز پر پہنچا اور ابھی ڈرائنگ کے نام سے اپنا تعارف بھی پوری طرح نہیں کر ایتھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج گئی۔ پروگرام کے مطابق اس نے سرنک کے موڈ پر پبلک فون اٹھ کر سے رنگ کیا تھا۔ میں قدرے آگے جھک گیا تاکہ ریسپور سے ابھرنے والی آواز میں بھی سن سکوں ہارے کی مدد ہم آواز سنائی دے رہی تھی۔

”مسٹر برائٹ! براہ کرم ڈرائنگ میں آئیں“ میں نے طرف ایک نظر ڈال کر اوجو سیاہ ٹاپ کوٹ پہنے ہوئے تین اور جن کے ہاتھوں میں بینک نظر آ رہے ہیں۔ وہ لوگ کیشیئر کے کاؤنٹر کے قریب کھڑے اس وقت ڈیپارٹ سسٹمز پر کر رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں نظر آنے والے سیگنل میں پندرہ پونڈ وزنی ڈائنامائٹ موجود ہے جسے تمہارے بینک کا پرائیویٹیکٹر چیک نہیں کر سکا۔ یہ پھلوں کے اندر چھپایا گیا ہے اگر تم میری ہدایت پر عمل کرتے رہے تو کسی قسم کا خطرہ پیش نہیں آئے گا اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرو کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی یا انہیں نیچے گرا دیا گیا تو تیس سیکنڈ کے اندر ایسا زبردست دھماکا ہوگا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے میرے متیوں آدمی تو دھماکا سے پہلے شاید بینک سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن تمہارے عمل یا گاہکوں میں سے کوئی بھی اپنی جان نہیں بچا سکے گا۔ اب تم خود اندازہ لگو کہ یہ تینتالیس پونڈ ڈائنامائٹ اس عمارت کے کس طرح پر نیچے اڑا سکتا ہے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل کیا تو کوئی دہشت گردی نہیں ہوگی۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مسٹر ڈرائنگ سے بریف کیس لے لو اور اسے نوٹوں سے بھر دو۔“ فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے

ہاتھ میں موجود بیگ سے ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا پستول نکال لیا جس کی نال کے اوپر سرخ رنگ کا ڈرائنگ بنا ہوا تھا۔ پستول سے بے آواز فائر ہوا اور میز پر رکھا ہوا گلاب اچھل کر پھٹتے ہوئے بکھر گیا۔ مسٹر برائٹ کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ یہ پھول ہم انہیں دینے کا کہہ کر اندر لائے تھے مسٹر برائٹ نے سر اٹھا کر ہال کا جائزہ لیا جسے وہ کسی معجزے کا منظر سمجھ رہا تھا۔

”وقت ضائع نہ کرو مسٹر برائٹ!“ میں نے سرد لہجے میں پستول کا رخ اس کے چہرے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا میں نے ٹریگر دبایا پھر بے آواز فائر ہوا اور مسٹر برائٹ کا ہیٹ اڑ کر پھٹتے ہوئے بے شمار چھٹروں میں بٹ گیا۔ گولی پیچھے دیوار میں لگے ایک تصویری فریم میں دھنس گئی۔ مسٹر برائٹ کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی اس نے اپنے آدمی کو بلا کر بریف کیس اس کے توالے لے کر دیا۔ ہیٹ کے کچھ بڑے مسٹر برائٹ کے چہرے اور جسم پر گرے تھے۔ جسے وہ سراسیمگی کے عالم میں دیکھ رہا تھا پھر وہ مجھے بغور دیکھنے لگا جیسے میرا حلیہ ذہن نشین کر رہا تھا لیکن مومک نے مجھ پر میک اپ کے فن کا جو مظاہرہ کیا تھا اس سے میں اپنی عمر سے تقریباً دس برس بڑا نظر آ رہا تھا۔ سر کے بال بھی سیاہی بجائے بھورے تھے اور کتھیکٹ لینز کی وجہ سے میری بھوری آنکھیں نیلی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ماتحت نے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لاکر میز پر رکھ دیا۔ مجھے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا ایک لاکھ ڈالرز کی رقم کوئی معمولی نہیں تھی۔ ماتحت کے جانے کے بعد میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”مسٹر برائٹ! اب بہتر ہوگا کہ تم کچھ دیر کے لیے ریٹ روم میں جا کر سنا لو۔“ مسٹر برائٹ نے ہونٹ چباتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر اس کی

آنکھیں مومک دوسرا دفتر کی طرف اٹھ گئیں جو کیش کاؤنٹر کے قریب مستعد کھڑے تھے۔ مسٹر برائٹ کے لیے تیرے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی اٹھ کر اندرونی ریٹ روم میں داخل ہوا میں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے ایک کرسی اس طرح رکھ دی کہ دروازے کا ہینڈل اس میں پھنس گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد میں دفتر کو اشارہ کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ بینک میں اس وقت بہت سی آدمی موجود تھے لیکن کسی کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ بینک میں دیکھتی کی واردات ہو چکی ہے۔

بارے فون کرنے کے بعد اب ٹیکسی میں بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا ہمارے بیٹھے ہی اس نے تیزی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

”بہت خوب یہ کام ہماری توقع سے کہیں آسان ثابت ہوا ہے۔“ کچھ دور نکل آنے کے بعد دفتر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ مومک خاموشی سے بیٹھا ہونٹ چپا رہا تھا اور مومک کی آنکھیں بھی موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

”تم لوگوں نے واقعی بہت خوب صورتی سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔“ بارے نے کہتے ہوئے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا اور آہستہ آہستہ سوئی گھمانے لگا پھر اچانک ہی ریڈیو سے ابھرنے والی آواز سن کر ہم سانس بند ہو کر رہ گئے۔ بارے تو سیٹ سے اچھل پڑا۔

”اوہ ہمارا راز بہت جلد فاش ہو گیا۔“ ریڈیو کی آواز سننے ہی مومک کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔

”اپنے کوٹ اور بیگ وغیرہ پچھلی سیٹ کے نیچے رکھ دو۔“ بارے نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں اگلے موڈ پر تم لوگوں کو اتار دوں گا۔“ وہ لوگ یقیناً خالی ٹیکسی کی تلاشی نہیں لیں گے۔ تم لوگ شہر کے مختلف علاقوں میں بکھر جاؤ میں نشتے کی رات ہوئی میں تم لوگوں سے ملاقات کروں گا۔

اپنے حلیے بھی بدل لو۔“ تجویز مناسب تھی اس کے علاوہ فوری طور پر اور کوئی حل بھی نہیں تھا چنانچہ ہم نے بریف کیس میں ایک اور کوٹ اتار کر سیٹ کے نیچے چھپا دینے اور ٹیکسی رکتے ہی نیچے اتر کر مختلف ستوں میں روانہ ہو گئے۔ اگلے تین روز تک اخبارات ریڈیو نیٹس اور پراس ڈکٹی کی خبریں آتی رہیں جن میں بتایا گیا تھا کہ ڈاکو دلاکھ ڈالر لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں یہ اطلاع میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ بریف کیس میں رکھے ہوئے ہر سچے کے مطابق ہم نے ایک لاکھ ڈالر کا مطالبہ کیا تھا لیکن خبروں میں دلاکھ بتائے گئے تھے جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ منیجر کا وہ ماتحت جسے بریف کیس میں نوٹ بھرنے کی ہدایت کی گئی تھی اس وقت صورت حال کو سمجھ کر اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک لاکھ ڈالر خود پار کر چکا تھا۔ شریف آدمیوں کی کہیں بھی کمی نہیں ہوتی۔

پولیس نے بارے کو شبہ کی بنا پر حراست میں لے لیا تھا لیکن بارے نے بیان دیا کہ جن لوگوں نے ٹیکسی کرائے پر حاصل کی تھی ان کے متعلق اسے قطعی معلوم نہیں تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور جلد ہی وہ لوگ کرایہ دے کر اتر بھی گئے۔ پولیس کو کوئی اور ثبوت نہ پا کر اسے مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ بعد میں بارے کا انٹرویو بھی اخبار میں شائع ہوا۔ سائنز ویس کے گھر پر لیا گیا تھا۔

# طفل مکتب

احمد سعید

کسی بھی بچے کے کردار کی تعمیر میں والدین کا رویہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے  
ماں کی گود اس کے لیے پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور پھر ماں باپ کا آپس کا رویہ  
اس کے نابختہ ذہن کو اپنا تیار رخ تعین کرتا ہے۔

ایک بچے کی روزانہ اپنی اسانی کرنے کی دھمکیاں دیا کرتا

کرتے اچانک ہی وہ کسی سوچ میں گم ہو جاتا اور  
اسے متوجہ کرنے کے لیے کئی کئی بار پکارنا پڑتا۔  
انہوں نے رابرٹ کی طرف دیکھا جو ان کے  
سامنے اکیلا کلاس روم میں اپنی ڈیسک پر بیٹھا ہوا تھا۔  
وہ دبلا پتلا خوبصورت سالز کا تھا۔ اس کے بال بڑی  
نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی نیلی معصوم  
آنکھوں سے اپنی مس کو دیکھ رہا تھا۔

”رابرٹ!“

”جی مس!“

”کیا تمہیں علم ہے رابرٹ کہ میں نے چھٹی کے  
بعد بھی تمہیں کیوں روکا ہے؟“  
”مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔“ رابرٹ نے  
کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”مس گلڈا کے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔  
”نہیں رابرٹ! یہ بات نہیں ہے۔ میں برے لڑکوں  
کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ تم ان میں سے نہیں ہو  
مگر میں چند دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ کھوئے  
کھوئے سے ہو۔ تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ ہے، میں  
اسی سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہے مس لیتھن  
کریں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

رابرٹ کا جذبات سے عاری چہرہ دیکھ کر مس گلڈا کو  
احساس ہوا جیسے انہوں نے اس کے ساتھ کچھ زیادتی

چھٹی جماعت کے کمرے میں کھلی کھڑکیوں  
سے سہ پہر کے ڈھلتے سورج کی روشنی آ رہی تھی ساتھ  
ہی سڑک پر سے گزرتی ہوئی موٹروں، بسوں اور اسکول  
کی عمارت سے نکلتے ہوئے بچوں کی مسرت بھری  
آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ مس گلڈا نے دونوں ہاتھوں  
سے اپنا سر دھایا۔ وہ بے حد تھکا وٹ محسوس کر رہی  
تھیں۔ اسکول کی اڑتیس سالہ ملازمت کے دوران  
انہیں ایسی تنکان کا تجربہ بھی نہیں ہوا تھا مگر اس کی  
وجہ یہ تھی کہ سال کا یہ ٹرم ان کے لیے اچھا ثابت نہیں  
ہوا تھا۔ ایک تو کلاس بہت بڑی تھی اوپر سے پرنسپل  
کا اصرار تھا کہ تدریس کے جدید طریقے استعمال کیے  
جائیں۔ مستزاد یہ کہ ان کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا  
جو ان کے لیے ایک حادثہ جانکاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ماں کے سوالوں کا دنیا میں اور تھا بھی کون؟ وہ اپنی  
یاں سے بے حد محبت کرتی تھیں اور یہ سوچے بیٹھی  
تھیں کہ ان کا یہ ساتھ بھی نہیں چھوٹے گا۔ مس گلڈا  
ماں کی یاد کو سینے سے لگاے ہوئے تھیں مگر اس طرح  
جینا کتنا مشکل تھا۔ متعدد بار انہوں نے ماں کی یاد کو  
دل سے بھلانے کی بہت کوشش بھی کی۔

اسی اثناء میں ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ پچھلے  
چند مہینوں سے رابرٹ ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ بڑا  
اچھا بچہ تھا نہ جانے اچانک ہی اسے کیا ہوا کہ اس  
نے نکاس میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دی۔ کام کرتے

میں کھڑکی سے اس کی بیوی کا چہرہ بھی جھانک رہا تھا۔  
جو ایک کبیرہ سنبھالے ہوئے تھے اب کے پیچھے  
کر دلا کار تھی جو میں نے لون کمپنی کو لوٹنے کے لیے  
چرائی تھی یہ تصویر دیکھ کر مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس  
وقت باروے نے ہی جان بوجھ کر میری کار کا راستہ بند  
کیا تھا اس کی بیوی نے اس منظر کو کمرے میں محفوظ کر  
اور اس کے بعد باروے ٹیکسی لے کر میری مدد کو پہنچ  
گیا۔

”کاش وہ مردود میرے سامنے ہوتا۔۔۔۔۔“ میں زخمی  
سانپ کی مانند پھنکارا اور سرخ زرخین والا پستول سرک  
کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔

فنگر کے نام پر بچے پر ایک خفقانی تحریر بھی تھی۔  
”تمہارے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے فنگر!  
فون پر میں نے بینک منیجر سے دولا کھ کا مطالبہ کیا تھا۔ جو  
اس نے پورا کر دیا۔ اپنے منصوبے کو سراہنے کی داد میں  
تمہیں ضرور دوں گا۔ تمہارا یہ کہنا بھی درست ہے کہ اگر  
پلاننگ صحیح ہوتو ناکا کی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

فنگر نے پرچا انگلیوں میں سرزد کیا اس کا چہرہ غضب  
ناک تھا پھر اس کی لات زور سے ٹیپ دیکار ہو گئی۔

”میں نے جب پرچے میں دولا کھ ڈال کر کا مشورہ دیا  
تھا تو اس شاطر نے کہا تھا کہ ایک لاکھ ڈالر ہی کافی  
ہیں۔ اس نے بڑی چالاکی سے داؤ کھیلنا۔“ فنگر نے  
کری پر گر کر دھنستے ہوئے کہا اس کا چہرہ غصے سے کھول  
رہا تھا۔

”خبر سننے کے بعد میں یہی سمجھ رہا تھا کہ مسٹر  
برائٹ کے ماتحت نے ایک لاکھ ڈالر پار کر لیے تھے  
لیکن میں بلاوجہ ہی اس شریف آدمی پر شبہ کرتا رہا۔  
شاطر باروے! دولا کھ اڑا تھا۔“

۵۰

تو باروے کی بجائے ایک اجنبی کا چہرہ دکھائی دیا جو میری  
بونٹوں کا ایک کس اٹھائے کھڑا تھا۔

”مسٹر جوئے بانڈ! اجنبی نے سوالیہ نگاہوں سے  
میری طرف دیکھا جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو  
وہ کس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مسٹر باروے پلاک کی طرف سے تسلیات  
کے ساتھ۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتا وہ شخص  
تیزی سے جا چکا تھا۔ جب میں اندر آ کر بکس کھولنے  
لگا تو ہومو بھی میرے قریب آ گیا۔

”ایک لاکھ ڈالر کی بجائے یہ بکس اس میں کیا ہے؟“  
وہ بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

”ٹیپ ریکارڈر!“ فنگر نے بکس کے اندر جھانکتے  
ہوئے کہا۔ ”باروے نے ہمیں موسیقی کا کوئی تھو تھو نہیں  
بھیجا۔“ میں بڑبڑایا پھر جلدی سے ٹیپ ریکارڈر سے  
منسلک تار دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔ چند لمحوں تو  
سر سر ہٹ کی آواز ابھری پھر اناؤنسر کی وہ آواز سنائی  
دیے گی جو ڈیوٹی کے فوراً بعد راہ فرار اختیار کرتے  
ہوئے ہم نے ٹیکسی کے ریڈیو سے سنی تھی۔

”اوہ! اس کا مطلب ہے وہ ریڈیو کی خبر نہیں تھی وہ حرام  
زلوہ ریکارڈر چلا رہا تھا اور ہم نے اس کی بات کا یقین  
کر لیا۔“ وہ چند لمحوں گھومتی ہوئی ریل کو گھورتا رہا۔ ”ہم  
چاروں کا شمار ملک کے مشہور اور چالاک لیٹیروں میں ہوتا  
ہے لیکن وہ شاطر ہم سے ایک لاکھ ڈالر لوٹ کر چلا بنا۔“  
”میں اسے قتل کر دوں گا۔“ ہومو چخا۔

”اسے میرے حوالے کر دینا، تڑپا تڑپا کر ماروں  
گا۔“ مونک چلا یا۔ بکس میں ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ  
باروے نے ایک تصویر بھی بھیجی تھی۔ جس کی پشت پر  
میرے نام ایک پیغام لکھا ہوا تھا۔ تصویر میں باروے  
ایک سیاہ رنگ کی پک اپ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا  
تھا۔ اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی پک اپ



کی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ بچے سے اس قدر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔  
 ”اچھا رابرٹ!“ وہ شگستگی سے بولیں۔ ”کیا تمہیں یاد ہے کہ تم کیا سوچ رہے تھے؟“  
 ”ہاں مس۔“  
 ”کیا سوچ رہے تھے؟“  
 ”آپ مجھ سے نہ پوچھیں تو بہتر ہوگا مس۔“  
 ”نہیں میں ضرور جاننا چاہتی ہوں رابرٹ۔“  
 ”ٹھیک ہے مس۔“ رابرٹ آہستگی سے بولا۔  
 ”مس میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ مرجائیں۔ میں سوچ رہا تھا کاش میں آپ کو قتل کر سکتا۔“  
 رابرٹ کی باتیں سن کر مس گلڈا کا دماغ ایک لمحے کے لیے تو سن ہو گیا۔ وہ اس وقت صرف دس فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھیں جب ایک تیز رفتار کار نے ان کی ماں کو پھیل کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہ چلائی تھیں اور نہ ہی بے ہوش ہوئی تھیں۔ بس لوگوں کی طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔ وہ سب کچھ انہیں بالکل غیر حقیقی لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بالکل اسی کیفیت سے دوچار تھیں۔ ان کے سامنے قطاروں میں خالی ڈیسکیں پڑی تھیں۔ عقب میں دیوار کے ساتھ وسیع تختہ سیاہ تھا اور رابرٹ.....! لگتا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ آخر وہ اپنی کرسی سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رابرٹ کی طرف آئیں۔  
 رابرٹ ڈیسک پر سکر گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ اس نے کہنی اپنے چہرے کے سامنے کر لی جیسے پتھر سے پتھر چاہا رہا ہو۔  
 ”کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے انہی کیا کہا ہے؟“ مس گلڈا ابھاری آواز میں بولیں۔  
 ”نہیں مس! یقیناً میں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ انہوں نے بے یقینی کے انداز میں اپنا سر ہلایا۔

”آخر تم نے یہ بات کیسے کہی؟ آخر تم جیسے چھوٹے سے لڑکے کے منہ سے اتنی بے ہودہ اور خوف ناک بات کیسے نکلی؟“  
 ”آپ ہی تو پوچھ رہی تھیں! آپ ہی تو جاننا چاہ رہی تھیں۔“ رابرٹ نے متوجہ پتھر سے اپنے چہرے کو بچانے کے لیے کہنی اور اوپر اٹھالی۔  
 ”ہاتھ نیچے کرو۔“ وہ چلا پڑیں۔ پھر فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ ”میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی بچے پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ ہی اب ایسا ارادہ ہے۔“  
 رابرٹ نے ہاتھ ڈیسک پر گرا دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں جھنسا کر بیٹھ گیا۔ اس کی انگلیوں کی پوریں سفید ہو رہی تھیں۔ مس گلڈا کو حیرت تھی کہ خود ان کے ہاتھ کیوں کپکپا رہے تھے؟  
 ”یہ بات اتنی معمولی نہیں ہے رابرٹ کہ میں اسے یہیں ختم کر دوں۔“ وہ بولیں۔ ”اپنا ہتھ اٹھاؤ ہم مسٹر ہارکس کے پاس چل رہے ہیں۔ شاید یہ بات ان کے لیے دل چسپی کا باعث ہو۔“  
 مسٹر ہارکس اسکول کے پرنسپل تھے۔ انہیں اس اسکول میں آئے ایک ہی سال ہوا تھا اور آتے ہی انہوں نے تعلیم و تدریس کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔  
 انہوں نے رابرٹ کا خوف زدہ چہرہ دیکھا پھر ان کی نظر مس گلڈا کے سینے پر پڑی۔  
 ”کیا بات ہے؟“ وہ خوش دلی سے بولے۔ ”آپ لوگ کس پریشانی میں مبتلا ہیں؟“  
 ”یہ بات۔“ مس گلڈا بولیں۔ ”آپ کو رابرٹ ہی بتانے گا۔“ انہوں نے رابرٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر رابرٹ خوف زدہ انداز میں جھکا اور پرنسپل کے قریب جا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پرنسپل نے

لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اور قریب کر لیا۔  
 ”کیا بات ہے مس گلڈا؟“ انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”یہ بچا اس قدر ڈرا ہوا کیوں ہے؟“  
 اچانک ہی مس گلڈا خود کو بیمار سمجھوس کرنے لگیں۔ ان کا جی چاہا کہ وہ کمرے سے نکل بھاگیں۔ رابرٹ سے دور!  
 ”بس بہت ہو گیا رابرٹ!“ وہ تحکم آمیز لہجے میں بولیں۔ ”اب مسٹر ہارکس کو سچ بتا دو کہ کیا ہوا ہے۔“  
 ”میں کہتا ہوں لڑکا بہت ڈرا ہوا ہے مس گلڈا!“  
 پرنسپل تیزی سے بولے۔ ”ہم مزید گفتگو اس وقت کریں گے جب بچہ یہ سمجھنے لگے گا کہ ہم اس کے دوست ہیں۔ ہے نا رابرٹ! ہم دوست ہیں نا بیٹے۔“  
 رابرٹ نیچے اوپر سر ہلانے لگا۔ ”میں نے کوئی بری بات نہیں کی ہے۔ مس نے خود بھی کہا تھا کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔“  
 ”تو پھر ٹھیک ہے۔“ پرنسپل فاتحانہ انداز میں بولے۔ ”اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“  
 رابرٹ نے پھر اپنا سر ہلایا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ میں پچھلی کے بعد بھی اسکول میں ٹھہروں۔“  
 ہارکس نے تیز نظر سے مس گلڈا کی طرف دیکھا۔ ”میرے خیال میں اس کی صبح کی بس کل گئی ہوگی مگر کیا میں نے اسٹاف کو یہ ہدایات جاری نہیں کر دی ہیں کہ.....“  
 ”رابرٹ بس سے نہیں آتا۔“ مس گلڈا نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”بہتر ہوگا کہ میں ہی آپ کو تفصیلات بتا دوں۔..... بات یہ ہے۔“  
 ”نہیں! رابرٹ بتائے گا۔“ وہ بولے اور لڑکے کا شانہ سہلانے لگے۔ ”ہے نا رابرٹ بتاؤ کیا کیا بات ہوئی۔“  
 ”انہوں نے..... انہوں نے مجھے کلاس میں

بٹھائے رکھا۔“ رابرٹ کہنے لگا۔ ”پھر جب ہم کلاس میں اکیلے رہ گئے تو یہ میرے قریب آئیں اور بولیں۔ میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ تم سوچ رہے ہو کہ میں مرجاؤں۔ تم مجھے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“ رابرٹ کی مدہم بڑتی ہوئی آواز مس گلڈا کے دماغ میں گرم سلاخ کی طرح اترتی جا رہی تھی۔  
 ”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ چلا پڑیں۔ ”میں نے اس سے بڑا جھوٹ آج تک کسی لڑکے کی زبان سے نہیں سنا۔“  
 ”مس گلڈا!“ پرنسپل سختی سے بولے۔ ”میں کہتا ہوں کہ پہلے بچے کو اس کی بات ختم کرنے دیں۔“  
 ”مس..... میرے خیال میں مسٹر ہارکس۔“ وہ ہکلا گئیں۔ ”اس نے بہت کچھ کہہ لیا ہے۔“  
 ”اچھا۔“  
 ”رابرٹ کئی روز سے کلاس کے کام پر ذرا توجہ نہیں دے رہا ہے خاص طور پر آج تو اس نے حد ہی کر دی کلاس ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کن خیالوں میں گم رہتا ہے تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا ”میری خواہش ہے کہ آپ مرجائیں اور کاش میں آپ کو قتل کر سکتا۔“  
 ”یہ الفاظ رابرٹ نے کہے تھے؟“  
 ”بالکل یہی الفاظ مسٹر ہارکس۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے یہ سن کر کتنا جھکا لگا! کیا صدمہ ہوا ہے کیونکہ رابرٹ میری کلاس کے اچھے لڑکوں میں سے ایک رہا ہے۔“  
 ”اس کا ریکارڈ؟“  
 ”اس کا ریکارڈ بہت اچھا ہے بس نہ جانے.....“  
 ”دوسرے بچوں کے ساتھ اس کا ریکارڈ؟“  
 ”جہاں تک میرے علم میں ہے اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا نہ ہی کبھی کسی کو ستایا۔“

”مگر اس نے کسی وجہ سے تمہارے ساتھ گستاخی کی ہے؟“

”نہیں۔“ رابرٹ چلا اٹھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ میں نے کبھی کوئی غلط بات نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ انہیں پسند کیا ہے۔ سارے استادوں میں میں مس گلڈا مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔“

”مس گلڈا نے اپنی جیبوں میں چاندی کی چینسل ٹھولی مگر چینسل وہاں نہیں تھی۔ انہوں نے پریشانی سے فرش پر نظر دوڑائی۔“

”کیا بات ہے؟“ پرنسپل نے دریافت کیا۔

”میری چینسل۔“ وہ بولیں۔ ”ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“ نہ جانے کہاں گئی۔“

”مس گلڈا۔“ پرنسپل حلقی سے بولے۔ ”کیا یہ موقع ایسا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”میرے لیے وہ بے حد قیمتی ہے۔“ مس گلڈا بڑی بے جا رگی سے بولیں۔ ”وہ میری ماں کی نشانی ہے۔“ پرنسپل کی تیز نظر انہیں اپنے بدن میں چھپتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ ہیکل آنکھیں سرخ ناک اور بکھرے ہوئے بال۔“ میں بے حد پریشان ہوں مسٹر ہارکنس۔ یہ ٹرم بے حد طویل ثابت ہوا ہے۔ اور اب آخر میں یہ ہنگامہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

”مسٹر ہارکنس کے چہرے پر زری پھیل گئی۔“ کوئی بات نہیں مس گلڈا۔“ وہ ہمدردی سے بولے۔ ”مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو اجازت ہے۔ میں اور رابرٹ کچھ دیر باتیں کریں گے۔“

”مس گلڈا کے جانے کے بعد مسٹر ہارکنس نے دو واڑہ بند کیا اور رابرٹ کے پاس آ گئے۔

”مس گلڈا بھاری قدموں سے زینے چڑھ کر کلاس

روم میں آ گئیں۔ چاندی کی چینسل رابرٹ کی ڈیسک کے قریب فرش پر پڑی تھی۔ انہوں نے چینسل اٹھا لی اور بڑے پیار سے اسے رومال سے صاف کرنے لگیں۔ پھر وہ اپنی کرسی پر آ بیٹھیں اور رومال آنکھوں پر رکھ کر دس منٹ تک بیٹا واڑہ روٹی رہیں۔

اس رات جب ذلت کے احساس میں کمی آئی تو مس گلڈا بستر پر لیٹ کر مصنفانہ انداز میں دن کے واقعے کا جائزہ لینے لگیں۔ بڑی دیر بعد وہ اس ناخوش گوار نتیجے پر پہنچیں کہ ان کی ہنہ انہوں نے بچے کو اسکول کے بعد رکھنے کا حکم دیا تھا جس کا مطلب وہ سزا کے علاوہ اور کچھ نہیں لے سکتا تھا۔ پھر اسے حکم دیا گیا کہ وہ اپنے دماغ میں گفتگوں سے بچنے والے بچکانہ خیالات کا اظہار کرے ظاہر ہے کہ وہ ان کھمرے ہوئے خیالات کو زبان دینے سے قاصر تھا اس لیے فوری طور پر جو بات بھی اس کے ناچختہ ذہن میں آئی وہی اس نے اگل دی۔ یہ ایک عارضی سی بات تھی۔ ہوا کے بلکے سے جھونکے کی طرح جو بچے کے ذہن میں آیا وہ کرگزار۔ ”مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ بڑبڑاتی اور پھر نہ جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح کلاس میں انہوں نے رابرٹ کا زرد چہرہ دیکھا تو انہیں دکھ سا ہوا اور وہ طمانی کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔ وقفے کے دوران میں ان کی صراحی میں پانی بھرنا کلاس کے ماسٹر کی ذمہ داری تھی۔ اس دن انہوں نے یہ کام رابرٹ کو تفویض کر دیا۔ یہ کام کلاس کے لڑکوں کے لیے ایک طرح کا اعزاز ہوتا تھا۔ وقفہ ختم ہونے سے فوراً ہی دیر پہلے مس گلڈا تختہ سیاہ کو صاف کرنے لگیں۔ اسی وقت انہوں نے عقب میں رابرٹ کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ صراحی اٹھا کر کلاس میں آ رہا تھا۔ مس گلڈا نے چابا کہ مڑ کر اس کی طرف دیکھیں مگر نہ دیکھنے کیوں ملن

کی ہمت جواب دے گئی، انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے رابرٹ ان کا استاد ہے اور وہ اس کی خوف زدہ شاگرد! اس خیال سے ان کا بدن سلگ اٹھا جیسے یک لخت انہیں بخار چڑھ گیا ہو۔

وقفہ ختم ہونے کی کتنی بھی تو رابرٹ دوبارہ صراحی لیے کلاس میں آیا۔ مس گلڈا نے ڈسٹر تختہ سیاہ کے نچلے خانے میں رکھا اور اس کی طرف مڑیں۔ ”بہت بہت شکریہ رابرٹ۔“ وہ بولیں۔ رابرٹ نے صراحی کو اس کی جگہ پر رکھا اور بڑی آہستگی سے اس کے منہ پر مس گلڈا کا گلاس جمادیا۔

”کوئی بات نہیں مس۔“ رابرٹ زری سے بولا۔

”آپ اس وقت یہ سوچ رہی ہیں کہ کہیں میں نے پانی میں زہر تو نہیں ملا دیا مگر میں نے ایسا نہیں کیا ہے مس! یقین مانیں میں نے اس میں ہرگز زہر نہیں ملا دیا۔“

”مس گلڈا کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی۔ انہیں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ رابرٹ کے کندھے کی طرف بڑھایا۔ رابرٹ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ بیچھے ہٹا۔ مس گلڈا نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”تم نے یہ بات کیوں کہی رابرٹ؟“ ان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ ”یہ انتہائی گستاخی ہے۔ کیا تم اس طرح بہت زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو؟“

اسی وقت اچھلتے شور مچاتے دوسرے بچے بھی کلاس میں آ گئے۔ مس گلڈا نے ان کی طرف غصے بھری نظر ڈالی اور انہیں خاموش کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ سارے بچوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ مس گلڈا نے تڑپھی نظر سے مصوم بچوں کی طرف دیکھا جو ان کی خفگی پر حیران کھڑے نہیں دیکھ رہے تھے۔

”مس گلڈا! احساس برتری سے پھول سی گئیں۔“

”میں تم سے بات کر رہی تھی رابرٹ۔“ وہ بولیں۔

میں تمہارا جواب سننا چاہتی ہوں۔“

رابرٹ ایک قدم اور پیچھے ہٹا مگر فرش پر پڑے ہوئے ایک بستے سے ٹکرائے ٹکڑا گیا۔ وہ بڑی بے چارگی سے مس گلڈا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بولو رابرٹ!“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے مس۔“ وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ ”میں نے آپ کے پانی میں کچھ نہیں ملا دیا ہے۔ میں نے کچھ نہیں ملا دیا ہے۔“

”غیر دیکھو مس گلڈا کو احساس ہو گیا کہ اب سارے بچوں کی نظریں ان پر گڑی ہوئی ہیں۔ ان کے اندر اٹھتے ہوئے فتح مندی کے احساس پر گھبراہٹ اور پشیمانی غالب آتی جا رہی تھی۔ رابرٹ انہیں کوئی عجیب و غریب مخلوق نظر آ رہا تھا جو انہیں اپنے ساتھ گھینٹا ہوا تاریک اور خوف ناک وادیوں میں لیے چلا جا رہا تھا۔ پھر انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ اب وہ رابرٹ کو دوبارہ مسٹر ہارکنس کے پاس بھی نہیں لے جاسکتی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ کل کا منظر یاد کر کے خوف سے ان کا دل لرز اٹھا تھا بلکہ دوسرے ہی دن دوبارہ ملاقات اس بات کا ثبوت ہو سکتی تھی کہ انہیں سال کی ملازمت کے بعد بھی وہ اپنی کلاس میں نظم و ضبط رکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں مگر رابرٹ کو یوں بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے دوسرے تمام بچوں کو اپنی جگہ پر بیٹھنے کو کہا اور پھر رابرٹ کی طرف مڑیں جو ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔

”رابرٹ!“ وہ بولیں۔ ”جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے اس پر معافی مانگو۔“

”مجھے بے حد افسوس ہے مس۔ میں معافی چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔



”مس گلڈا نے اپنے دل کو سخت کر لیا۔“ یوں کہو میں معذرت چاہتا ہوں مس۔“ وہ بولیں۔“ میں دوبارہ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“

”میں معذرت چاہتا ہوں مس۔“ رابرٹ نے آنسو ضبط کرتے ہوئے دہرایا۔ ”میں اب ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“ پھر وہ اپنی سیٹ پر گر سا گیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ مس گلڈا بولیں اور خاموش بیٹھی ہوئی کلاس پر ایک نظر ڈالی۔ ”یہ ہم سب کے لیے ایک اچھا سبق ہے۔“

اس کے بعد کلاس کا کام دل جمعی سے نہیں ہو سکا مگر مس گلڈا نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ چند ہی روز کی قیامت ہے پھر یہ ٹرم ختم ہو جائے گا۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ اپنے باغ کی دیکھ بھال کریں گی۔ اس میں نئے پھول پودے لگائیں گی اور جب اگلے ٹرم کے لیے اسکول آئیں گی تو ان کے پاس نئی کلاس ہوگی جس میں رابرٹ نہیں ہوگا۔

کلاس ختم ہونے کے بعد کمرے کی کھڑکیاں بند کرتے وقت مس گلڈا نے باہر دیکھا۔ بس اڈے کے قریب چھٹی کلاس کے لڑکے رابرٹ کو گھیرے کھڑے تھے۔ وہ بڑے جوشیلے انداز میں ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مس گلڈا نے جلدی سے کھڑکی بند کر لی۔ نہ جانے کیوں وہ خود کو حرمی محسوس کر رہی تھیں۔

بچہ ہی تو ہے۔ انہوں نے خود کو سمجھایا۔ محض ایک بچہ مگر اس خیال نے ان کے غصے کو کم کرنے میں ذرا بھی مدد نہیں کی۔

یہ جمعرات کی بات تھی۔ اگلے ہفتے منگل کے دن کلاس روم کے ماحول میں ایک عجیب سا تناؤ تھا۔ یہ ان کا آخری ہفتہ تھا۔ عام طور پر بچے آنے والی چھٹیوں کے خیال سے بڑے پر جوش اور جوشلے ہو جایا کرتے تھے ان کے چہروں پر مصنوعی سنجیدگی بھی طاری

ہو جاتی، استاد کی نظر ہنسنے ہی شوخیاں اور سرگوشیاں جاگ اٹھتی تھیں۔ ہمیشہ ایسا ہوتا تھا مگر اس بار مس گلڈا دیکھ رہی تھیں کہ ان کی کلاس کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔

ان کی پریشان نظریں ایک ایک بچے کے چہرے پر دینی چلیا ہٹ وہی جوش اور مسرت تلاش کر رہی تھیں جو ان کے مزاج کا خاصا اور وقت کا تقاضا تھا۔ مگر وہ تو جیسے رابرٹ بن گئے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھ بٹسکوں پر رکھے ہوئے تھے اور ان کی ہراساں آنکھیں مس گلڈا پر جمی ہوئی تھیں۔ مس کے معمولی سے اشارے پر پوری کلاس یوں کام میں مصروف ہو جاتی جیسے کسی سخت گیر مالک نے ڈانٹ کر اپنے غلاموں کو حکم دیا ہو۔ جب وہ ڈیسکوں کی قطار میں سے ان کے قریب سے گزرتیں تو سب ہی بچے رابرٹ کی طرح خوف سے ایک طرف سکر جاتے۔

”مس گلڈا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخراں بچوں کو ہوا کیا گیا ہے؟ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ سب بھی رابرٹ کی طرح سے سوچنے لگے ہوں؟ یا انہوں نے اس کی تقلید میں یہ انداز اپنالیا ہو؟ اگر انہیں علم ہو جاتا کہ رابرٹ نے کتنی ظالمانہ حرکت کی ہے تو کیا پھر بھی ان بچوں کا برتاؤ یہی ہوتا؟

”مس گلڈا جانتی تھیں کہ جب کسی استاد کو اس قسم کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ اسے اسٹاف روم میں سب کے سامنے پیش کرتا ہے پھر اس پر بحث ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی حل نکال لیا جاتا ہے ممکن تھا کہ چھٹی کلاس کی یہ حرکت کسی اور کلاس میں بھی دہرائی جا رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ محض انہی کے تصور کی کارفرمائی ہو اور اصل معاملہ کچھ نہ ہو۔ وہ اب پورے ہی تو بھرتی تھیں۔ شاید یہ ان کے بوڑھے ذہن کی پریشان خیالی ہو۔ کہیں اسٹاف روم میں انہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ اپنے انیس سالہ تجربے کے ساتھ اتنا سا مسئلہ

نوجوان اساتذہ کے سامنے کیسے رکھ سکتی تھیں؟

اسٹاف روم میں نہ جانے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ یہ اس ٹرم کا آخری ہفتہ تھا اور انہیں ابھی تک اپنی کلاس سے ایک بھی تحفہ نہیں ملا تھا جبکہ دوسری کلاسوں کے تحفے اسٹاف روم میں ڈیسک کی صورت میں جمع ہو رہے تھے جو دیگر اساتذہ کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ہر سال مس گلڈا کے تحائف کا ڈھیر سب سے بلند ہوا کرتا تھا۔ وہ اس اسکول کی قابل فخر اساتذہ مانی جاتی تھیں مگر اس سال چھٹی کلاس کے کسی بچے نے اب تک انہیں کوئی تحفہ نہیں دیا تھا۔

آخر اس دن سہ پہر کو کلاس ختم ہونے کے بعد یہ کفر ٹوٹ گیا۔ چند بچے اب بھی باہر دروازے کے سامنے ٹھہر رہے تھے مگر رابرٹ اپنی سیٹ پر بٹھا ہوا تھا پھر جب انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور جانے کی تیاری کرنے لگیں تو رابرٹ ایک ڈبا اٹھائے ان کی طرف لپکا۔ یہ مٹھائی کا ایک ڈبا تھا جس پنی میں وہ لپٹا ہوا تھا اور جس ربن سے وہ بندھا ہوا تھا اس سے مس گلڈا اندازہ لگا سکتی تھیں کہ وہ بڑی شاندار مٹھائی تھی۔ ان کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ڈبا لینے کے لیے بڑھا مگر فوراً ہی انہوں نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ جو کچھ اس نے مہرے سے ہاتھ کیا ہے اس کا ازالہ وہ اس طرح نہیں کر سکتا انہوں نے غصے سے سوچا میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔

”کیا بات ہے رابرٹ؟“ وہ دمہری سے بولیں۔ ”یہ آپ کے لیے تحفہ ہے مس۔“ وہ بولا پھر اس نے ڈبا ڈیسک پر رکھا اور بڑی احتیاط سے اسے کھولنے لگا۔ ربن اور پنی کو ایک طرف رکھ کر اس نے ڈھکن ہٹایا۔ اندر طرح طرح کی مٹھائیاں تھیں۔ ”میری می نے کہا ہے کہ دکان پر اس سے بڑا ڈبا نہیں تھا۔“ وہ بولا۔ ”کیا آپ یہ تحفہ نہیں لے رہی ہیں مس؟“

”کیا تمہارے خیال میں جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا ہے اس کے بعد بھی یہ تحفہ مجھے قبول کر لینا چاہیے۔“ مس گلڈا کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔

رابرٹ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے سامنے ایک ٹکڑا کھا کر دکھا سکتا ہوں مس۔“

”مس گلڈا اٹھیں رابرٹ نے ان پر پھر وہی وار کیا تھا۔ اسے اور آگے نہ بڑھنے دو۔ کوئی ان کے اندر سے چلایا۔ یہ پھر چالاکی کر رہا ہے یہ پھر اسی خوف ناک مکاری پر اترا آیا ہے۔“ میں ایسا کیوں چاہوں گی رابرٹ؟“ وہ خود پر قافیا پاتے ہوئے بولیں۔

”ویکیس ناس! آپ شاید سمجھ رہی ہوں گی کہ میں نے اس میں زہر ملا دیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اس لیے میں آپ کو کھاکر دکھا دیتا ہوں کہ اس میں زہر نہیں ملا ہوا ہے۔“

وہ اس جواب کے لیے تیار تھیں رابرٹ کے منہ سے الفاظ نکلنے سے پہلے ہی وہ جان گئی تھیں کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ ان کے بدن میں تاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ”تم شیطان کی اولاد! وہ بری طرح چلا میں اور ڈبے پر ایک زوردار ہاتھ مارا۔ ڈبا اڑتا ہوا کلاس کی دیوار سے جا ٹکرایا اور مٹھائی پورے کلاس روم میں بکھر گئی۔“ تم نے یہ جرات کیسے کی؟“ وہ رابرٹ پر جھپٹ پڑیں اور اسے مکوں سے کوٹ ڈالا۔ رابرٹ پوری قوت سے گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا مگر مس گلڈا شدت غیظ سے پاگل ہو رہی تھیں۔

”مس گلڈا! کمرے میں ایک آواز گونجی۔ وہ جان گئیں کہ یہ مسٹر ہارکس کی آواز ہے اور وہ ہاتھ بھی مسٹر ہارکس ہی کے تھے جنہوں نے شانوں سے پکڑ کر انہیں اس بے دردی سے پیچھے دھکیلا تھا کہ اگر وہ میز کو نہ تھام لیتیں تو یقیناً زمین پر چاروں شانے

چت گر جاتیں۔

اچانک ہی انہوں نے بڑی نقاہت محسوس کی۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ شرم اور غصے کی زیادتی نے آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادری تان دی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا۔ کھلے دروازے میں سے بچوں کے چہرے جھانک رہے تھے۔ یہ وہی بچے تھے جنہوں نے مسٹر ہارکس کو خبر دی تھی اور وہ بھاگے چلے آئے تھے۔ اب وہ رابرٹ کے پاس کھڑے تھے جو مسلسل رو رہا تھا۔ کلاس روم کی حالت بگڑ کر رہ گئی تھی۔ اس کے صاف تھرے فرش پر جگہ جگہ مٹھائی کی وجہ سے چکنائی کے دھبے پھیلتے جا رہے تھے۔

پھر رابرٹ چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے میں سے جھانکتے ہوئے چہرے بھی غائب ہو گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اب وہاں صرف مسٹر ہارکس اور مس گلڈا رہ گئے تھے۔ مسٹر ہارکس نے اپنا چشمہ اتارا اس کے شیشے صاف کر کے ان کا جائزہ لیا اور پھر دوبارہ ناک پر سجایا۔ ”ہاں مس گلڈا“ وہ ذرا دیر بعد بولے۔

”تو معاملہ اتنا بڑھ گیا ہے۔“

”مس گلڈا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔“

”مجھے دکھ ہے۔“ وہ بولے۔ ”بے حد دکھ ہے کہ اس اسکول میں جہاں میں تدریس کے جدید طریقوں کو رائج کرنے کی مسلسل سعی کر رہا ہوں وہاں اب تک جسمانی سزائیں وی جاری ہیں۔“

”یہ اچھی بات نہیں ہے مسٹر ہارکس۔“ مس گلڈا کی آواز لرز رہی تھی۔ ”یہ سچ ہے کہ میں نے لڑکے کو مارا ہے اور میں نے غلط کام کیا ہے مگر میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے کسی بچے پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“

”آہ! یہی بات تو میں جانتا چاہتا ہوں مس

گلڈا! انہوں نے مس گلڈا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ ڈنگ لائی ہوئی اس پر جا گریں۔“ اب آپ مجھے تفصیل سے پوری بات بتادیں۔“

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس مشکل میں اس دقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب مسٹر ہارکس کھڑکی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ مس گلڈا کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خلا سے مخاطب ہوں مگر وہ انتہائی جذباتی انداز میں حقائق بیان کرتی گئیں اور آخر یوں تھک کر دوبارہ کرسی پر گر پڑیں جیسے ان میں سانس لینے کی بھی ہمت نہ رہی ہو۔

مسٹر ہارکس بڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف مڑے۔ ”میں پیش رو باہر نفسیات نہیں ہوں مس گلڈا۔“ وہ بولے۔ ”لیکن باہر تعلیم ہونے کی حیثیت سے اس میدان سے کسی قدر واقفیت ضرور رکھتا ہوں۔ یہ بتانے کے لیے کہ ہمارا سامنا کس قسم کے کیس سے ہے ہمارے نفسیات ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ بڑا المناک کیس ہے“ مس گلڈا! ان کا لہجہ نرم اور ہمدردانہ تھا۔

”یہ بڑی آسان سی بات ہے کہ رابرٹ.....“ مس گلڈا بولیں مگر پرنسپل نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”میں رابرٹ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ کامل سنجیدگی سے بولے۔

”مس گلڈا نے بولنے کی کوشش کی مگر الفاظ جیسے ان کے گلے میں انک کر رہ گئے۔“ نہیں“ آخر وہ بڑی دقت سے بولیں۔ ”آپ نہیں پہچان سکتے۔ کیونکہ کسی شرارتی لڑکے نے آپ کا ناک میں دم کرنے کی قسم.....“

”مس گلڈا! گیارہ سال کا کوئی بھی بچہ جا بے وہ کتنا ہی شرارتی ہو ایسی باتیں اختراع نہیں کر سکتا جو مجھے رابرٹ نے بتائی ہیں۔ اس نے اس موضوع پر مجھ سے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اب میں نے

تمہاری بات بھی سن لی ہے اور مجھ پر ان باتوں کا نتیجہ پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔“

”سکر پھران کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ مس گلڈا نے اپنے حواس بحال رکھنے کے لیے پوری قوت صرف کر دی۔“ مگر اس کا تو واضح مطلب یہ ہوا کہ آپ میرے خلاف اس بچے کی باتوں کو سچ سمجھ رہے ہیں۔“ وہ پھپھکی گئیں۔

”بدقسمتی سے یہ شخص اس ایک لڑکے کی بات نہیں ہے۔ گزشتہ ہفتے والدین کا ایک وفد اسکول بورڈ سے ملا تھا اور انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ حالیہ واقعات کے بارے میں جو کچھ ان کے بچوں نے انہیں بتایا ہے اس پر وہ بڑے پریشان اور متفکر ہیں۔ آپ کی کلاس کے ایک درجن سے زائد بچوں نے اس میٹنگ میں یہ بیان دیا ہے کہ آپ نے انہیں ڈرایا دھمکا پا ہے اور یہ الزام دیا ہے کہ انہوں نے آپ کے پانی میں زہر ملانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو یہ جان کر شاید خوشی ہوگی کہ رابرٹ ان لڑکوں میں شامل نہیں تھا۔ اسکول بورڈ نے اسی دقت فوری طور پر آپ کو معطل کرنے کے حق میں ووٹ دے دیا تھا مس گلڈا! اگر آپ کی طویل ملازمت کے پیش نظر میں شخص اپنی ذمہ داری پر اس فیصلے کو التوا میں ڈال رکھا تھا مگر اب اس ہنگامے کے بعد میرے پاس کوئی جواز نہیں رہا۔ اب مجھے لازماً آخری قدم اٹھانا پڑے گا۔“

”معطل؟“ مس گلڈا کو پھر چمک آ گئے۔ ”مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے ریمانڈ ہونے میں صرف دو سال ہی تو رہ گئے ہیں۔ نہیں مسٹر ہارکس وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ مجھے میری مینشن سے محروم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”مجھے پریقین کرو مس گلڈا۔“ مسٹر ہارکس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ

تمہیں ہرگز کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ میں تم سے حلفیہ کہتا ہوں کہ ان کے پیش نظر اول فخر صرف بچوں کا بہتر مستقبل ہے۔“

”مس گلڈا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ لڑکھرائی ہوئی صراحتی کی طرف برہمیں اور پانی کا گلاس بھرنے لگیں مگر فوراً ہی اسے فرش پر رکھ کر کھڑکی ہو گئیں۔

”میں بورڈ سے خود بات کروں گی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔ ”میں انہیں ساری تفصیلات بتاؤں گی پھر دیکھتی ہوں کہ.....“

”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا مس گلڈا۔“ پرنسپل دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”یقین کریں کہ اب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔“

”مس گلڈا خواب زدگی سے عالم میں پرنسپل کی طرف برہمیں پھران کی آنکھوں میں خوف لہرایا انہوں نے پرنسپل کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا پھران کی ساری بے تابیاں اور پریشانیاں زبان برآ گئیں۔ وہ پرنسپل کو اپنے حالات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔“ آپ دیکھیں نا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مینشن نہیں لگے گی۔ آپ ذرا غور تو کریں مجھے مکان کی ادائیگی کرنی ہے پھر بارغ ہے..... نہیں..... بارغ تو مکان ہی کا حصہ ہے..... مگر بغیر مینشن کے..... ہر لفظ کے ساتھ ان کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پرنسپل کے بازو پر گرفت سخت کیے انہیں یوں جھٹکے دے رہی تھیں جیسے ہر لفظ زبردستی ان کے دماغ میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پرنسپل ترحم آمیز نظر سے انہیں دیکھتا رہا پھر انہوں نے نئی میں اپنا سر ہلا دیا۔ ”خود پر قابو پانے کی کوشش کریں مس گلڈا۔“ وہ بے چارگی سے بولے۔ ”آپ اپنے قابو میں نہیں ہیں۔ اب یہ ناممکن ہے کہ.....“

”نہیں۔“ مس گلڈا ہسٹریائی انداز میں چلا



”نہیں۔“

ہوئی جیسے کچھ ہوائی نہ تھا۔

جب وہ ان کے بازو کو چھوڑ کر پیچھے ہٹیں تو پرنسپل فوری طور پر جان گئے کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں مگر پرنسپل کے پیر جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اور جب انہوں نے حرکت کی تو انہیں دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ بھاگے اور کھلے دروازے کی طرف دوڑے اور سڑک پر کھلنے والے دروازے تک پہنچ گئے جس میں سے مس گھڑا گزر چکی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چشمہ تھا، کمر میں ٹیسٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے پوری کوشش کی تھی مگر وہ مس گھڑا کو نہیں پکڑ سکے تھے۔

پھر ایک بس کے بریک بڑے خوف ناک انداز میں چر چرائے۔ اور ایک ساتھ کئی چٹیں گونج اٹھیں۔ ان میں سب سے زیادہ دردناک چیخ مس گھڑا کی تھی جنہیں بس چلتی ہوئی دور جا رہی تھی۔

مسٹر ہارنکس دروازہ تھا سہ کھڑے رہے پھر جب اس کو صاف کرنے والی عورت آئی تو انہیں ہوش آیا۔ سڑک پر لوگوں کا جھوم تھا اور وسط میں مس گھڑا اپنے ہی خون میں نہائی پڑی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن چھٹی کلاس کو نئی استاد مس روزی پڑھا رہی تھیں۔ کلاس میں صرف اس وقت ہلکی سی سرگوشی گونجی تھی جب مس روزی نے اپنا تعارف کرانے کے بعد مس گھڑا کی دردناک موت پر اپنے شدید افسوس کا اظہار کیا تھا۔ پچھلی سبکوں پر یہ سرگوشیاں کچھ زیادہ ہی بلند تھیں پھر کس روزی نے ایک آواز سنی ”یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کس روزی! وہ جان بوجھ کر ایک تیز رفتار بس کے سامنے لگی تھیں۔“

کس روزی نے فوراً ہی اپنے رد کو دو تین بار میز پر بجا کر لڑکوں کو خاموش کیا اور پھر پڑھائی یوں شروع

اس سہ پہر چھٹی ہوئی تو رابرٹ سست رفتاری سے اپنے گھر کی طرف چلا۔ اس کا بھاری بستہ اس کے پہلو میں لٹک رہا تھا۔ وہ شاید جون کی خوشگوار حدت کا لطف لے رہا تھا فضا میں تازہ ہنرے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی نظر کے سامنے مس گھڑا کا ہمدرد اور دوستانہ چہرہ لہرا جاتا مگر پھر وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔

جب وہ اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہوا تو رابرٹ کا باب غسل کا لباس پہنے حسب معمول ایک بڑی سی آرام گری پر بیٹھا ہوا تھا۔ رابرٹ کی ماں پانی کا گلاس لیے اس کے قریب جھکی ہوئی تھی۔

”نہیں۔“ رابرٹ نے اپنے باپ کی بھاری آواز سنی۔ ”تم مجھ سے جھکا کر اپنا چاہتی ہو مگر میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اس گلاس میں کیا ملایا ہے میں نہیں پیوں گا۔“

”خدا کے لیے۔“ رابرٹ کی یاں کہہ رہی تھی۔ ”خدا کے لیے بی لو میں قسم کھاتی ہوں کہ یہ صرف پانی ہے اگر تمہیں اعتبار نہیں ہے تو پہلے میں اس میں سے پی لیتی ہوں۔“

یہ منظر دیکھنا رابرٹ کے معمولات میں شامل تھا تاہم وہ سحرزدہ سا کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ متحرک تھے اور عادت کے مطابق وہ زیر لب ان مکالموں کو دہرا رہا تھا جو اس کے والدین کے مابین ہوتے ہی رہتے تھے۔



# جنگ امن

اسرار احمد

وہ 20 سال سے انتقام کی آگ سینے میں جلا رہا اپنے دشمن کو تلاش کر رہا تھا مگر اس کا دشمن اپنا نام و نشان مٹا کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔

چونکا دینے والے انجام کی ایک مختصر سی فیکر کہانی

”کیا تم بندرگاہ پر موجود ہر گلا کے بارے میں جانتے ہو؟“  
ویٹر نے شانے اچکائے۔ ”بعض کے بارے میں جانتا ہوں۔“  
”کیا ان میں کوئی جرم کشتی بھی ہے؟“  
”چند ایک ہیں۔“  
”کیا ان میں کوئی ڈاکی سی جگہ نامی کشتی بھی ہے؟“

ویٹر کی بھنوس سکڑ گئیں۔ ”کل وہ یہاں سے دور..... وہاں کھڑی تھی۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ”لیکن آج وہاں ہے یا نہیں کہہ نہیں سکتا۔“  
”شکریہ۔“

وہ مشروب پینے کے بعد اٹھ کر ٹہلنے کے سے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ساحل سمندر پر بیسیوں چھوٹی بڑی درمیانہ ہر رنگ و ساخت کی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ وہ احتیاط سے ایک ایک کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس کا چہرہ سیاہ چشمے اور پی کیپ سے نصف چھپا ہوا تھا لیکن اس کی نگاہیں بے حد چوکس اور متلاشی تھیں۔ کشتیوں اور جہازوں کے پینل کی رینگ اور بعض دھاتی حصے سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا..... اور اچانک اسے مطلوبہ کشتی نظر آ گئی..... یہ امراء اور روسا

ریڈیو کے جون کی ایک صبح کینز پہنچا۔ وہ ایک شخص کو قتل کرنے آیا تھا۔ اس کی کار پہاڑیوں کے درمیان کسی سانپ کی مانند بل کھاتی سڑک پر تیر رہی تھی اور فضا پر چھائی ہوئی کہرتیزی سے چلتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ شہر میں داخل ہو کر چوڑی چٹکی کارنوٹ بولیوارڈ پر رواں ہوا تو سورج اپنی شعاعوں کا سنہرا جال پھینک چکا تھا اور کائنات کا ذرہ ذرہ ضوفاں تھا کرنیں سڑک کی دونوں جانب واقع بلند وبالا فلٹس کی سیاٹ دووھیاد یواروں سے ٹکرا کر گویا سفید آگ اگل رہی تھیں اور سڑکوں پر رواں دواں کاروں کی کھڑکیوں کے شیشوں سے منعکس ہو کر نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ اس کی کار تیزی سے فاصلے نکلتی رہی۔ اس کا رخ بندرگاہ کی جانب تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے کار بولیوارڈ میں بھیرٹ پر بندرگاہ کے رخ پر پارک کر دی۔ یہاں کینز اور ریسٹورانوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اور باہر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ کار سے اتر کر ایک کرسی پر جا بیٹھا فوراً ہی ایک ویٹر نمودار ہوا۔ اس نے مشروب کا آرڈر دے دیا۔ چند لمحوں بعد ویٹر اس کا مطلوبہ مشروب لے آیا۔ اس کی موٹھیں بہت صفائی سے ترشی ہوئی تھیں۔ جسم پر ٹیسٹیں، جینز اور بے داغ اپرٹن تھا۔ ویٹر اس سے فریج میں مختاب ہوا۔

ہونے لگتا۔

”یہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے۔ اتحادی فوجیں جرمنی کے مختلف اہم مقامات کو نشانہ بنا رہی تھیں۔ وہ خزاں کی ایک شفاف رات تھی۔ بمبار طیاروں کا ایک غول جنوبی جرمنی کے مقام رہر کے ملٹری ٹارگٹ پر حملہ آور ہوا۔ ایک ہزار ٹن وزنی بم اسٹنٹ گارٹ پر گرائے اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک بمبار طیارہ انتہائی مخدوش حالت میں پلٹ کر اپنی سر زمین کی سمت بھاگا۔ اس کے کنٹرول گیٹ کا ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ ریڈمرے اس بمبار طیارے کا نیوی کیٹر تھا۔ جرمن طیارے ان کا تعاقب کرتے لگے لیکن اس کا پائلٹ انتہائی مہارت سے جرمن طیاروں کو غچہ دے کر ان کی سرحد سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اس کا ایک زبردست کارنامہ تھا۔ اب اگر وہ فرانس کی حدود میں داخل ہو جاتے تو سلامتی کی توقع کی جاسکتی تھی اور وہ داخل بھی ہو گئے۔ وہ کافی اندر آ چکے تھے کہ اچانک انہیں طیارہ چھوڑنے کا حکم ملا۔ مرے اور اس کے دو ساتھی پیراشوٹ کی مدد سے کود گئے اور تاریک فضا میں بیچے آتے ہوئے انہوں نے اپنے مخدوش بمبار طیارے کو کچھ فاصلے پر غائب ہوتے دیکھا۔

ریڈ خوش قسمت ثابت ہوا۔ وہ ایک جنگل میں اترا اپنے پیراشوٹ کو دفن کیا اور رات بھر وہیں چھپا رہا۔ اسے کوئی علم نہ تھا کہ اس کے دونوں ساتھی کہاں اترے تھے۔ وہ انہیں پھر بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ مزید ایک دن اور ایک رات وہیں بڑا رہا لیکن پھر بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور کئی وسیع و عریض

کی کشتیوں جتنی بڑی اور نہ ہی ارد گرد ونگر انداز بیشتر کشتیوں جتنی چھوٹی تھی لیکن بہت صاف ستھری تھی۔ اس کا عرشہ بے داغ تھا۔ ریلنگ چمک رہی تھی کیمبن کے دروازے مہانگی کے تھے۔ مستول بلند تھا اور پہلو میں سنہرے حروف سے ”ڈائی سی جگنر“ یعنی جل پری لکھا ہوا تھا۔ یہی تھی وہ..... یہی تھی..... مرئی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ خوش قسمتی اس کے ہم رکاب تھی۔ آج اس کی طویل تلاش اور جستجو اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ اگر قسمت اسی طرح مہربان رہی تو وہ مطلوبہ شخص اسے اس کشتی میں مل جائے گا جسے وہ سالہا سال سے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وہی جسے وہ قتل کرنے آیا تھا جسے وہ صرف شکل سے پہچانتا تھا اور جس کا خاندانی نام ولیم تھا۔ وہ تیز دھوپ میں کھڑا اس خوشنما جل پری کو گھورنے لگا اور اس کے ذہن کی باگ باضی کی گیڈنڈیوں کی جانب مڑ گئی جس پر دھکتے ہوئے انگارے بجھے ہوئے تھے۔

☆☆☆.....

وہ سانحہ آج سے بیس سال پہلے پیش آیا تھا اس کی نوعیت انتہائی دلخراش اور روح فرسا تھی اور اس کے جلو میں سارے جہاں کی دہشت تھی اس نے اس سانحے کی جزئیات کو اتنی بار اپنے ذہن میں دہرایا تھا کہ وہ کسی شرابا تر تحریر کی مانند اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ آج بھی اس اند دہناک سانحے کو یاد کرتا تو اس کے حلق میں گولہ سا پھنس جاتا۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈب جاتیں۔ اس کا خون کھولنے لگتا۔ سینہ جہنم کی مانند دہک اٹھتا اور اسے اپنا دم گھٹا ہوا محسوس

میدان عبور کر کے ایک فارم پر پہنچا۔ اس کی صد احتیاط کے باوجود تاریکی میں سے ایک بے حد کچم کچم کتا اس پر بچپنا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو چاروں خانے چت پایا۔ اسی لمحے ایک انسانی ہولاکھیں سے نمودار ہوا اور اس نے کتے کو پرے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ ریڈ اٹھ بیٹھا اور شاٹ گن کی نال کو گھورنے لگا جو اس پر تھی ہوئی تھی۔ اس نے دودھ ہاتھ کرنے کی ٹھان لی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس شاٹ گن بدست سائے نے خود کو فارم کے مالک جیکیز ڈیلیئر کی حیثیت سے متعارف کرایا اور اتحادیوں سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ ریڈ کی قسمت نے ایک بار پھر اس کا ساتھ دیا تھا۔ جیکیز جرمنوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس نے ریڈ کو اپنے ہاں پناہ دینے کی پیشکش کر دی۔ اس کے چند ہی گھنٹے بعد ریڈ عام دیہاتی لباس میں نظر آ رہا تھا اور جیکیز اس کا یونیفارم نذر آتش کر رہا تھا۔ مادام جیکیز اسے کھانا کھلا رہی تھی اور مازیل ڈیلیئر نہایت جوش و خروش سے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

اس فارم سے نکلنا ریڈ کو ناممکن نظر آ رہا تھا۔ پورے علاقے میں جرمن فوجی چھائے ہوئے تھے لہذا یہ امر انتہائی حیران کن تھا کہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ مازیل ڈیلیئر نے قسم کھا کر کہا کوئی شیطان بھی ان کی نگاہوں سے بچ کر وہاں تک نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ ریڈ کو فارم پر بٹھرنے پر مجبور کر دیا گیا، اسے جلی کا غذائے فراہم کیے گئے۔ اسے بہت اچھی فریج آتی تھی۔ اس نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا اور ریڈ سے پیٹری و آسن بن کر فارم میں کام

کرنے لگا۔ یہ سب کچھ جیکیز کی ایما پر ہوا تھا۔ ریڈ نے اس کی کسی بھی بات پر اختلاف نہیں کیا اور کر بھی کیسے سکتا تھا۔ وہاں جیکیز کی بیٹی مازیل ڈیلیئر جو موجود تھی۔ وہ قدرت کا ایک انمول شاہکار تھی۔ جسے شاید ریڈ ہی کے لیے تراشا گیا تھا۔ اس کا نام سیمن تھا اور وہ تقریباً اٹھارہ سال کی تھی۔ کسی سے بھی منسوب نہیں تھی۔ ریڈ نے اس جیسی خوش رو اور خوش اندام لڑکیاں کم ہی دیکھی تھیں۔ اس کی نگاہیں کہتی تھیں کہ وہ ریڈ کی شجاعت سے بے حد متاثر تھی اور اسے پوجنے لگی تھی۔ ایک ہی ماہ کے اندر دونوں نہایت خاموشی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے صرف گھر کے افراد ہی اس کی شادی کے گواہ تھے کیونکہ وہ لوگوں کو متوجہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ صرف آس پاس کے لوگ ہی اس حقیقت سے واقف تھے۔

اگلے چند ماہ ریڈ نے گویا جنت میں گزارے۔ سیمن قدرت کا ایک انمول تحفہ تھی۔ اس کے والدین مہربان فیاض اور وسیع القلب تھے اور پھر وہ سیاہ رات آئی جس نے ہمیشہ کے لیے اس کی قسمت پر سیاہی پھیر دی اور ایک ایسا زخم دیا جس سے آج بھی پلور ستار ہوتا تھا۔ کسی نے غدار کی تھی۔ قریبی گاؤں کے کسی شخص کو سیمن کی خوشیاں ایک آنکھ نہ بھائی تھیں اور وہ اسے اس کے انگریز شوہر سے جدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ سارا گاؤں ان کا ہمدرد اور نغمہ ساز ہے، لیکن تقریباً ہر گاؤں میں ایک غدار ایک کالی بیٹھڑ اور جرمنوں کا خنجر موجود تھا، ریڈ کو اس سیاہ رات کی ایک بات یاد تھی۔ وہ محو خواب تھے کہ اچانک فارم فوجی بوٹوں کی دھمک



سے گونج اٹھا۔ دروازے دھاکے سے کھلنے لگے۔ جیکیز اور اس کی بیوی کی دہشت آمیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ پہریدار کتا بھونک اٹھا، اسی وقت ایک گولی چلی اور کتا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر ان کی خواب گاہ کا دروازہ ایک دھاکے سے کھلا اور فوجیوں کا ایک دستہ اندر گھس آیا۔ کسی نے ان کے جسم سے چادر کھینچ لی۔ ساتھ ہی ریڈ کو ایک جھٹکے سے بستر سے کھینچ کر فرش پر کھڑا کر دیا گیا اور لباس پہنے کا حکم دیا گیا۔ آفیسر انچارج چہرے پر جسم کا مالک ایک کشیدہ قامت جرمن تھا۔ اس کے جسم پر انتہائی نفیس یونیفارم تھی جو اس پر بالائی جج رہی تھی۔ یونیفارم کے ٹٹن سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ دستانے بھی بالکل بے داغ تھے۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ بائیں رخسار پر خراش کا ایک نشان اور بائیں آنکھ کے نیچے ایک بھورا تل تھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں بے حد اشتیاق سے سیمن کے سراپا کا جائزہ لینے لگیں۔

”اسے نیچے لے جاؤ۔“ اس نے گرجدار آواز میں اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ”میں خود اس لڑکی کا خیال رکھوں گا۔“

وہ اپنے دستانے اتارتا ہوا سیمن کی جانب بڑھنے لگا۔ ریڈ غصے سے پاگل ہو گیا۔ وہ اس پر جھپٹا لیکن ماتحت فوجیوں نے اسے جکڑ لیا۔ وہ ان سے گھم گھٹا ہو گیا لیکن انہوں نے اسے بے بس کر دیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ دس منٹ کے بعد وہ آفیسر چکی منزل کے ڈرائنگ روم میں دستانے پہنے ہوئے نمودار ہوا۔

”تمہاری معشوقہ بری نہیں۔“ وہ ریڈ کی

جانب دیکھ کر مسکرایا۔

”حرام۔۔۔۔۔“ ریڈ دباڑا۔

اگلے ہی لمحے اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ بڑا۔ ”تم انگلش ائرفورس آفیسر ہو۔“ جرمن آفیسر نے کہا۔ ”لہذا ہمارے قیدی ہو جہاں تک ان غداروں کا تعلق ہے۔۔۔۔۔“ وہ جملہ اوصورا چھوڑ کر اپنے ماتحتوں کی جانب مڑا۔ ”انہیں شوٹ کر دو۔“ اس نے حکم دیا۔ ریڈ زندگی بھر اس لمحے کی وہشت کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جب جرمن فوجیوں نے اپنی مشین گنیں جیکیز اور مسز جیکیز پر کھول دی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں خون میں لت پت فرش پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ ان کے مہربان دل ہمیشہ کے لیے ساکت ہو چکے تھے۔ اور ان کے جسم سے ابلتا ہوا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔

”اسے لے جاؤ۔“ جرمن آفیسر انچارج نے حکم دیا۔ رمسکر اکراپے بنوٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ”میں کچھ دیر یہیں رکوں گا۔ میرے خیال میں وہ لڑکی میری مزید خدمات کی مستحق ہے۔“

ریڈ کے منہ سے مخالفت کا طوفان ابل پڑا اور وہ جرمن فوجیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔ ”میں تجھے قتل کر دوں گا۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ ”میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔ تو جہاں بھی رہے میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا اور قتل کر دوں گا۔“

آفیسر نے مسخرے انداز میں بجا کر اسے سیلوٹ کیا۔ ”سر یہ لیفٹیننٹ ولیم آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔“ وہ بولا اور مڑ کر بالائی منزل کی طرف چلا گیا۔ اس کے ماتحت ریڈ کو وہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

☆☆☆

اس نے اگلے اٹھارہ ماہ اسٹیلگ فورٹین میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے گزارے اور جنگ ختم ہونے کے بعد دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ قیدی کیمپ میں گزرنے ہوئے ان اٹھارہ مہینوں کا ایک ایک پل انتہائی جاں گسل اور کرب آمیز تھا۔ اس دوران وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس سیاہ رات میں پیش آنے والے روح فرسا واقعے کو فراموش نہ کر سکا اس کے ذہن میں گویا اس منظر کی ریل ی چلتی رہتی۔ اس کی روح کا کرب اسے ایک پل چین نہ لینے دیتا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت سگتی راتیں۔ اس تمام عرصے میں اس کی رگوں میں خون کی بجائے گویا پگھلی ہوئی آگ دوڑتی رہی۔ وہ ہر صورت میں ولیم کو تلاش کر کے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہی اس کا مقصد حیات تھا۔ اس جرمن آفیسر کا چہرہ ہر وقت اس کی نگاہوں میں تیرتا رہتا۔ وہ اس سفاک انسان کے کردہ چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے اس کا دشمن پھوک ڈالا تھا اور اس کے سینے میں دھکتے ہوئے انگارے بھر دیے تھے۔

برطانیہ رائل ایئر فورس سے سبکدوش ہوتے ہی وہ سیدھا فرانس کے اس گاؤں پہنچ گیا جہاں اس نے ایک جنت تعمیر کی تھی۔ وہاں گاؤں کے پادری کی زبانی اس پر یہ بھیاں اور جگر خراش حقیقت عیاں ہوئی کہ ولیم سیمن کو زبردستی اسے ساتھ لے گیا تھا تاکہ اپنی داشتہ بنا کر رکھ سکے لیکن سیمن نے خودکشی کر کے اس سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی تھی۔ اس اندوہناک خبر نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ اب اس کے لیے

ولیم کو تلاش کر کے قتل کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا ولیم نہ صرف اس کی خوشیوں کا بلکہ سیمن کا قاتل بھی تھا اور وہ اس قاتل کو جہنم رسید کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اسے صرف ولیم کا نام اور جلیہ یاد تھا اور اسے جنگی کیمپ سے آزاد ہوئے بھی دو سال ہو چکے تھے۔ وہ اس کا سراغ کھو بیٹھا تھا اور اب یہ سراغ لگانا انتہائی مشکل تھا۔

فرانس سے واپس آ کر اس نے ایک سول ائیر لائن میں ملازمت کر لی اور شب و روز گزرتے چلے گئے۔ وہ ولیم کی طرف سے غافل نہ تھا۔ فرصت کے جو بھی لمحات اسے میسر آئے ان میں وہ اسے ڈھونڈنے کی سعی کرتا لیکن اس کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ ایک دہائی گزر گئی پھر دودہائیاں گزر گئیں اس طویل مدت میں اس کے سینے میں لپکتے ہوئے انتقام کے شعلے چنگاریوں میں بدل گئے تھے اور ان پر وقت کی راگہ جم گئی تھی۔ انہیں کریدنے کی ضرورت تھی اس راگہ تلے، بی چنگاریاں کسی بھی وقت دھکتے ہوئے انگاروں میں بدل سکتی تھیں۔

ایک سال بعد اس کا باپ مر گیا اور ترکے میں کثیر رقم چھوڑ گیا۔ ریڈ نے خود بھی اس عرصے میں خاصی رقم پس انداز کر لی تھی اس ترکے نے اسے فکر معاش سے آزاد کر دیا اور اب وہ اطمینان سے اپنا انیس سالہ پرانا حساب چکا سکتا تھا۔ بات بے شک بہت پرانی ہو چکی تھی اور اس کی شدت میں بھی خاطر خواہ کمی آ چکی تھی۔ لیکن اب اس کے پاس وقت بھی تھا اور رقم بھی۔ وہ یہ دونوں چیزیں اپنے دشمن کو تلاش کرنے میں صرف کر سکتا تھا۔ اسی دوران اس کے علم میں یہ

بات آئی کہ جرمن آری کا سابق لیفٹیننٹ ولیم اب ایک امیر وکیر تاجر بن چکا ہے۔ اور ڈائی سی جگہ فرمایا کشتی کا مالک ہے اس اطلاع کے ساتھ ہی وہ راکھ اڑ گئی اور چنگاریاں دھکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ولیم کو اس کے ہاتھوں مرنے سے بچا نہیں سکتی تھی۔ وہ فوراً کنیز روانہ ہو گیا۔

اس نے ذہن کو جھٹک کر ماضی کے خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا اور مضبوطی سے قدم اٹھاتا ہوا اس جہاز کے عرشے پر جا پڑا تھا۔

”کوئی ہے؟“ اس نے پکارا۔ جواب میں کسی نے نیچے حرکت کی اور پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”پلیز..... ٹھہرو..... میں اوپر آ رہی ہوں۔“ لہجہ انگریزی تھا۔ دلکش بھی لیکن شستہ۔ اس کے چند لمحے بعد ایک لڑکی کیمبن سے برآمد ہوئی اور عرشے پر آ گئی۔ ریڈ نے گہری سانس لی۔ حسن کی ضیاء پاشیوں سے اس کی آنکھیں چندھانے لگیں۔ وہ سترہ یا اٹھارہ سال کی تھی سنہری زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ انتہائی دلکش بیضوی چہرے پر نیلی آنکھیں ہیرے کی مانند جگمگا رہی تھیں۔ ہونٹ قدرتی طور پر سرخ اور ان کی خراش حد درجہ دلاؤ ویز تھی۔ اس کے جسم پر نسل کا مختصر سالباں تھا۔ وہ سچ مچ ایک جیتی جاگتی قیامت تھی۔ ریڈ نے تھوک نکل کر حلق کو تر کیا۔

”ہیلو!“ وہ مسکرا کر چکی۔ ”تم کون ہو؟“ ”میں اس کشتی کے مالک کی تلاش میں آیا ہوں۔“ ریڈ نے جواب دیا۔ ”کیا وہ موجود ہے؟“

”تم میرے شوہر سے ملنا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”لیکن وہ تو شہر گیا ہوا ہے۔ کچھ دن بعد لوٹے گا۔ تم اس کے دوست ہو؟“ ”دوست تو خیر نہیں۔“ ریڈ نے جواب دیا۔ ”مجھے بتاؤ مسز..... معاف کرنا میں تمہارا نام نہیں جانتا۔“

”مسز ولیم۔“ وہ ریڈ کے گھٹے ہوئے سانولے جسم کا سر سے پیر تک جائزہ لیتی ہوئی بولی۔ ”لیکن تم مجھے ہیلگا کہہ سکتے ہو۔“ اس کی نظریں بنے باک اور پرستاش تھیں۔

ریڈ کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی وجہ اس بیت طناز کی غیر معمولی خوش روئی یا خوش اندامی نہ تھی بلکہ اس کی طویل جستجو بالاخر اختتام کو پہنچ گئی تھی اور وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ مزید تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ ”معاف کرنا۔“ وہ مخاطب ہوا۔ ”تم بالکل نوجوان ہو۔ جبکہ میں نے تمہارے شوہر کو بہت پہلے دیکھا تھا۔“

وہ ہنس پڑی اور فضا میں جیسے جلیترنگ بنا اٹھے۔ ”اوہ ہاں ہماری شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔ وہ بولی۔ ”وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑا ہے۔ چالیس..... سے زیادہ کا ہوگا۔“

ریڈ نے تعجبی انداز میں سر ہلایا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ وہ جنگ میں شامل تھا۔“ اس نے عام لہجے میں کہا۔

”ہاں! مجھے تو اس نے یہی بتایا ہے۔ وہ فوج میں لیفٹیننٹ ہوا کرتا تھا۔ تم جانتے ہو؟“

ریڈ نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس قاتلہ عالم کی نگاہیں ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے لگیں۔ ”میرا شوہر جلد واپس نہیں آئے گا۔“

بولی۔ ”کیا تم مشروب پسند کر دے گے؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ”بچہ کیمبن میں۔“ اس کے لہجے اور آنکھوں میں واضح دعوت تھی۔

ریڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کیا۔ وہ حشر بد اماں کیمبن کی جانب مڑ گئی۔ ریڈ اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیمبن میں پہنچ کر اس عشوہ کرنے اسے مشروب پیش کیا اور اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا۔ فضا میں شیشہ ٹککنے کی آواز ابھری۔ کیمبن عطریں پھیل رہی تھیں۔ ”میرے شوہر کی واپسی بہت دیر میں ہوگی۔“ وہ دھیرے سے اپنی لمبی لمبی پٹلیں اٹھا کر بولی۔

اچانک ریڈ کے ذہن میں بیس سال پہلے کی وہ تصویر گھوم گئی تو کیا قسمت اسے ذرا انتقام لینے کا موقع فراہم کر رہی تھی؟ فرط مسرت سے اس کے گھٹنے کپکپانے لگے اور اس کے ایک گھنٹہ بعد وہ ایک بار پھر جہاز کے عرشے پر تیز دھوپ میں کھڑا اپنا تنفس سجا کر رہا تھا۔ نیچے کیمبن میں وہ شعلہ جوالہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس نے ریڈ کے ذہن میں ولیم اور سیمون کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہ بار بار ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اس سراپا ناز سے دھیانہ طریقے سے پیش آتا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے اس طرح پیش آیا تھا اور اب پسینے میں تر عرشے پر کھڑا اٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ اسے اچھا لگنا چاہیے تھا۔ اس کے اختتام کا ایک حصہ مکمل ہو گیا تھا پھر بھی اسے اپنی وہ حرکت پسند نہیں آئی تھی کیوں.....؟

”تم میری کشتی پر کیا کر رہے ہو؟“ اچانک عقب سے ایک کرخت آواز ابھری۔ لہجہ جرمن تھا۔

وہ گھبرا کر مڑا۔ اس کے سامنے بنیان اور نیکر میں ملبوس سنہری واڑھی والا ایک کچیم کچیم جرمن کھڑا تھا۔ وہ توانائی کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ ”تمہاری کشتی؟“ اس نے خنور لہجے میں پوچھا۔

”ہاں میری کشتی۔“ جرمن نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ میری اور میری بیوی ہیلگا کی کشتی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ ریڈ نے زبان پھیر کر ہونٹوں کو تر کیا۔ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ ”تمہارا نام؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہیں میرے نام سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“ اس دیوقامت نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن میں ولیم ہوں..... اب میں ایک بار پھر پوچھتا ہوں تم کون ہو؟ جواب دو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں گا۔“ ”تم..... میں ایک زمانے میں ایک لیفٹیننٹ ولیم کو جانتا تھا یہ بہت عرصے کی بات ہے۔“ وہ بمشکل بولا۔ ”اس کے رخسار پر خراش کا نشان اور ایک آنکھ کے نیچے بھورے رنگ کا تل تھا۔“ ”خراش کا نشان؟ تل؟ گویا تم میرے بھائی کو جانتے تھے؟“

”تمہارا..... تمہارا بھائی.....؟“ ریڈ نے دہرایا۔ اس کا دماغ لٹوکی مانند گھوم گیا تھا۔ ”ہاں ہاں میرا بھائی۔“ جرمن نے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔ ”اب پلیز یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں اٹھا کر.....“



# گرشش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محور زن' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وار قاتل ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کر دی ہے۔

انس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری، بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جاہلوں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلنا نظر آتا ہے تو کہیں جاہلوں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

خیر اور ایمان پسند قارئین کے لئے نئے اقسامیں تحریر خیر سلسلے وار کہانی

چلو نیا میں ابھی تمہیں دوسری مووی دلوادیتا ہوں۔“ میں نے کہا تو گولی شاید بہت کچھ سمجھ گیا بولا۔ ”اچھا چلو چلتے ہیں مجھے اور بھی مووی خریدنی ہیں چائے آ کر بعد میں پی لیں گے۔“ ”ہاں ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں تم باہر چلو میں ذرا دلارے کو بتا دوں۔“ اتنا کہہ کر میں اپنے قدموں کی آہٹ پیدا کرتے ہوئے پکن میں آیا تو وہ سبزی بناتے ہوئے ایک مشہور فلمی گیت دھیرے دھیرے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

”دلارے۔“ میں نے اسے آواز دی تو اس نے اس طرح چونکنے کی اداکاری کی جیسے بہت محویت سے اپنے کام میں مصروف ہو۔ ”جی بھائی۔“ وہ پھری چھوڑ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

”دلارے میں اور شہزادہ راہووی کی شاپ تک جا رہے ہیں۔ تم چائے تیار کرو ہم ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اس کا جواب سننے بنا ہی پلٹ گیا۔

میں نے دلارے کو جب اپنی معمولی سی پلاسٹک کی گھڑی کوکان سے لگاتے ہوئے محویت کے عالم میں دیکھا تو میں گھڑی کی چوتھائی میں سب کچھ سمجھ گیا اور پھر اسی محتاط انداز میں کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ اس سے پہلے کہ گولی استاد مجھ سے یہ سوال کرتا کہ میں کہاں گیا تھا میں نے ایک بار پھر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

”یار گولی وہ تمہارا ویڈیو کیسٹ تو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا ہے چلو میں تمہیں اس کے بدلے ایک اور شاندار سی مووی کا کیسٹ خرید کر دے دیتا ہوں۔“ گولی استاد نے میری یہ فضول سی بات سنی اور اشارے سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو میں نے اشارے سے کہا کہ وہ میری بات کے جواب میں کچھ کہے تو گولی استاد بولا۔

”نہیں یار کوئی بات نہیں اگر نہیں مل رہی تو چھوڑو جاسے دو۔“ کیسے جانے دوں وہ تمہاری پسندیدہ مووی تھی

ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ وہ کسی گونگے اور بہرے کی طرح مڑا اور پل عبور کر کے زمین پر آ گیا۔ اچانک جہاز کے عرشے سے چیخ و پکار کی آوازیں سمع برگوش ہوئیں۔ وہ بوکھلا کر تیزی سے مڑا اور ناگاہ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ہیلگا نفرت سے اپنے شوہر کے کندھے سے ٹکی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ریڈ کی جانب اشارہ کر کے کچھ بتا رہی تھی۔ ریڈ کو اپنے پیٹ میں سخت اٹھن محسوس ہونے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ ہیلگا اپنے شوہر سے کیا کہہ رہی تھی اور اس پر کیا الزام عائد کر رہی تھی۔ مارے دہشت کے ریڈ کے گھٹنے کپکپانے لگے۔ اچانک وہ جرمں بھاگتا ہوا رینگ نکلا آیا۔ اس کا چہرہ جوش غضب سے کٹی رنگوں میں بٹ چکا تھا۔ ریڈ تیزی سے مڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

”واپس آ!“ جرمں حلق کے بل چیخا۔ ”میں تجھے قتل کر دوں گا۔ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ تو جہاں بھی جائے گا جہاں بھی رہے گا۔ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا اور قتل کر دوں گا۔“

ریڈ بھاگتا رہا۔ اس کا سینہ خوف سے دہل رہا تھا اور ذہن میں شل ہو رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے ایک گولی چلی۔ پھر دوسری چلی۔ اس نے بھاگتے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جرمں اس کے پیچھے دوڑا جا رہا تھا وہ اور بھی تیزی سے بھاگتے لگا اور بھاگتے ہوئے اچانک اسے اس جرمں کے آخری الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے یہ الفاظ پہلے کہاں سنے تھے۔

”ٹھہرو۔“ اچانک ریڈ تیز لہجے میں بول پڑا۔ ”ابھی میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی ہے۔ میں تمہارے بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے ایک کام ہے۔“

وہ جرمں اسے گھورنے لگا۔ ”تم نہیں جانتے۔“ وہ مدہم لہجے میں بولا۔ ”جان بھی نہیں سکتے۔۔۔۔۔ میرا بھائی بارہ سال پہلے سر چکا ہے۔“ ”سر چکا ہے؟“ ریڈ کے ذہن کو دوسرا شدید جھٹکا لگا اور وہ اسے پہلی پہلی غیر یقینی نظروں سے گھورنے لگا۔ ”کک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ کیسے مرا؟“ ”کینسر سے۔“ جرمں نے جواب دیا۔

ریڈ نے اسے ٹوٹتی نظروں سے دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں سچائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کے جسم سے کوئی شے بہہ نکلی ہو۔ اسے اچانک ہی بے پناہ جھکن کا احساس ہونے لگا۔ وہ بیس سال سے ایک عزم کے سہارے زندہ تھا۔ اس پر ایک دھن سوار تھی۔ وہ بیس سال سے ایک شخص سے شدید نفرت کرتا آیا تھا اور ہزاروں بار اسے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کرنے کے طریقے پر غور کر چکا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے جہنم زدوں میں نہیں بلکہ آہستہ آہستہ سسکا سسکا کر نہایت بے دردی سے یہ سمجھتے بوجھتے ہوئے قتل کرے گا کہ کیوں قتل کر رہا ہے۔ ہاں وہ اسے انتہائی کرب ناک اور اذیت ناک موت سے ہمکنار کرے گا۔ اس کے انتقام کی آگ صرف اسی طرح ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔

وہ بیس سال سے جذبہ انتقام کے لاشے کو اٹھائے پھر رہا تھا اور اب۔۔۔۔۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ جذبہ گویا بھاپ بن کر اڑ گیا تھا۔۔۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں

گولی استاد اتنے میں دروازہ کھول کر باہر نکل چکا تھا دلارے میرے پیچھے پیچھے آیا اور میرے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔

”کیا معاملہ ہے یاڑ مجھے تو کچھ گڑ بڑگ رہی ہے۔“ گولی استاد نے تجسس آمیز لہجے میں کہا تو سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میری ان حرکتوں سے گولی استاد بہت بے چین ہو رہا تھا ہم جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پارکنگ میں آ گئے۔ میں نے گولی استاد کی گاڑی میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا گاڑی میں بیٹھتے ہی گولی نے بے قرار سے پوچھا۔

”یار اپ تو بتا دے کہ کیا معاملہ ہے تو نے تو مجھے اتنے زیادہ تجسس میں مبتلا کر دیا ہے کہ میرا ٹینشن سے برا حال ہو رہا ہے۔“

”بتاتا ہوں یاڑ سب کچھ بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے دلارے سے ملنے والا سارا واقعہ سنایا پھر اس کا زبردستی میرے ساتھ آنا۔ چھپ کر میری باتیں سننا اس کی بار تبدیل ہونے والی چال اور خاص طور پر اس کی وہ مشکوک پلاسٹک کی بچوں والی گھڑی کا ذکر کیا۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ہم لوگ جس لائن میں ہیں یہاں ایسے ہی کسی بھی انجانے شخص کو یوں منہ اٹھا کر اپنے گھر میں داخل ہونے نہیں دے سکتے اور خاص طور پر ملازم کی حیثیت سے اور وہ بھی ایسا ملازم جو دن رات گھر میں ہی رہے۔“

مجھے شک ہے کہ یہ کوئی عام آدمی نہیں ہے یا تو یہ پولیس کا آدمی ہے یا ایٹمی جنس کا بندہ ہے اور وہ گھڑی کوئی عام گھڑی نہیں ہے اس میں وائرلیس سسٹم موجود ہے اور مجھے یہ بھی شک ہے کہ میری غیر

موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اس فلیٹ کے ہر کمرے میں ایک ایسا سسٹم لگا پایا ہے جس کے ذریعے وہاں ہونے والی ہر بات وہ اپنی گھڑی کے ذریعے سن سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری گفتگو کو بھی اس کی جارہی ہو۔ اس کے علاوہ یہ جب چاہتا ہوگا اسی گھڑی کے ذریعے اپنے بندوں سے رابطہ کر لیتا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

میری باتیں سن کر گولی استاد بہت گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پرسیو سوچ لہجے میں بولا۔

”مجھے اس بات کا تو مکمل یقین ہے کہ یہ پولیس کا بندہ تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں ایٹمی جنس کا ضرور ہو سکتا ہے۔ اس کا صاف صاف مطلب تو یہ ہے کہ یہ ہے کہ تو اب چھپا نہیں رہا ہے اور خطرے میں بھی ہے یا یہ ایٹمی جنس والے بندے کو یوں منٹوں میں اٹھا کر غائب کر دیتے ہیں کہ کسی کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مجھے اس پر فوری طور پر شک ہو گیا اور تو نے اس کو واضح بھی کیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ اچھا ہے، میں وقت کے وقت پتا چل گیا کیا کہتا ہے ہاتھ ڈال دیں اس پر۔“ گولی بہت دھیمی رفتار میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس طرح باہر آنے کا ہمارا مقصد یہ ہم گفتگو کر لی تھی۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں تو پھر واپس چلیں؟“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”چلتے ہیں ذرا کچھ ضروری سامان تو لے لیں تاکہ اس سے ہر بات اگلوانے میں کامیابی حاصل کر سکیں۔“ گولی استاد نے جواب دیا۔

”لیکن یاڑ اگر یہ ایٹمی جنس کا بندہ ہے تو آسانی سے تو نہیں قبول کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”جب ہی تو ضروری سامان ساتھ لینے کے لیے سے تو نہیں قبول کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”کہہ رہا ہوں۔“ گولی استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ایک بات اور سوچ رہا ہوں یاڑ اور وہ یہ کہ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اس کے کچھ ساتھی گھر کے باہر موجود ہوں اور میری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے ہوں کہ میں فلیٹ سے نکل کر کہاں جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں اگر ایسا ہے تو ابھی میں روزی کے گھر سے اس سے مل کر آ رہا ہوں اور پھر تم تم بھی روزی کے گھر سے میرے گھر آئے ہو یہ اچھا نہیں ہو یا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا اب یہ معلوم نہیں کہ مجھے کس کے حوالے سے واضح کیا جا رہا ہے نواب سطوت کے یا روزی کے۔“ میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ڈونٹ وری، یہ سب ہمیں وہی بتائے گا۔۔۔۔۔۔ تمہارا دلارا۔۔۔۔۔۔!“ گولی استاد نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

”حیرت ہے یا تم ہنس رہے ہو اور مجھے بہت کچھ سوچ کر ٹینشن ہو رہی ہے یہ تو بہت کوئک ٹنگا اس نے بہت تھوڑے وقت میں بہت سارا پتا لگا لیا۔“ سوچ سوچ کر میری فکر و گئی ہو رہی تھی۔

”تم بے کار میں پریشان ہو رہے ہو ہمارا تو آئے دن اس طرح کے کاموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ہم ان معاملوں سے اچھی طرح سے نمٹنا جانتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اگر تمہارے پیچھے یہ لوگ پڑے ہیں تو نواب سطوت کے حوالے سے پڑے ہوں گے۔“ گولی استاد نے بے پروا لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے نواب سطوت کا اہم کارندہ سمجھ کر وہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوں گے لیکن انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ میرے تعلقات روزی سے بھی ہیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ اتنے باخبر لوگ روزی سے سب خبر ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا ہے نا کہ تم فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا لیکن اپنا سامان لینے سے پہلے ہمیں

مودیز کی شاپ پر بھی جانا ہوگا تاکہ ہمیں واضح کرنے والوں کو یہ اطمینان رہے کہ ہم واقعی مودیز لینے ہی گھر سے گئے تھے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ان کو یہ شک ہو جائے گا کہ ہمیں دلارے پر شک ہو گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب ہم تمہارے فلیٹ پر پہنچیں تو دلارے غائب ہو۔“ گولی استاد نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔

گولی استاد نے صدر میں ریسیوینٹر کی جانب گاڑی موڑ لی اور ہم ایک دوکانوں پر گھومتے رہے گولی استاد نے ایک دو انگلش مودیز بھی خرید لیں پھر گولی نے کسی کو فون کر کے کچھ ”ضروری“ سامان منگوایا۔ ہم واپس جا رہے تھے تو راستے میں بائیک پر ہمیں ایک شخص ملا اور اس نے ایک شاپر گولی استاد کے حوالے کر دیا۔ گولی استاد نے دھیمی آواز میں اس سے دو چار باتیں کیں اور ہم اپنے فلیٹ پر واپس آ گئے جب ہم فلیٹ پر پہنچے تو سورج اپنا دن بھر کا سفر مکمل کر کے چھپ گیا تھا اور رات کی تاریکی سب جانب پھیل چکی تھی اور میں اس تاریکی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایسی ہی تاریکی نے میرے مقتدر میرے کردار کو بھی اپنی پلیٹ میں لے لیا ہے پتا نہیں میرے نصیب میں اللہ نے صبح کا اجالا لکھا بھی ہے یا نہیں۔

فلیٹ کی بلڈنگ کی پارکنگ میں جب گولی استاد نے گاڑی روکی تو اترنے سے پہلے میں نے روزی کے دیئے ہوئے نواب جمشید کے نمبر پر فون کیا یہ نواب جمشید کا خاص نمبر تھا جس کا ہر ایک کو علم نہیں ہوتا۔ میں نے نمبر ملایا تو کئی گھنٹیوں کے بعد نواب جمشید نے فون ریسیو کیا اور بھاری آواز میں کہا

”ہیلو کون بول رہا ہے؟“

”میں بات کر رہا ہوں سر۔۔۔۔۔۔ شروز۔ مجھے میڈم



روزی کے ذریعے پیغام ملا تھا کہ آپ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو کب حاضر ہو جاؤں۔ آپ اگر وقت بتا دیں گے تو بہتر ہوگا۔“ میں نے اپنے لہجے کو مودب رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں شروژ نے کیسا ہے تو؟ میں نے روزی سے کہا تھا کہ شروژ سے کہو کہ مجھ سے آ کر ملے تم ایسا کرو کہ ہفتے کے دن بعد نماز عشاء مجھ سے آ کر ملو ٹھیک ہے بچے پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے مزید کچھ اور کہے اور سے فون بند کر دیا۔

گولی استاد گاڑی سے اتر کر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کس کا فون تھا یا میں کس سے باتیں کر رہا تھا۔ آج منگل کا دن تھا ہفتہ آنے میں ابھی تین چار دن تھے۔ اس لیے میں بے فکر ہو گیا ایک تو یہ بات کرنی ضروری تھی دوسری اہم بات جو میرے ذہن سے وقتی طور پر نکل گئی تھی وہ یہ کہ میرا رات آٹھ بجے تک کلنشن پہنچنا ضروری تھا نواب سطوت نے مجھے فوری طور پر ضروری کام سے بلوایا تھا۔

اچانک ہی مجھے یاد آیا تو میں نے چلتے چلتے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ”شٹ۔“

”کیا ہوا؟“ گولی استاد بھی چلتے چلتے رک گیا۔

”یار میرے ذہن میں اس دلارے کے پکڑ میں بالکل ہی یہ بات نکل گئی کہ مجھے نواب نے رات آٹھ بجے کوٹھی پر بلایا ہے یار میرا دہاں پہنچنا بہت زیادہ ضروری ہے۔“

”تو پھر کیا کریں؟ ہمارا کام تو ایسا ہے کہ اس میں تو کافی ٹائم لگ سکتا ہے۔“ گولی استاد نے کہا۔

”تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج اس کام کو ملتوی

کرتے ہیں تم اس وقت چلے جاؤ میں یہاں سے اپنی گاڑی میں سیدھا کلنشن کے لیے نکلتا ہوں اس وقت سوا سات تو بج رہے ہیں۔“ میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”سوچ لو شاہ زمان تمہارا ان حالات میں وہاں جانا مناسب بھی ہوگا۔“ گولی استاد نے کہا۔

”اب یار یہ بات ان لوگوں سے چھی تو نہیں ہے پھر ٹینشن لینے کا کیا فائدہ جو بھی ہے میرا نواب سے ملنا بہت ضروری ہے۔“ میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”تو پھر میں کب آؤں؟“ گولی استاد نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا۔

”کل صبح آ جاؤ وہاں پتا نہیں کتنا وقت لگے بلکہ میں تمہیں فون کر کے بلوالوں گا۔“ میں نے جواباً مزے کہا اور گھڑی میں ٹائم دیکھتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور پھر آگے پیچھے ہم پارکنگ سے نکلے گولی استاد دوسری جانب مڑ گیا اور میں دوسری جانب۔ یہ اتفاق تھا کہ میں نے گولی استاد سے اس کی رہائش کے متعلق نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے یہ ہماری دوسری ملاقات تھی ہم زیادہ باتیں بھی نہیں کر سکے تھے۔ شاید اس بارے میں بھی بات ہو جانی اگر یہ دلارے والا معاملہ ٹینشن نہ پیدا کر دیتا۔

میں اپنے انداز میں ڈرائیونگ کرتا ہوا جلد از جلد کوٹھی پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کراچی کی سڑکوں پر ٹریفک کی بھرمار رفتی ہے اور بار بار ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کب یہاں کے لوگ ٹریفک کے اصولوں کو سمجھیں گے۔ ہمیشہ جلد بازی اور دوسرے سے پہلے آگے نکلنے کی وجہ سے گاڑیاں پھنس جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وی آئی بی موڈنٹ بھی ٹریفک جام کا سبب بنتی ہے۔

ان سارے مسائل سے الجھتے ہوئے میں ٹھیک آٹھ بجے کوٹھی پر پہنچ گیا۔ کوٹھی کے گیٹ کے باہر اندر پوٹیس موبائل اور نواب کے پرائیویٹ گاڑی کی گاڑیوں کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ نواب یہاں پہنچ چکا ہے اس لیے میں سیدھا نواب کے کمرے کی جانب چل دیا۔

نواب کے روم کے باہر رانداری میں موجود دونوں گارڈز نے میری جامہ تلاشی لی اور میرے پاس موجود میرا پتول اور خنجر معذرت کے ساتھ اپنے قبضے میں لے لیا اور کہا کہ واپس جاتے ہوئے میں اپنی یہ چیزیں ان سے واپس لے لوں۔ میں نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ میں اس اصول کو جانتا تھا اور پہلے بھی اس پروسس سے گزر چکا تھا۔

میں نے اپنے مخصوص انداز میں نواب کے روم کے دروازے پر ناک کی تو اس نے بھاری آواز میں کہا:

”آ جاؤ شروژ۔“

”السلام علیکم سر۔“ میں نے اندر پہنچ کر مودب لہجے میں کہا۔

”ہوں ٹھیک ہے تم نے دریا گدی کہاں تھے یار۔“ وہ لیپ ٹاپ میں مصروف تھا ہمیشہ کی طرح میرے سلام کا جواب دے بنا اس نے بنکاری بھری اور ٹھیک ہے کہہ کر دروازے کی طرف بھاگے لہجے میں بولا۔

”میں نے بتایا تو تھا سر کہ میں نے کلنشن اقبال میں اپنے ذاتی کاموں کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے وہیں تھا۔“ میں نے نگاہیں پچی کر کے قدرے چھپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم پچھلے کئی دنوں سے کوٹھی پر نہیں تھے۔“ وہ بولا۔

”آپ نے ٹھیک سنا ہے سر آپ بھی یہاں پر

نہیں تھے اور میرا بھی یہاں کوئی نہیں تھا اس لیے میں ادھر ہی تھا۔“

”ٹھیک ہے میں نے بھی موجود ہوں لیکن تمہیں پھر بھی یہاں چکر لگاتے رہنا ہے اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے میرے اس کام کا آغاز کیا نہیں۔“ اس کا اشارہ اپنے گمشدہ بچوں کی جانب تھا جو حقیقت میں گمشدہ نہیں تھے بلکہ سرے سے مینا تو موجود ہی نہیں تھا۔

”میں نے اپنے کام کا بھی آغاز کر دیا ہے اور بس آپ یوں سمجھیں کہ کلنشن اقبال والے فلیٹ میں اس وجہ سے بھی رکا ہوا ہوں میرے پاس جو گاڑیاں آئی ہیں ان کا تعلق اسی بازار سے تو ہوتا ہے میں اپنے مطلب کی بات بھی ان سے کر لیتا ہوں۔“ میں نے صاف طور سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جس طرح بہتر سمجھو اس طرح کرو۔“ اس نے اٹھ اٹھ لہجے میں کہا پھر کچھ سوچنے لگا۔

”آپ نے مجھے کسی ضروری کام کے لیے فوری طور پر بلایا تھا سر۔“ میں نے اسے سوچوں میں گم دیکھا تو اسے یاد دلایا۔

”ادہ ہاں۔“ اس نے چونک کر اپنے سر کو زور سے جھٹکا میرے خیال میں اس کے خیال کی روایت بار پھر روشن آنی کی جانب بھبک گئی تھی۔ اس نے بیڈ پر اپنے قریب رکھا ہوا لفافہ اٹھایا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس لفافے کو تمہیں ایک شخص کو ابھی اور اسی وقت دے کر آنا ہے یاد رہے کہ یہ بہت اہم لفافہ ہے جو بروقت پہنچانا ہے۔“ اس نے تنبیہ کے لہجے میں کہا۔

”بالکل پہنچ جائے گا سر لیکن کس کو اور کہاں پر دینا ہے۔“ میں نے اس لفافے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے

کہا جو سر بمبر تھا اور اس پر نہ کسی کا نام تھا لکھا تھا نہ دینے والے کا اور نہ لینے والے کا۔

”وہ بھی بتانا ہوں۔“ اس نے کہا اور قریب کی نگاہ کا چشمہ اتار کر دور کی نگاہ کا چشمہ لگا لیا اور ساتھ ہی لپ ٹاپ کا کور بھی نیچے کر کے اسے بند کر دیا پھر بولا۔ ”یہ لفافہ تمہیں قاری ممتاز بیگ کو دینا ہے پھر اس نے مجھے ایک گنجان آبادی والی پچی بستی کا نام بتا کر اس کی مسجد کے امام صاحب کو دینے کے لیے کہا۔

”کیا جس شخص کو یہ لفافہ دینا ہے کیا وہی ممتاز بیگ ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یار وہی ہے۔“ نواب نے تیز لہجے میں کہا۔

”کیا یہ لفافہ دیتے وقت آپ کا نام بھی بتانا ہے کہ یہ لفافہ نواب صاحب نے بھجوایا ہے۔“ میں نے مزید پوچھا تو وہ جھنجھلا سا گیا اور بولا۔

”یار میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اتنے احمقانہ سوالات کیوں کر رہے ہو ارے بھئی کسی کا بھی نام بنانے کی ضرورت نہیں ہے تم وہاں جا کر کسی سے بھی قاری ممتاز کے بارے میں پوچھ لینا۔ تمہیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم اس سے ملنے کے لیے آئے ہو اور جب تم اس کے پاس پہنچ جاؤ تو صرف یہ کہنا۔“ گرمیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے اور گرمیوں میں تو آرم خوب کھائے جاتے ہیں۔ جواب میں وہ کہے گا کہ مجھے لنگڑا آرم بہت پسند ہے۔“

تم اپنی بات کے جواب میں یہ جملہ سن کر مطمئن ہو جانا اور چپ چاپ یہ لفافہ اس کے حوالے کر دینا اور سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ لیکن نہیں تمہیں میرے پاس بلکہ اس کو بھی پر بھی آنے کی ضرورت نہیں ہے تم وہیں چلے جانا، کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔!“

اس نے ذہن پر زور دینے کے انداز میں کہا۔

”ہاں گلشن اقبال اپنے فلیٹ پر چاہو تو مجھے فون

کر کے انفارم کر سکتے ہو تم صرف ایک جملہ کہنا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔“

”سریہ کوئی خاص لفافہ ہے کیونکہ آپ نے کوڈرڈ بتائے ہیں کہ ان کے بتا دے کے بعد ہی یہ لفافہ اس بندے کو دیا جائے اور آپ کا کام ہو جانے کی اطلاع بھی کوڈرڈ میں دی جائے۔“ میں نے کہا۔

”شرزد تمہیں کسی بھی معاملے کی کھوج لگانے کی ضرورت نہیں ہے بس یہ بات یاد رکھو کہ تمہیں اس کام کا علیحدہ ہ بھاری معاوضہ دیا جائے گا اور ویسے بھی یہ میرا کام نہیں ہے کسی اور کا ہے۔ مجھ سے گزارش کی تھی کسی نے اس لیے میں یہ تمہارے ہاتھوں بھجوا رہا ہوں۔ اب تم روانہ ہو جاؤ قاری ممتاز تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔“ نواب نے بات ختم کی اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

”وہ سر میں وہ اس دن والی محفل کے بارے میں کہنے والا تھا کہ وہ محفل۔۔۔۔۔!“

”یار یہ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی تم اس وقت فوراً جاؤ۔“ نواب نے میری پوری بات سننے بغیر درمیان سے کاٹ دی اور تیز لہجے میں کہا۔

”جی بہت بہتر۔“ میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور نواب کے روم سے باہر نکل آیا باہر آ کر میں نے گاڑے اپنی دونوں چیزیں ملیں اور انہیں ان کی جگہوں پر سیف کیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے روم کی جانب آ گیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی دو چار ضروری چیزیں اور پہننے کے دو تین سوٹ ایک شاپر میں ڈالے اور باہر آ گیا اور سارا سامان لفافے سمیت اپنی کار میں پچھلی سیٹ پر ڈالا اور نواب کے بتائے ہوئے پتے پر چل دیا۔

راستے میں میں نواب کے بارے میں سوچتا ہوا جارہا تھا وہ مجھے خاصا پریشان اور ذہنی طور پر الجھا ہوا

دکھائی دے رہا تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ خاصا اکھڑا ہوا تھا۔

پھر میں اس لفافے کے بارے میں سوچنے لگا کہ خراس میں ایسی کون سی چیز ہے جو کسی قاری یا مسجد کے امام کے پاس بھیج جا رہی ہے وہ بھی اتنے خفیہ اور محفوظ طریقے سے کوڈرڈ کا تبادلہ تو کسی اہم مشن میں ہوتا ہے۔

پہلے تو میرے دل میں خیال آیا کہ میں کسی جگہ گاڑی روک کر اس لفافے کو کھول کر چیک کرتا ہوں۔ اس خیال سے میں نے ایک جگہ روڈ کے سائیڈ میں کار روک دی اور ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ سے لفافہ اٹھا لیا۔ تب اندازہ ہوا کہ اس کو اس طرح سے سیل کیا گیا ہے کہ ایک بار کھولنے کے بعد اس کو اس انداز سے بند کرنا ممکن نہ ہوگا اور اگر بند کر بھی دیا تو ایک نگاہ ہی میں پتا چل جائے گا کہ اس لفافے کو کھولا گیا ہے۔ یعنی اس لفافے کو کھولنے کا مطلب ہے کہ نواب کے ہاتھوں اپنا سر کھلوانا۔

پھر میرے ذہن میں بہت سے خیالات گردش کرنے لگے۔ ملک میں پچھلی ہوئی بے پناہ دہشت گردی طالبان کا پرہیزگارہ دن و نیاڑے انسان جانوں کی ہلاکت، بم بلاسٹ۔

کیا یہ ایسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؟ کیا آج میں بھی اس شیطانیت کا حصہ بننے جا رہا ہوں؟ کیا حقیقت میں یہ لفافہ نواب کو کسی اور نے دیا ہے؟ تو پھر وہ شخص ہے؟ اس لفافے میں ایسی کون سی خفیہ رشتہ داری؟

پہلے تو میرا دل چاہا کہ میں یہ لفافہ اس شخص کو دوں لیکن میں لوٹ کر نواب کے پاس دوبارہ نہیں آؤں گا۔ پھر اپنے اس خیال کو میں نے خود ہی رد کر دیا اگر آج میں اس قدم سے ہی لوٹ گیا تو آگے کا سارا راستا

کیسے معلوم ہوگا مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ یہ لفافہ کیسے والا کون ہے اور قاری ممتاز کی اصلیت کیا ہے۔

پھر میں نے اس لفافے کو ایسی طرح لپٹے سے قاری ممتاز کو پہنچانے کا فیصلہ کر لیا جس طرح مجھ سے کہا گیا تھا۔

میں سیدھا اس بستی میں جا پہنچا جہاں زیادہ تر انتہائی غریب اور کم آمدنی والوں کی رہائش تھی میں سیدھا یہاں کی مسجد تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ نماز عشاء ہو چکی تھی اس لیے مسجد بند تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ میں نے لفافہ کار میں ہی رہنے دیا اور خود باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ تب ہی مجھے سامنے سے ایک سفید بارلش صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے میں نے ان کے سامنے پہنچ کر کہا۔

”السلام علیکم بزرگوار۔“

”وعلیکم السلام میاں، فرمائیے؟“ انہوں نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب مجھے قاری ممتاز سے ملاقات کرنی ہے کیا آپ میری رہنمائی فرمائیں گے کہ وہ کہاں ملیں گے۔“ میں نے بہت مہذب لہجے میں کہا۔

”اچھا اچھا آپ قاری صاحب سے ملنے آئے ہیں میاں وہ تو مسجد کے پچھواڑے بنے در سے کے حجرے میں ملیں گے۔ آپ ادھر ہی چلے جائیں ابھی تو وہ جاگ رہے ہوں گے در سے میں موجود ہوں کی درس و تعلیم کا دقت ہے۔“ ان صاحب نے مجھے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ جناب۔“ میں نے جھک کر ان سے مصافحہ کیا اور پھر کار میں سے لفافہ نکالا اور گھوم کر مسجد کی پچھلی جانب چلا آیا یہاں تقریباً سو گز کی ایک چار دیواری تھی جہاں پر میں کی چادر کی چھت پڑی تھی



اور لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔  
میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کھلے گیٹ کی  
جانب بڑھتا گیا قریب جا کر میں نے اندر جھانکا تو  
چھ سات چودہ پندرہ سال کے لڑکے گول دائرہ بنائے  
بیٹھے پس میں کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور ان  
سے قدر بے درہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے ایک  
تیس سالہ شخص جس کے بال کندھوں تک تھے  
درمیان سے مانگ نکالی ہوئی تھی اور اس کی سیاہ رنگ  
کی بڑی سی داڑھی تھی مونچھیں صاف تھیں بیٹھا کسی  
کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔

میں نے بلکے سے لوہے کے گیٹ پر دستک دی  
سنائے میں میری اس ہلکی سی دستک کی آواز گونج  
اٹھی۔ ان بچوں اور سیاہ داڑھی والے اس شخص نے  
چونک کر گیٹ کی جانب دیکھا پھر ان لڑکوں میں سے  
ایک لڑکا اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے نزدیک آ گیا۔  
”بیٹا! مجھے قاری ممتاز صاحب سے ملنا ہے۔“  
میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”آپ تشریف لے آئیے قاری صاحب وہ  
سامنے بیٹھے ہیں۔“ لڑکے نے مہذب لہجے میں کہا تو  
میں اندر آ گیا۔

آگے دریاں بچھی ہوئی تھیں اس لیے میں نے  
اپنے جوتے اتار دیے اور اس سیاہ داڑھی والے شخص  
کی جانب بڑھنے لگا جواب پوری توجہ سے میری  
جانب دیکھ رہا تھا۔

میں نے سلام کر کے اس سے ہاتھ ملایا وہ نعر لڑکا  
مجھے یہاں چھوڑ کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کے درمیان  
جا کر بیٹھ گیا تھا۔

قاری ممتاز نے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ ”میں نے  
آپ کو پہچانا نہیں۔“ اس لمحے مجھے اس کی آنکھوں میں  
ایک عجیب سی چمک دکھائی دی اور میں نے چند لمحے

بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا حالانکہ اس نے بہت  
عاجزی اور انکساری سے مجھ سے ہاتھ ملا کر بات کی تھی  
لیکن نبھانے کی بات تھی کہ میرا دل اس کے چہرے پر  
ایمان کے نور کی ہلکی سی جھلک نہ دیکھ پایا۔

”آپ قاری ممتاز بیگ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”جی ہاں فرمائیے یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا۔“  
اس نے ایک باہر پھر عاجزی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ  
کیا اب کوڑو روڈ دہرائے کا وقت آ گیا تھا اس لیے میں  
نے تسکراتے ہوئے کہا۔

”گرمیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے اور  
گرمیوں میں تو آم خوب کھائے جاتے ہیں۔“  
میری بات سن کر اس کی آنکھوں کی چمک مزید  
گہری ہو گئی اور وہ دبے دبے انداز میں مسکرا کر بولا۔  
”مجھے لکڑا آم بہت پسند ہے۔“

یہ شناخت ہو جانے کے بعد کہ مجھے لفاظی اس شخص  
کے حوالے کرنا تھا میں نے لفاظی اس کی جانب بڑھا  
دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اجازت ہے؟“ میں نے کہتے ہوئے اس کی  
جانب ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا۔ تو اس نے میرا  
بڑھا ہوا ہاتھ جلدی سے تھام لیا اور پھر تیزی سے ایک  
جانب بڑھ گیا وہیں میں نے ایک اور ٹین کا دروازہ  
بند دیکھا قاری ممتاز بنامیری جانب دیکھے تیزی سے  
وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا لیکن فوراً ہی مڑا اور  
دائرہ بنائے بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو  
آواز دے کر بولا۔

”وقار نامی صاحب کے جانے کے بعد گیٹ اندر  
سے بند کر لینا اب تم لوگ بھی سونے کے لیے لیٹ  
جاؤ۔“

وقار نامی وہ لڑکا کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو مجھے  
قاری ممتاز کے پاس لایا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی

وقار نامی لڑکے نے جھٹ گیٹ بند کر دیا۔ حالانکہ  
ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ لیکن باہر بالکل سناٹا  
پھیل چکا ہوا تھا۔ یہ غریبوں کی بستی تھی اور یہاں کے  
رہنے والے علیٰ آج بے دار ہو کر اپنے اپنے کاموں  
کے لیے نکل جاتے ہیں بچے بھی صبح جلدی بے دار  
ہونے کے عادی ہوتے ہیں جو بچے وہاں موجود  
سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور چوتھ دس سال  
کی عمر تک گلیوں میں کھیلنے رہتے ہیں وہ بھی رات کو  
جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

میں تھوڑی دیر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر کسی کو  
اپنے قریب نہ پا کر واپس اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔  
گاڑی اشارت کرنے سے پہلے میں نے نواب کو فون  
کیا اور اس کا بتایا ہوا جملہ جو کوڑو روڈ میں تھا دہرایا اور  
فون بند کر کے میں گلشن اقبال کی جانب چل دیا۔

آج میں نواب کی کوٹھی سے اپنے سینے کے  
کپڑے اور استعمال کی ذاتی اشیائے یا تھا۔ پھر مجھے  
دلاڑے کا خیال آیا میں اور گولی استاد اس سے دودھ  
ہاتھ کرنے کے بارے میں سوچ رہی رہے تھے کہ  
نواب کا امیر جنسی پیغام ملا کہ مجھ سے ملو تو میں اس کے  
کام سے چلا گیا۔

اپنے گلشن اقبال والے فلیٹ کی جانب جاتے  
ہوئے میں ایک بہت اہم بات سوچ رہا تھا اور وہ یہ کہ  
اس بات کا پتا لگانا بہت ضروری ہے کہ نواب کو کس  
شخص نے کیا چیز اتنے خفیہ انداز میں بھیجی ہے اور  
کیوں بھیجی ہے اور پھر نواب کا ایک پیکی بستی کی ایک  
پیمانی سی مسجد کے امام سے ایسا کون سا تعلق ہے۔

اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ نواب کے اس  
اتفاقے اور ممتاز نامی قاری کے بارے میں طلال  
صاحب اور خاص طور پر کرنل مشتاق کے علم میں یہ  
ساری باتیں لانی بہت ضروری ہے۔

میں نے سوچا کہ ذرا دلاڑے والے معاملے سے  
نٹ جاؤں تو طلال صاحب کے پاس چکر لگاؤں گا  
حشام بھی یقیناً اب پہلے سے بہتر ہی ہوگا۔

ان ہی باتوں کو سوچتے سوچتے میں اپنی بلڈنگ  
کے احاطے میں پہنچ گیا۔ کار سے اترنے سے قبل ہی  
میں نے گولی استاد کو فون کیا کہ میں گھر پہنچ گیا ہوں۔  
تمہیں یاد ہے نا کہ کل آنا ہے اس نے مجھ سے یہ  
نہیں پوچھا کہ نواب نے تمہیں کیوں اور کس کام سے  
بلایا تھا اور نہ ہی میں نے اسے بتانا مناسب سمجھا۔  
میں ان ساری باتوں سے نواب جمشید کے بندوں کو  
الگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا ان سب کا تعلق بھی  
ایک لحاظ سے جرائم کی دنیا ہی سے تھا۔ گولی استاد نے  
مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کل ضرور مجھ سے رابطہ کرے گا  
اور میرے پاس آئے گا پھر ہم دواؤں مل کر دلاڑے کی  
اصلیت خود اس کے منہ سے اگلاؤں گے۔

فون بند کر کے میں نے اپنا تھیل اٹھا یا اس میں وہ  
اشیاء اور کپڑے تھے جو میں نواب کی کوٹھی سے لایا  
تھا۔ مجھے بھوک بھی زبردست لگ رہی تھی۔ سوچ رہا  
تھا کہ دلاڑے نے رات کا کھانا بنا لیا ہوگا کھانا کھا کر  
میں سو جاؤں گا۔

میں تیزی سے سیڑھیاں پھلا گئے ہوا اپنے فلیٹ  
کے دروازے پر پہنچا اور ایک معروف فلمی گیت کی دھن  
سیٹی پر بجاتے ہوئے میں نے ٹیل کے ٹین کو دبا دیا۔  
چند لمحوں کے بعد قدموں کی آہٹ ابھری اور پھر  
دلاڑے کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔  
”دروازہ کھولو دلاڑے میں ہوں۔“ میں نے جواب  
دیا تو دلاڑے نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے  
سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند سے اٹھ کر آیا ہو۔  
”کیا سوچ رہے تھے؟“ میں یہ پوچھتا ہوا اندر داخل

ہو گیا۔

دلارے نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ ابھی تک خیندے خسار میں ڈوبا ہوا ہے۔

میں نے دو قدم مزید آگے بڑھائے ہوں گے کہ اچانک پیچھے سے میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے بہت زور کا چکرا آیا میرے ہاتھ سے تھیلانچہ گر پڑا اور میرے دونوں ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کی جانب اٹھ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے سے نازک رہے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے رکھے سر کو گھما کر دیکھا تو مجھے دو اشخاص دکھائی دیے اور پھر بس میں اس کے آگے کچھ بھی نہ دیکھ سکا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھالنے لگا۔ مجھے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ دیر اندھیروں میں گم ہونے سے پہلے مجھے بس یہ خیال آیا کہ ان لوگوں نے کسی بھاری اور وزنی شے سے میرے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا ہے! خروگن لوگ ہیں یہ؟“

☆.....☆

سفیان اپنا ایک مشن بہت کامیابی کے ساتھ مکمل کر کے آ گیا تھا۔ یہ مشن سفیان کے لیے بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ کرنل احتشام نجانبے کیا سمجھ کر سفیان سے بہت چھوٹے چھوٹے کام لے رہے تھے۔ جبکہ سفیان کوئی بڑا کارنامہ اپنے ملک کے لیے انجام دینا چاہتا تھا۔ وہ بس فارغ بیٹھا انٹیلی جنس کی تازہ رپورٹس دیکھا کرتا تھا اور ہر نئی فائل اس کے سامنے ایسے ایسے حقائق کا انکشاف کرتی کہ اس کا دل شدت سے چاہتا تھا کہ وہ بنا کسی کوتاہی کے تنہا کسی مشن پر نکل جائے اور اپنے ملک کے لیے کچھ بھی اچھا کرتے ہوئے اپنی جان ختم دے اور پھر ایک دن اس کی مراد برآئی جب کرنل احتشام نے اسے بتایا کہ

اسے نئے اسٹیشنل یونٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔

وہ اس وقت رات کے کھانے اور نماز عشاء سے فارغ ہو کر سونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ کرنل احتشام کا منبج آ گیا انہوں نے اسے فوری طور پر میٹنگ روم میں حاضری کا حکم دیا تھا اس قسم کے احکامات عموماً ملے ہیں رہتے تھے اس لیے وہ معمول کے مطابق میٹنگ روم میں پہنچا۔

اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اور دوسرے افراد وہاں پہنچ چکے تھے اور میٹنگ شروع کرنے سے قبل اس کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ کرنل احتشام نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سفیان مائی بوائے تم یقیناً یہی سوچتے ہو گے کہ تمہارے مطابق ابھی تک ہم نے تم سے بچوں والے کام کیوں لیے ہیں تو وہ صرف اس لیے کہ تم کسی بڑے کام کے لیے اچھی طرح سے تیار ہو جاؤ اور ہم بھی تمہاری صلاحیتوں کو پرکھ سکیں۔ میں نے آج تک تمہاری ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو دیکھا ہے اور سمجھتا ہوں کہ تم کسی بھی بڑے مشن پر جانے کے لیے پوری طرح سے فٹ ہو، جسمانی طاقت اور قوت برداشت کے علاوہ وقت پڑنے پر اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کو بردے کار لانا اور فوری طور پر سچ فیصلہ کرنا بھی بہت زیادہ ضروری ہوتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اندر یہ دونوں صلاحیتیں بدرجہا قائم موجود ہیں۔“

”تھینک یوسر مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا۔“ سفیان نے سر کو خم دے کر کرنل احتشام کا شکر یہ ادا کیا۔

”گڈ۔“ کرنل احتشام نے مسکراتے ہوئے کہا پھر باقی سب کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”ذیل بوائز ہماری اطلاع کے مطابق ہندوستان

کی سرحد کے قریب ایک گاؤں میں ایک ایسے کیمپ کا سراغ ملا ہے جہاں غریب کاروں کو ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ وہ بھارتی شہری ہیں اور آسانی کے ساتھ سرحد پار جا اور آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ وہاں ان لوگوں نے اسلحہ بھی خاصی تعداد میں جمع کر رکھا ہے۔ وہاں جو غریب کار پوری طرح تیار ہو جاتے ہیں انہیں پاکستان کے مختلف شہروں میں خریب کاری کے لیے بھیج دیا جاتا ہے آپ لوگوں کا کام انہیں پکڑنا ہے اور کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ سب لوگ زندہ حالت میں گرفتار کر لیے جائیں لیکن یہ ممکن نہ ہو تو انہیں وہیں مارا بھی جا سکتا ہے اسلحہ کا ذخیرہ بھی تباہ نہیں کرنا ہے سب پر قبضہ کرنا ہے۔“

کرنل احتشام کے منہ سے اتنے اہم مشن کے بارے میں سن کر سفیان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اب پہلی مرتبہ ایک اہم مشن پر روانہ کی جانے والی ٹیم میں شامل کیا گیا تھا۔ یہاں سے اسے تنہا جانا تھا اور سرحد کے قدرے فاصلے پر اس کی انجینی کے ایک آفس میں دوسرے ساتھی آؤ کی آمد کے منتظر تھے۔

سفیان نے پنجاب کے شہر بہاولپور تک جہاز سے سفر کیا۔ اس سے آگے ایک تیز رفتار چپ کے ذریعے وہ اپنی انجینی کے آفس میں پہنچ گیا۔

یہاں ایک بار پھر اس کے مشن کے بارے میں اسے بریفنگ دی گئی اور رات کے پچھلے پہر وہ جانے کے لیے پوری طرح سے تیار تھے۔

طاہر جمیل صاحب کمانڈر تھے۔ ان کے علاوہ صفدر ہاشم اور کمال تھے۔ اس گاؤں کے تین جانب کھیت اور ایک جانب گھٹا جنگل تھا ایک لحاظ سے دشمنوں نے اپنے کام کے لیے ایک بہترین اور محفوظ علاقے کو چنا تھا۔

وہ گاؤں سے بہت دور آگئے وہاں کمانڈر طاہر نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور سب پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور سب سے آگے چل دیے۔ ان کے پیچھے صفدر ہاشم اور کمال تھے۔ سب سے آخر میں سفیان تھا۔ وہ اپنی ترتیب کے مطابق ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے قطار کی صورت آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی اصطلاح میں وہ ”حساس علاقے“ میں پہنچ چکے تھے۔

کمانڈر طاہر جمیل بہت تجربے کا رتھے اور انجینی نے بہت سوچ سمجھ کر اس اہم مہم کے لیے ان کو کمانڈر سوئی تھی۔

انہوں نے اندر جانے کے لیے جنگل کا راستا منتخب کیا تھا طاہر جمیل کو ذرا بھی کوئی کھانکایا آہٹ محسوس ہوتی تو وہ ایک دم رک جاتے اور سب کو خاموشی سے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے اور تنہا آگے بڑھتے اور جب ان کی تسلی ہو جاتی کہ سب ٹھیک ہے تو وہ دوبارہ آگے بڑھ جاتے۔ وہ لمحہ یہ لمحہ آگے بڑھ رہے تھے آگے ہمارے ہی ملک میں ہمارے دشمن ملک کے لوگ ہمیں ہی صفحہ ہستی سے مٹانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور وہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے آئے تھے۔

جنگل کا گھنا پن اب کم ہو گیا تھا چاند کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر کہیں کہیں زمین تک آ رہی تھی وہ ہر جانب سے ہوشیار اور خبردار تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارا دشمن رات کے اس پہر مڑے سے چار اوڑھ کر گہری نیند سو رہا ہو یقیناً اگر دگر دانہوں نے پہرہ لگا رکھا ہوگا انہیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمانوں کے چند مکانات تھے یا تو انہیں ختم کر دیا گیا تھا یا پھر ذرا دھماکا کر خاموش کر دیا گیا تھا۔



ان کے چاروں سمت پر ہول سانا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کسی مینڈک کے ٹرٹرائے کی آواز سنائی دیتی۔ یا پھر تیز ہوا کے جھونکے سے درختوں کی ٹہنیوں کے ہلنے کی سرسراہٹیں محسوس ہوتی اور وہ ان سرسراہٹوں پر بھی چونک جاتے اور ان کی تیز نگاہیں تیزی کے ساتھ اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگتیں۔

یہاں پر چند لمبے رک کر طاہر جمیل نے پہلے سے مرتب کردہ پلان کے مطابق انہیں دودھ کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ طاہر جمیل نے صفدر کو اپنے ساتھ رکھا اور کمان اور ہاشم کو سفیان کے ساتھ ملا دیا۔

اس برساتی نالے کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے سرکنڈوں کا طویل سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ یہ نالہ اس وقت بالکل خشک تھا شاید برسات کے دنوں میں پانی کی گزرگاہ بن جاتا ہوگا۔

کمانڈر طاہر جمیل اور صفدر نالے کے اندر اتر گئے اور وہ سرکنڈوں میں پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ طاہر جمیل نے اس علاقے کا نقشہ نگارا اور نارنج کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے لگے۔ پھر باہر آ کر انہوں نے آگے بڑھنے کے لیے سفیان کی اور اپنی سمتوں کا تعین کیا۔ پھر ان کے کندھوں کو مضبوطی سے تھاما اور بھاری لہجے میں اپنے ہاتھوں کا دباؤ ان کے کندھوں پر بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گڈ لک“ اور

صفدر کے ہمراہ اندھیرے کا حصہ بن گئے۔ سفیان بھی کمال اور ہاشم کے ہمراہ اپنے نشانے کی جانب چل دیا۔

یہاں موجود جا بجا قدرتی جھاڑیوں اور سرکنڈوں نے ان کے لیے بہترین اوٹ کا کام کیا اور وہ اس اوٹ کا سہارا لیتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ مستقل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کی عادی سی ہو گئی ہو۔

تھیں۔

اس سناٹے میں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی کسی کی باتوں کی بہت جیسی سی جھنجھناہٹ میرے حساس کانوں کو سنائی دی تو وہ مزید محتاط ہو گیا۔

اور پھر اس کی تیز نگاہوں کی گرفت میں وہ شے آ گئی جس کو دیکھنے کا وہ متحی تھا۔ یہ دائرے کی شکل میں کھڑے کچھ ٹرک تھے اور ان کے نزدیک ہی وہ انسانی ہیولے بھی اسے دکھائی دیے۔

وہ تیزی کے ساتھ زمین کے سینے سے چپک گیا اس کے ساتھ ساتھ اس کے دونوں ساتھی ہاشم اور کمال بھی زمین پر سینے کے بل لیٹ گئے اور کہنیوں کے بل ریٹنگنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر وہ ان خودرو جھاڑیوں کا بہت شکر گزار تھا۔ جنہوں نے ان کے وجود کو مکمل طور پر چھپا لیا تھا۔ وہ ایک بڑی اور گھنی جھاڑی کے قریب بیٹھ گئے۔ یہ جھاڑی اوپر سے گھنی تھی لیکن زمین کے ساتھ اس کی موٹی ٹہنیاں انہیں جو اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھی اور زمین میں اندر پناہ لینے کے لیے خاصی گنجائش تھی۔

یہاں سے سفیان نے کمال کو دوسری جانب روانہ کر دیا اور ہاشم کو ہمیں لیٹ کر ان دونوں افراد کو اپنے نشانے پر لیے رکھنے کا اشارہ کر کے خود آگے بڑھ گیا۔ جائزہ لینے پر اسے اندازہ ہوا کہ یہاں یہ افراد ان ٹرکوں کے پہرے پر موجود ہیں اور ان میں سے ایک آگے چکر لگانے کے لیے چلا جاتا ہے یہ دونوں اشخاص اسلحہ بردار تھے اور پوری طرح سے ہوشیار تھے۔ ان ٹرکوں کے پہرے سے اسے اندازہ ہوا کہ ان میں اسلحہ موجود ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ٹرک آج ہی بھارت سے یہاں پہنچائے گئے ہوں اور ابھی ان کا اسلحہ ان کے گھروالوں میں منتقل نہیں کیا گیا ہو۔

وہ پیٹ اور کہنیوں کے بل ریٹنگنا ہوا اب اس جگہ چار کرک گیا جہاں سے اس نے یہ دیکھا تھا کہ ایک پہرے دار اس جگہ تک آ کر واپس پلٹ جاتا ہے۔

وہ تو قدرت نے اسے سرخ و سفید رنگت سے نواز تھا لیکن اس خصوصی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ہی ہم نے اپنے ہاتھوں اور چروں پر سیاہی پھیر کر اپنا رنگ سیاہ کر لیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندھیرے کا بآسانی حصہ بن سکیں۔

وہ اپنے تمام تر ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھا۔ نہ صرف ہتھیار اضافی ایرویشن اس کے پاس تھا بلکہ خاموشی سے حملہ کر کے دشمن پر قابو پانے کے محفوظ ہتھیار بھی اس کے پاس تھے۔ ایک تیز دھار بہت باریک اور چکیلا انجیر اور بہت باریک رشیم کی مضبوط ڈور بھی اس کے پاس تھی۔

سفیان کو بہت خاموشی کے ساتھ ایک پہرے دار کو اپنے قابو میں کرنا تھا اور اس کے لیے اس نے رشیمی ڈوری کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ شدت سے اس بات کا منتظر تھا کہ وہ پہرے دار جلدی ہے اس کی جانب آئے اور جیسے ہی وہ پلٹنے لگے وہ یہ رشیمی ڈوری اس کے گلے میں ڈال کر اس کو قابو کر لے۔ اس کا کمال تو یہ تھا کہ پہرے دار کوئی بھی آواز نہ لے بغیر ہی انٹائیمل ہو جائے ورنہ اگر اس کی آواز نکل گئی تو وہ مرنے والا ہو جاتا ہو جاتا ہو جائے گا۔

جس وقت وہ اس جگہ پہنچا تھا پہرے دار اپنا چکر مکمل کر کے آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ اس کے اگلے چکر کا منتظر تھا لیکن وہ دہد بخت اپنے ساتھی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی سے سگریٹ لی اور اسے ساگ کر کش لگانے لگا۔ انتظار کی شدت سے سفیان کے اعصاب توڑنے لگے اور وہ سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کے پہرے دار

ہیں۔ اصولاً تو انہیں مسلسل چکر لگاتے رہنا چاہیے لیکن یہ تو ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہیں اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں یہ اطمینان ہوگا کہ یہاں کوئی مانی کا نعل پھینک نہیں سکتا۔ پہرے بھی خانہ پوری کے لیے تھا۔

اس پہرے دار کی سگریٹ ختم ہوئی تو اس نے باقی بچے ٹوٹے کو زمین پر پھینکا اور جوتے سے مسل کر بچھا دیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اس کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر خون انگارے کی طرح دھکتا ہوا سفیان کی رگوں میں دوڑنے لگا اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ اس نے اپنے سارے وجود کی طاقت اپنے ہاتھوں کو دے دی اس کی چپتے کی سی تیز نگاہیں اس متحرک وجود پر چپک گئیں وہ اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے بے قرار تھا۔

اس پہرے دار نے آگے سے گھوم کر اپنا چکر پورا کیا اب سفیان کو اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دھیرے سے رگوں میں ایک انڈین بے ہودہ سا گانا گنگنا تا ہوا بے فکری کی چال چلتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کی گن کندھے پر لٹکی ہوئی تو ضرور ہے لیکن شاید یہ اس کے کندھے پر فالتو کا بوجھ ہی ہے۔

وہ بالکل سفیان کے نزدیک آچکا تھا اس کے اور سفیان کے درمیان صرف ایک جھاڑی تھی۔ سفیان کی نگاہیں زمین پر اٹھتے ہوئے اس کے قدموں پر تھیں اور وہ اس کی پیٹھ موڑتے ہی اس پر چھپنے کے لیے تیار تھا۔ جوں ہی وہ سفیان کے نزدیک سے گزرا۔ سفیان اب اسے لمحہ بھر کی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں الحمد للہ خدا کبر کہا اور ایک ہی جست لگا کر رشیم کی وہ مضبوط اور باریک ڈوری اس کے گلے میں ڈال دی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی

ساری طاقت ڈوری کو اس کی گردن میں کسنے میں صرف کردی اور جیسا کہ اس نے چاہا تھا وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں بنا کوئی آواز نکالے اس کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ سفیان نے ڈوری کو اس کے گلے سے کھینچا اور ایک ہاتھ سے اسے سنبھال کر اپنے کندھے پر لا کر اس جھاڑی میں ڈال دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ زمین پر ڈال دینے کے بعد سفیان نے اس کی نبض دیکھی جو ساکت ہو چکی تھی۔ وہ اب اس کی جانب سے پوری طرح بے فکر ہو گیا۔

سفیان اب دوبارہ زمین پر رہنماتا ہوا اس جانب گیا جہاں کمال نے اس دوسرے پہرے دار کو نشانے پر لیے رکھا تھا۔ سفیان نے اس کے قریب پہنچ کر انگوٹھے سے کامیابی کا اشارہ کیا تو وہ دوسرے پہرے دار کے لیے لقمہ اجل بن گیا۔

تب ہی کمانڈر طاہر جمیل کا پیغام موصول ہوا کہ اسلحہ سے بھرے ٹرکوں کو فوری طور پر تباہ کرنا ہے۔ سفیان کے لیے کمانڈر کے حکم کی اطاعت فرض تھی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس طرح کرنے سے تو دشمن مزید ہوشیار ہو جائے گا تو ہم انہیں زندہ گرفتار کس طرح سے کریں گے تب ہی دوسرا پیغام موصول ہوا کہ دشمن کا جو بھی بندہ سامنے آئے اسے اڑا دینا ہے۔ جو میرے کچھ فرار ہونے کی کوشش کریں گے تو موقع دیکھ کر کام کیا جائے۔

سفیان نے کمال کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام شروع کرے۔ وہ اسلحہ سنبھال کر پوزیشن لیے چونکا بیٹھا تھا۔ تقریباً تین چار منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اس نے اسلحہ اور بارود سے بھرے ان ٹرکوں پر مخصوص مقامات پر ڈیوٹی لگا دیے تھے۔ طاہر جمیل کو اس

نے رپورٹ دی تو منبج آیا کہ جیسے ہی ان کی جانب سے گرین لائٹ روشن ہوگی ہمیں لیور دبا دینا ہے۔ کام مکمل ہونے کے بعد وہ وہاں بچھائے گئے تار زمین پر بکھیرتے ہوئے دور بٹتے جا رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم کہ طاہر صاحب نے اسلحہ کے اس بہت بڑے ذخیرے کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔ شاید انہیں دوسری جانب سے ایسا ہی کہا گیا تھا۔

وہ اس مقام سے کافی دور پیٹ اور کہنیوں کے بل لیٹ گئے ہوئے پہنچ گئے تھے۔ پھر ایک محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد وہ جھاڑیوں میں رک گئے اور تب ہی سفیان کی کلائی پر بندھی ٹراسمیٹر میں گرین لائٹ آن ہوئی تو اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ”ڈاؤن۔“ اس کا ہاتھ تیزی سے لیور کو دباتے ہوئے نیچے ہوا اور فضا زوردار دھماکوں سے گونجنے لگی۔ اس سیاہ اور تاریک رات میں ایبوشن پھٹنے اور دھماکوں کے ساتھ تیز روشنی کی چمک پیدا ہوئی۔

سفیان اس روشنی اور دھماکوں کو دل کی تمام تر مسرتوں کے ساتھ دیکھ اور سن رہا تھا تب ہی ان کے پیچھے طاہر جمیل اور صفدر بھی پہنچ گئے۔ بھارتیوں میں شدید افراتفری مچ گئی ہوگی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ اچانک یہ سب کیا اور کیسے ہو گیا۔

”جوانو! اب ہمیں آگے جانا ہے ہمیں ان کا جو بندہ بھی راستے میں ملے اسے راستے سے ہٹانا ہے۔ ابھی تو خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ ”یہاں سے بائیں جانب ایک بڑی چار دیواری ہے یہ ان کا ہیڈ کوارٹر ہے اور یہیں پر ان کے اسلحہ کے گودام بھی ہیں۔ ہمیں انہیں بھی اس طرح تباہ کرنا ہے۔ ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے کوئی

فاسٹ گوبوژیشن پہلے جیسی رہے گی آپ کو اپنی ذمہ داری کا معلوم ہے۔“ کمانڈر طاہر جمیل نے کہا اور آگے بڑھ گئے سفیان بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ دھماکے اب بھی ہونے لگے تھے فضا میں جیسے ہی تیز روشنی ہوتی تو سارا منظر روشن ہو جاتا اور ایسی روشنی میں ہی انہوں نے اس چار دیواری کو بھی دیکھ لیا۔ وہ تیزی کے ساتھ تقریباً کروغ کے بل جھکے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ پانچوں ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے انہیں اپنے اپنے کاموں کے بارے میں معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے وہ چمکی ہوئی پوزیشن میں تیزی سے بغیر آواز پیدا کیے چل رہا تھا۔ اچانک جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے ایک سائے کو تیزی سے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تو سفیان نے اپنی گن پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر لی۔

وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس کے نزدیک رک گیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا۔ ”شکر کچھ معلوم ہوا کہ کیا ہوا ہے تم تو ادھر ہی پہرے پر تھے نا؟“

اور اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور تاریکی پر روشنی غالب آ گئی اس کی نگاہ سفیان کی جانب اٹھی اور اس کا منہ کھل گیا اس نے اس کی آنکھوں میں خوف کی برجھائیاں دیکھ لیں۔ اس نے ہندو کی نال اس کے کھلے منہ میں ہسیر دی اور ٹریگر دبا دیا وہ مردہ چوہے کی مانند پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا اور وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ اندر آئے تو یہاں بہت سے خیمے دکھائی دیے جن میں لوگ سوئے ہوئے تھے دھماکوں کی آوازیں سن کر وہ دیوانہ وار اٹھ کر باہر آئے اور ان کی گولیوں کا

نشانہ بن گئے۔

کمانڈر کا حکم تھا کہ اب انہیں تیزی کے ساتھ یہاں سے پیچھے ہٹنا ہے۔ سو وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ مزید آگے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ سب اب پوری طرح بے دار اور لرٹ تھے اور جان چکے تھے کہ ان کی بے خبری میں ان پر شب خون مارا گیا ہے۔

وہ سب تیزی سے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ واپسی کا یہ سفر بھی ان کے لیے سہل نہیں تھا اور ان کی زندگیوں کے لیے خطرہ تھا۔ پہلے وہ لوگ بے خبر تھے لیکن اب اس علاقے میں چپے چپے میں ان کے افراد پھیل چکے تھے۔ ہو سکتا ہے جنگل میں بھی ان کے ساتھی موجود ہوں۔

وہ سب جنگل میں ایک دوسرے سے آن ملے تھے اور بہت احتیاط کے ساتھ واپس جا رہے تھے اچانک ہی کمانڈر طاہر چونک کر رک گئے اور انہوں نے انہیں بھی رک جانے کا اشارہ کیا پھر وہ تیزی کے ساتھ زمین پر لیٹ گئے اور ہاتھ کو تیزی کے ساتھ نیچے کر کے انہیں بھی لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔

کمانڈر طاہر نے اپنا کان زمین پر لگا دیا۔ سفیان نے بھی زمین سے اپنا کان لگا دیا۔ زمین کے ارتعاش سے انہیں اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کے قدموں کی دھک سامنے کی جانب سے آرہی ہے۔ اس کا یقیناً یہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ بہت سے لوگ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔

سفیان کے اندازے کے مطابق ان لوگوں نے انہیں چاروں جانب سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ کیوں کہ قدموں کی آہٹ کی چاریوں جانب سے اپنے نزدیک آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اب ان کی ساری توقعات اپنے رب کی ذات اور



رات کے اس اندھیرے سے تھی اور یہی دونوں انہیں دشمنوں کے اس گھیرے سے زندہ سلامت یہاں سے نکال سکتے تھے۔

کمانڈر طاہر جو سب سے زیادہ زیرک اور معاملہ فہم تھے اور ہر وقت ان کی قوت فیصلہ بھی بہت مضبوط تھی انہوں نے ایک بار پھر زمین سے کان لگا کر کچھ اندازے لگائے اور کھڑے ہو کر اپنی کلائی پر بندھے قطب نما میں راستہ دیکھا پھر ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ بہت الٹ اور محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس سمت میں چلتے ہوئے وہ اپنے مقام سے کافی دور چلے گئے تھے یعنی سیدھے راستے پر چلتے ہوئے ان کا جو راستہ ایک ڈیڑھ فرلانگ کا تھا اس سمت سے واپسی میں تقریباً ڈھائی میل کا ہو گیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اگر انہیں اپنی جانیں سلامتی کے ساتھ واپس لے جانا تھیں تو یہ دو ڈھائی میل کا فاصلہ ہے ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جھکی ہوئی پوزیشن میں احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس طرح کہ چلنے سے ان کے قدموں کی دھمک پیدا نہ ہو۔

اچانک ہی زمین نے جیسے ان کے قدم جکڑ لیے فضا میں ایک دم روشنی کا طوفان سا آ گیا جس سے نہ صرف آسمان بلکہ ارد گرد کی ساری فضا روشن ہو گئی۔ دشمن بھی کم چالاک نہیں تھا اس نے ہماری تلاش میں ناکام ہو کر فضا میں روشنی پیدا کرنے والے گولے فائر کرنے شروع کر دیے۔

ان ہی روشنی میں اللہ پاک نے انہیں بھی راستہ سوچھا دیا۔ تب ہی انہیں اپنے نزدیک کھائیاں دکھائی دیں اور کمانڈر طاہر کے اشارے پر سب نے ان کھائیوں میں چھلانگ لگا دی۔ جنگلوں میں ایسے

چھوٹے چھوٹے خشک ندی تالے جھاڑیاں اور کھائیاں ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھیں۔ جو ایسے ہی کسی مشکل وقت میں ان کے کام آ جاتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے وہ ابھی تک ان لوگوں کی نگاہ میں نہیں آئے تھے۔ ان کی جانب سے پھینکے گئے روشنی پیدا کرنے والے یہ گولے ان کے ہی کام آ گئے اور ان کی نگاہ میں نہ آ سکے۔ انہوں نے ان کھائیوں ہی کو اپنا مورچہ بنالیا اور الٹ ہو گئے۔ ان کا تعاقب کرنے والے ان کے قریب سے قریب آتے جا رہے تھے اور ان کھائیوں میں وہ ان کے قدموں کی دھمک بہت اچھی طرح سے محسوس کر رہے تھے۔

سفیان کو دائیں جانب سے دشمن کے آدمیوں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ لیکن ان میں ابھی تک ایک بندہ بھی اس کے نشانے پر نہیں آیا تھا۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

لیکن وہ ان کی ریشم میں آئے بنا دور ہی سے آگے نکل گئے۔ تب سفیان نے مکھ کا سانس لیا۔ سفیان کے ساتھ ہاشم اور کمال تھے جبکہ صفدر اور کمانڈر طاہر کسی دوسری کھائی میں تھے۔

”سفیان دشمن یہاں سے آگے نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے ورنہ آگے کا سفر جاری رکھنا چاہیے۔“ ہاشم نے سرگوشی میں کہا۔

”ٹھیک ہے آ جاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔“ میں نے کہا اور وہ اس کھائی سے باہر نکل آئے۔ پیچھے سے ہمیں ہلکی فائرنگ کی آواز بھی آ رہی تھی۔ غالباً وہ لوگ اندازے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر فائرنگ کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں شاید انہیں اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا ہوگا۔ اب انہوں نے بھاگنے کی رفتار اپنی تفریباً

ایک فرلانگ بھاگنے کے بعد انہیں رک جانا پڑا۔ وہ ابھی تک دشمنوں کے زرخے میں تھے۔ رک جانے کی وجہ یہ تھی کہ اچانک فضا میں روشنی کا ایک اور گولہ داغا گیا تھا۔ ساری فضا پھر منور ہو گئی۔ وہ نور از زمین پر لیٹ گئے۔

سفیان نے لیٹے لیٹے سرگھما کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو ایک بار پھر اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی اس سے بمشکل بیس گز کے فاصلے پر ایک جگر سے ایک بندو کی ٹال جھانکتی ہوئی دکھائی دی۔

سفیان نے کہنیوں کے بل پیچھے بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بھی مود کرنے کا حکم دیا۔ وہ اب ہاشم تو پہلے ہٹ رہے تھے لیکن کمال پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

اس نے گردن موڑ کر سفیان کی جانب دیکھا اسے اس کی آنکھوں میں بجلیاں ہی کووندی ہوئی دکھائی دیں۔

”سوری فیضان میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا اور پھر گردن سیدھی کر لی۔

اس کے لیے میں ایسا نچا کر کیا چھپا تھا کہ سفیان کو اپنی ربڑھ کی ہڈی میں ایک سردی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ کھینچا گویا یہ اشارہ تھا کہ فوراً پیچھے ہو جاؤ۔ لیکن اس نے ایک بار پھر اٹل لہجے میں کہا۔

”تم دونوں آگے جاؤ میں یہیں رک کر تمہارے زندہ سلامت نکل جانے کے لیے موجود رہوں گا۔“

”تم ایسا کیسے۔۔۔۔۔!“ سفیان صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ ”اللہ حافظ دوست فی امان اللہ۔“ اس نے کہا اور ریختے ہوئے آگے بڑھتے لگا اور جلد ہی اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

سفیان کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا رواں رواں مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا ایک جوان موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ وہ ان کی جانوں کو بچانے کے لیے خود موت کے منہ میں جا رہا تھا اور وہ اسے آواز دے کر روک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ تب ہی اس نے کمال کو اس بنکر کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ کمال نے ایک بار گردن موڑ کر سفیان کی جانب دیکھا اور ہینڈ گرنیڈ کی پین کھینچ کر نکالی اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے ہینڈ گرنیڈ کو بنکر کی جانب اچھال دیا۔

اور پھر اچانک ہی اطراف میں ٹپ ٹپ اور بنکرز سے شعلے اٹکنا شروع ہو گئے اور کمال کے جسم کے پرچے فضا میں منتشر ہو گئے۔

ایسے میں اسے کچھ اندیشہ سو جا تو اس نے بھی دیوانہ وار گر بیٹھ کر بنکرز کی جانب اچھالنے شروع کر دیے۔ ہاشم کی گن بھی شعلے اٹک رہی تھی اور پھر ایک پورا برسٹ ہاشم کے سینے پر آ کر لگا اس نے خطرے کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا اور تیزی سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

اسے اپنے عقب میں اب بھی فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے گرامنگ کرتا ہوا دور بہت دور ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ اپنے قطب نما میں راستہ دیکھ لیتا اب وہ خطرے کی حدود سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے سیدھے ہو کر چلنا شروع کر دیا تھا۔

سفیان بڑے بوجھل قدموں اور دکھی دل کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ اسے اپنے زندہ سلامت واپس لوٹ جانے کی کوئی خوشی نہیں تھی بلکہ ایک عجیب طرح کی شرمندگی نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے جام

شہادت نوش کیا تھا۔ زندگی میں بعض مرتبہ ایسے موقع بھی آ جاتے ہیں کہ جب ہمیں اپنے زندہ رہ جانے پر افسوس ہوتا ہے اور ہم اپنے ساتھیوں کی موت پر نعرہ تحسین بلند کرتے ہیں اور ان کے لواحقین کو مبارکباد دے رہے ہوتے ہیں۔

وہ بھی اس وقت کچھ ایسے ہی جذبات و احساسات کا شکار تھا۔ اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے لیکن زبان پر سورۃ الفاتحہ جاری تھی۔ وہ اپنے شہید ساتھیوں کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوا تنہا جا رہا تھا کمائنڈر طاہر اور صدر کا اسے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا وہ بھی زندہ ہیں یا انہوں نے بھی اپنا مقصد حیات پایا ہے۔

وہ جب واپس پہنچا تو کمائنڈر طاہر اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ صدر بھی کام آ گیا تھا مشن میں۔ صرف سفیان اور کمائنڈر طاہر ہی بچے تھے۔ کرنل صاحب اور کمائنڈر طاہر نے سفیان کو تنہا دیکھا تو سمجھ گئے کہ وہ تنہا کیوں ہے۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اس کے کندھے پر آ کر ہاتھ رکھا اور بھاری لہجے میں بولے۔

”ویل ڈن سفیان۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور چھلک پڑنے کو بے تاب تھیں۔ کرنل صاحب نے جب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو بولے۔

”نو۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ جوان! انہیں چھلکنے مت دینا۔۔۔۔۔ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں آنسو تو کسی کی موت پر بہائے جاتے ہیں۔ وہ خوش نصیب تھے کہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ تو سفیان نے اپنے آنسو اپنے حلق کے اندر اتار دیے۔

تھوڑی دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی تو سب نماز کی ادائیگی کے لیے جماعت کے ساتھ کھڑے

ہو گئے نماز کے بعد شہید جوانوں کے لیے دعا کرائی۔ دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہو کر سفیان نے اپنی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر واپس آ گیا۔

یہاں ہیڈ کوارٹر میں اس کے دوسرے ساتھی شدت سے اس کے اس نے مشن کی روداد سننے کے منتظر تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک ایک بات بڑی سچائی کے ساتھ بتائی خاص طور پر ہاشم کی قربانی اور جاں نثاری کا ذکر کرتے ہوئے بہت ضبط کے باوجود اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

چند دنوں بعد اس کے پاس ہاشم کی والدہ کا فون آیا وہ ہاشم کے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ ان کے بیٹے نے کہاں کہاں زخم کھائے اسے کتنی گولیاں لگیں وہ کس طرح شہید ہوا۔

ہاشم کی والدہ کا صبر و ضبط دیکھ کر وہ خیران رہ گیا انہیں یہ جان کر بہت اطمینان حاصل ہوا کہ ان کے بہادر بیٹے نے دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور اپنے وطن کی حرمت پر قربان ہو گیا۔

ان دنوں وہ بہت پرشمرہ سا رہتا تھا۔ ہاشم اور کمال کو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھول پایا۔ اسے بار بار یاد آیا کہ انہوں نے کیسے اپنی جائیں قربان کر دیں اور وہ۔۔۔۔۔ وہ کیسے بزدلوں کی طرح اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ آیا۔ ہاشم نے شہید ہو کر اسے جینے کی راہ دکھا دی تھی۔

آج اس کا عزم اور ولولہ تازہ تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ کرنل احتشام کے روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆

وہ دن بھی میری زندگی کے بہت خاص الخاص دنوں میں شامل ہیں بھی بھی نا بھلانے والے۔ میں دن رات ٹینشن کا شکار رہا کرتی تھی۔ پہلے سرمی ای تھیں تو ایک دکھ بھی میرا چہچہا نہیں چھوڑتا تھا کہ

آخر میرا باپ کون ہے میں اور امی تنہا کیوں ہیں۔ میرا ننھیال اور میرا دوھیال کہاں ہے۔ چچا ماسوں خالہ پھوپھو دادی نانی کوئی بھی کیوں نہیں ہے۔ امی نے بھی کبھی اس بات کا کوئی واضح جواب نہیں دیا اور پھر امی کی سخت بدایات کی وجہ سے میں یونیورسٹی میں حشام سے بہت لیے دیے رہتی تھی لیکن میرا دکھا سوکھا رویہ بھی اسے مجھ سے دور نہ کر سکا اور لاخود کو روکنے کے میں نجانے کب اس کی محبت میں پور پور ڈوب گئی۔ لیکن اپنے رویے سے کبھی اس کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ عشق کی آگ میں وہ تنہا نہیں مجلس رہا میں بھی ٹیلی فون کی مانند سلگ رہی ہوں۔ وہ ایک بہترین اور مخلص دوست کی مانند ہمیشہ میرے ساتھ رہا اور پھر ایک دن تلاش کرتے کرتے میں نے اپنے باپ کو پہچان لیا۔ میری وہ ماں جنہوں نے مجھے پالا تھا اس دنیا سے چلی گئیں اور جاتے جاتے مجھے اصل حقیقت سے بھی روشناس کر گئیں۔ پھر ایک اتفاقی حادثے نے مجھے میری حقیقی ماں سے بھی ملوایا اور یہ کام حشام نے کیا اور پھر جب حشام نے کھل کر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو میں خود کو تدرک کی ہم نے ایک دوسرے کے دلوں کے راز جان لیے تھے اور جب ہمارا ملن ہونے میں تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا تو یہ مسئلہ ہو گیا مجھے حشام کے لیے اپنے دل میں ملنے والے جذلوں کا اندازہ بہتر طور پر اب ہوا تھا۔ جب حشام کی زندگی خطرے میں گھری تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر حشام نہیں رہا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ لیکن اللہ کا کریم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے نئی زندگی عطا کر دی۔

بظاہر بستر علالت پر لیٹا ہوا حشام ہمیں اس سارے ہنگامے سے بے خبر محسوس ہوتا تھا لیکن میں نے چند باتوں سے اندازہ لگایا کہ ایسا بالکل بھی نہیں

بظاہر بستر علالت پر لیٹا ہوا حشام ہمیں اس سارے ہنگامے سے بے خبر محسوس ہوتا تھا لیکن میں نے چند باتوں سے اندازہ لگایا کہ ایسا بالکل بھی نہیں

ہے جیسا ہم سمجھ رہے ہیں اسے اپنے ارد گرد موجود تمام خطرات کا اچھی طرح اندازہ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا اہم کام کر رہا تھا اور وہ لوگ جن کے خلاف اس کے ہاتھ میں سارے ثبوت تھے اور وہ ثبوت بھی ایسے جو اگر منظر عام پر آ گئے تو اس اہم مجرم کو سیدھے تختہ دار تک لے جائیں گے تو وہ شخص اتنی آسانی سے یہ سب کیسے ہونے دے سکتا ہے۔ وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ اسے باقاعدہ ایک پلاننگ کے تحت اس جگہ بھیجا گیا اور ٹارگنڈ ہٹ کیا گیا ہے اور پھر اس کی اتنی سخت سیکورٹی کا انتظام اور پھر اس رات اسپتال میں ہونے والی فائرنگ جس کے بارے میں اسے یہ بتایا گیا کہ وہ ڈاکوؤں نے اپنے ایک دشمنی ساتھی کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کی تھی محض اسے بہلانے کے لیے ایک کہانی تھی۔

یہ سب باتیں جانتے ہوئے بھی میں جان بوجھ کر اس سے چشم پوشی کر رہی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ صحت یاب ہونے کے بعد بھی حشام خوف زدہ ہو کر اپنے کام سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو جائے گا۔ موت کی دہلیز چھو کر واپس آنے کے بعد تو اسے اپنے رب کی رحمتوں کا یقین مزید پختہ ہو جائے گا اور اس کے اندر نیا جوش اور ولولہ جنم لے گا۔

بہر حال اب ماشاء اللہ حشام تیزی کے ساتھ صحت یاب ہو رہا تھا۔ امی بھی ایک مرتبہ برقع اور حجاب پہن کر حشام سے ملنے کے لیے گئی تھیں۔ وہ پہلے سے کافی کمزور تو ہو گیا تھا لیکن اپنی اس جسمانی کمزوری کو ہنس ہنس کر خود ہی مذاق کا نشانہ بناتا رہا۔

میں پابندی سے اسے اسپتال ملنے جاتی رہی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک آتی تھی وہ کسی سے بھی چھپی نہیں رہتی تھی۔ ڈاکٹر زیشان تو باقاعدہ



مجھے حشام کے سامنے چھیڑتے اور کہتے۔

”بھئی ہم تو نام کے ڈاکٹر ہیں حشام کی اصل ڈاکٹر تو مس سرمی ہیں جو انہیں تیزی سے صحت یاب کر رہی ہیں۔“ اور جواب میں حشام بیچارہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ میری سانسوں کی ڈور تو سرمی کی سانسوں کے ساتھ بندھی ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ یہ میرا چارجر ہے۔“

اور میں شرم سے سرخ ہو جاتی۔ بستر پر بھی اس کا رومانس ختم نہیں ہوتا تھا کبھی کبھی مجھے اس بات پر فخر ہوتا تھا کہ اللہ نے صرف ایک باپ کی محبت مجھ سے چھینی تھی اس کے علاوہ مجھے کتنے اور خلص لوگوں کی محبتیں عطا کر دیں اور سب سے زیادہ حشام مجھے پیار کرتا ہے۔

کرنل مشتاق اپنے کام میں مصروف تھے وہ اور ان کی انجینی کے جوان حشام کی مرتب کردہ رپورٹ کی روشنی میں بہت سے لوگوں پر کام کر رہے تھے۔

کرنل مشتاق نے ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر اپنی انجینی کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے قطعی نہیں ہے اللہ جانے ان کے ”پانی کمان“ کے ساتھ کیسے تعلقات تھے وہ ملک دشمن عناصر کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور ان کا قلع قمع کر رہے تھے۔ کیونکہ یہاں تو یہی ہوتا آیا ہے کہ حکومت میں شامل لوگ بڑے بڑے پولیس مین یا بیوروکریٹ کتنے ہی اونچے پیمانے پر کرپشن کر لیں پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ حکومت اور عوام کو ان لوگوں نے اپنے گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے اور جس کا جوجی چاہ رہا ہے وہ وہی کھیل کھیل رہا ہے۔

شمرز بھائی نے بھی کافی دنوں سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں مصروف تھے۔ میری

شدید خواہش تھی کہ کرنل مشتاق شمرز بھائی کو بھی اپنی اس خفیہ انجینی میں شامل کر لیں اور انہیں بھی کمانڈو ٹریننگ دیں لیکن ابھی تک نیو کرنل مشتاق نے اس سلسلے میں مجھے کوئی مثبت جواب دیا تھا اور نای شمرز بھائی نے کوئی رابطہ کیا تھا۔

اس روز جب میں حشام سے ملنے اسپتال گئی تو میں نے حشام کو بیڈ سے اٹھ کر کمرے میں چھل قدمی کرتی ہوئے دیکھا۔

یہ میرے لیے بہت بڑی خوشی کا مقام تھا۔ حشام کے زخم اب کافی بہتر تھے۔ ٹانگے خشک ہو چکے تھے اور ڈاکٹر نے انہیں بیڈ سے اٹھ کر روم میں تھوڑا بہت چلنے کے لیے کہا تھا۔

تھوڑا سا چلنے کے بعد ہی حشام کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور اسے پسینہ آ گیا تو میں نے اسے سہارا دے کر بیڈ پر بٹھادیا۔ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو کیا ہوا تھا میں جب اپنا بازو لٹکانے لگی تو اس نے میز پر ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

”ارے ہاں تھوڑی دیر تو اپنے میچا ہاتھوں کو رہنے دو تمہیں نہیں پتا مجھے کتنی انرجی مل رہی ہے ہائے.....“ اس نے ایک سکون بخش سانس اپنے اندر اتارتے ہوئے مطمئن انداز میں آنکھیں موند لیں۔

”باز آ جاؤ حشام میرا ہاتھ چھوؤ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”کیا کہے گا؟“ اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ میں نے جھینپ کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

”ایک بات کہوں جان حشام۔“ وہ جب بہت پیار سے مجھے پکارتا تو بجائے میرا نام لینے کے مجھے جان حشام کہتا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی

جانب دیکھا۔

”بھئی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم واقعی مجھ سے اتنا پیار کرنے لگی ہو ورنہ پہلے تو جب بھی میں کوئی ذو معنی بات کہتا تھا تو تم میرا منہ توڑنے پر رات آتی تھیں تم وہ سب ڈرامہ کرتی تھیں نا میں تمہیں پسند تو تھا نا.....!“ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ کو میری کمر کے گرد کر کے اپنے قریب کیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو میں سنجیدہ ہو گئی اور اس کے سینے سے سر کو دھیرے سے نکال کر کہا۔

”میں تم سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی حشام بات اصل میں یہی تھی کہ میری امی نے مجھے شروع ہی سے لڑکوں سے دور رکھا وہ دن رات میرے دل میں ایک ہی بات بٹھاتی رہتی تھیں کہ مرد کی محبت کا بھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک عورت کے لیے سب سے بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ مرد عورت سے محبت نہیں کرتا۔ محض ہوس کا پیجاری ہوتا ہے اور اپنی اس ہوس کو وہ محبت کا نام دے کر بھولی بھولی عورت سے اس کا سب کچھ چھین لیتا ہے۔

جب میں یونیورسٹی میں آئی تو مجھے ہلڑکے کی نگاہ ایسی ہی غلط محسوس ہوئی تھی۔ پھر تم نے میری جانب دوئی کا ہاتھ بڑھایا اس وعدے کے ساتھ کہ تم مجھ سے کوئی اور ڈیمانہ نہیں کرو گے لیکن پتا نہیں حشام کب اور کسے تم نے میرے دل و دماغ پر ناقضہ جمالیا۔ میں کیا کرتی میں لاٹھ اپنے دل میں پلنے والے اس جذبے کو خوب سے جھٹلاتی رہتی لیکن میں جتنا اس کو جھٹلاتی رہ اور شدتوں کے ساتھ مجھے تنگ کرتا اور پھر جب تم نے کھل کر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو میں بھی برف کی مانند پھلتی چلی گئی۔ محبت وہ منہ زور جذبہ ہے کہ اس کے آگے لاٹھ بند باندھ لو یہ سب کچھ توڑ کر اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کو بہا کر لے جاتا

ہے۔“ بات کرتے کرتے میری آنکھیں بھر آئیں اور میرا لہجہ آنسوؤں میں بھگ گیا۔ میں نے حشام کے سینے سے سر اٹھایا تو اس نے کہا۔

”یہی وجہ ہے جان حشام کہ موت بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں ناکام رہی۔“

”اللہ تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔“ میں نے محبت سے چورنگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے لگا پھر میں نے اسے بیڈ پر لیٹا دیا۔

”مجھے تم سے بہت ساری ضروری باتیں کرنی ہیں سرمی! لیکن ایک بات کا مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے ساتھ غلط بیانی سے کام نہیں لوگی۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”کون سی ضروری باتیں؟“ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

”ابھی نہیں دو چار دن کے بعد..... کیا تم ایک رات کے لیے میرے پاس اسپتال میں رک سکتی ہو۔“ اس نے کہا۔

”رات میں..... لیکن کیوں؟ تم وہ باتیں ابھی کر لو نا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ میں کیوں ڈروں گی۔ پتا نہیں ڈاکٹر ذیشان مجھے اس بات کی اجازت بھی دیں گے یا نہیں۔“ میں نے نابل لہجے میں کہا۔

”ان کی تم فکر نہ کرو ان سے میں بات کر لوں گا۔ بس تم وعدہ کرو ضرور آؤ گی۔“ اس نے میرا ہاتھ تمام کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے جب تم کہو گے آ جاؤں گی اب خوش۔“ میں نے اسے بہلانے کے لیے کہا۔

”تھینک یو۔“ اس نے نمون نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”اچھا یہ بتاؤ تم نے میڈیسن لے لیں۔“ میں نے موضوع پلٹ کر کہا۔

”ہاں ٹینٹس تو زیادہ نہیں ہیں البتہ انجکشن کئی گتے ہیں اور اب تو اتنے سارے موزاں ہو چکے ہیں کہ.....!“

”اچھا اچھا بس اب مزید آگے کچھ نہ بولو۔“ میں نے ہنسنے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔ میں نے ٹیٹس نگاہوں سے اس کے چہرے کی ہزاروں بلا میں لے ڈالیں ماشاء اللہ وہ کافی فریش لگ رہا تھا۔

اسپتال سے آنے کے بعد میں نے طلال انکل کو فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا کہ آج رات آ جاؤ ہم ڈنر ساتھ کریں گے۔ تمہاری آتنی بھی تمہیں یاد کر رہی ہیں اور ہاں کرٹل مشتاق بھی آرہے ہیں۔ شاید انہیں کوئی نئی انفارمیشن ملی ہے کرٹل مشتاق کا سن کر میں بے تاب ہو گئی۔

رات کو آٹھ بجے میں آصف کے ہمراہ طلال انکل کے گھر پہنچ گئی۔ تھوڑا ناٹم آنٹی کے ساتھ گزارا پھر سب نے ایک ساتھ ڈنر کیا اور پھر ہم سب اوپر طلال انکل کے اسٹڈی روم میں پہنچ گئے۔

”ہاں یار باب بتاؤ تمہارے پاس کیا کیا انفارمیشن ہیں۔“ طلال انکل نے پوچھا۔

”سرمی وہ تمہارا منہ بولا بھائی کیا نام تھا اس کا..... ہاں شہروز کہاں غائب ہے۔ کافی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تم اس کے بارے میں کہہ رہی تھیں نا کہ میں اسے اپنے ساتھ شامل کر لوں اور کمانڈ ورننگ دوں۔“ کرٹل مشتاق نے طلال انکل کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ ”جی کرٹل صاحب میں ان ہی کے بارے میں

آپ سے کہہ رہی تھی لیکن کافی دن ہو گئے ان کا کوئی فون نہیں آیا۔ میں نے ایک آدھ بار رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تو فون نہیں مل سکا۔ ویسا آپ کو اچانک ان کا خیال کیسے آیا۔ انکل تو آپ سے کوئی اور بات پوچھ رہے تھے۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

میرا سوال سن کر کرٹل مشتاق خاموش ہو گئے چند لمحے خاموش نگاہوں سے مجھے نکتے رہے اور پھر کرٹل مشتاق ہی بولتے رہے اور طلال انکل حیرت سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے میرا دل ان باتوں پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یقین کرنا پڑا کیونکہ وہ پورے ٹھوس ثبوت کے ساتھ اپنی بات بیان کر رہے تھے۔ پھر مجھے بہت زور کا چکر آ گیا اور میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بظاہر بہت زیادہ اخلاص کا مظاہرہ کرنے والے لوگ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے نفرت کی ایک شدید لہر اٹھنے لگی۔

☆.....☆

پتا نہیں میں کتنی دیر ہوش و حواس سے بے گانہ رہا پھر رفتہ رفتہ مجھے ہوش آنے لگا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں دبیز پادلوں کے درمیان تیر رہا ہوں۔ ہر جانب دھند چھائی ہوئی ہے اور اس دھند میں ڈوب کر ابھر رہا ہوں۔ کافی دیر تک ایسی ہی حالت رہی۔ پھر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میرے چاروں جانب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے اپنا سر بہت بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے ہر جانب اندھیرا کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ سر میں شدید میس اٹھی تو میرا ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کے پچھلے حصے کی جانب چلا گیا تو مجھے اپنے ہاتھ پر خون کی چچیا ہٹ محسوس ہوئی اور تب میں پوری طرح ہوش میں آ گیا اور مجھے

سب کچھ یاد آ گیا کہ میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔ دروازہ دلارے نے کھولا تھا لیکن جیسے میں چند قدم آگے بڑھا میرے اوپر پیچھے سے کسی نے حملہ کیا اور کوئی آہنی شے میرے سر پر ماری اور میں اس شدید ضرب کی وجہ سے چکراتا ہوا نیچے گر گیا۔ نیچے گرنے سے قبل میں نے مڑ کر حملہ آور کو دیکھنا چاہا اور کچھ بھر کو دیکھ بھی لیا۔ وہ درلوگ تھے پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

وہ کون لوگ تھے میں نے حیرانی سے سوچا اور دلارے.....؟ وہ یقیناً دلارے کے ساتھی تھے۔ دلارے پر مجھے پہلے ہی شک تھا میں لیٹا ہوا یہی باتیں سوچ رہا تھا اچانک ایک خیال میرے دل میں آیا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ کہیں ان لوگوں نے مجھے اغوا تو نہیں کر لیا یہ سوچ کر میں نے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بڑی زور کا چکرا آیا اور میں اٹھ نہ سکا۔ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا اور اپنے ارد گرد کا حوالہ دیکھنے سے قاصر تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے ٹول کر دیکھا تو اپنے آپ کو کینے فرش پر پایا پھر تھوڑی ہمت کرنے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اندھوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب پھیلاتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔

ایک ایک میرا گھٹنا کڑی کی میز سے ٹکرایا تو میں نے جھک کر مزید ادھر ادھر ہاتھ مارا تب میرا ہاتھ صوفے سے ٹکرایا اس کے ساتھ ہی ایک خوش گوار احساس ہوا کہ میں اغوا نہیں ہوا اور اپنے ہی گھر میں ہوں۔ پھر اندازے سے میں اس دیوار کی جانب گھوما جہاں سوچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ سوچ بورڈ سے ٹکرایا تو میں نے سارے ٹیٹن پیش کر دیے اور سارا منظر روشن ہو گیا۔

حقیقت میں میں اپنے ہی فلیٹ کے ڈرائنگ روم کے فرش پر پڑا ہوا تھا مجھے دلارے کا خیال آیا تو

میں نے اسے دو ٹیٹن آوازیں دیں مگر اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر میں نے سارے فلیٹ کی لائٹس آن کیں اسے ہر جگہ دیکھا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینک کی مانند غائب تھا۔

باہر جانے والے دروازے کو میں نے دیکھا دروازہ لاک تھا اور چابی دروازے کے سامنے پڑی تھی۔ اسے یقیناً باہر سے دروازہ لاک کرنے کے بعد دروازہ کے نیچے سے اندر سر کا دیا گیا تھا۔

میں نے وال کلاک میں ٹائم دیکھا صبح کے تین بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ میں کئی گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اپنی کیفیت سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ میں صرف سر کی چوٹ کی وجہ سے اتنی گہری بے ہوشی کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے بعد میں بے ہوشی کی دوا یعنی کلوروفام سنگھا کرے ہوش کیا گیا تھا۔

میں نے چابی اٹھائی اور دروازے کی اندر سے کھڑی بھی لگا دی اور اپنے بیڈ روم میں آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہاں وہ شاپر بھی پڑا ہوا تھا جو میں اپنے ساتھ نواب کی کوٹھی سے لایا تھا۔ جس میں صرف میرے پہننے کے کپڑے اور ضرورت کی اور دوسری اشیاء تھیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف میرے بیڈ روم کی اچھی طرح سے تلاشی لی تھی بلکہ غلاف اتار کر نکلیں کو بھی کھول ڈالا تھا۔ بیڈ کا گدار بھی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور شاپر کی بھی ایک ایک چیز بنا ہر گئی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون لوگ تھے اور انہیں میرے اس فلیٹ میں کس چیز کی تلاش تھی کہ فون اور میرا پرس بھی موجود تھا۔

یہ بات تو کنفرم تھی کہ دلارے ایک پلاننگ کے تحت ایک احمق اور مظلوم لڑکا بن کر میرے فلیٹ میں گھسنا تھا اور پھر غائب ہو گیا۔



کیا یہ نواب کے بندے تھے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ تو جواب نفی میں آیا کہ نواب کو کیا ضرورت پڑی ہے وہ تو خود مجھ سے اپنے خصوصی کام لے رہا ہے۔ تو پھر کیا یہ نواب جمشید کے بندے تھے جو میرے بارے میں کھوج لگانا چاہتے تھے لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کسی چیز کی تلاش تھی۔ اگر یہ نواب جمشید کے بندے نہیں تھے تو پھر ایسا تیسرا شخص کون ہے جو میرے بارے میں جاننا چاہ رہا ہے۔

وہ کون ہے؟ یہ سوال اپنی جگہ موجود تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کردوں کیا اس بات کا ذکر گولی استاد سے کروں؟ میں نے سوچا لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں مجھے ابھی انتظار کرنا ہے اور دیکھنا ہے یہ جو کوئی بھی ہے دوبارہ میرے سامنے ضرور آئے گا۔ میں نے بیڈ کو بچ اور صاف ستھرا کیا اور لیٹ گیا سر میں اب بھی بہت تکلیف ہو رہی تھی میں تھوڑی دیر کے بعد اٹھا۔ دودھ فرج سے نکال کر گرم کیا اور پین کٹر لے کر دوبارہ لیٹ گیا۔ میں فی الحال آرام کرنا چاہتا تھا اور بعد میں اس بارے میں سوچنا چاہتا تھا بلکہ سونے سے پہلے میں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ اب مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے میں کل دوبارہ نواب کی کوٹھی چلا جاؤں گا۔

مجھے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ دلارے کے معاملے میں مجھ سے چوک کیسے ہوگی۔ گولی استاد نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ہم جس لائن میں ہیں یہاں کسی اجنبی کو ملازم بھی نہیں رکھ سکتے۔ کیا پتا کون کس روپ میں ہوا اور میں یہ چوٹ کھا چکا تھا۔ اسی قسم کی باتیں سوچتے سوچتے میں غنودگی میں چلا گیا دوسرے دن صبح آنکھ کھلی تو سر کی تکلیف کم محسوس ہوئی میں نے ہاتھ ٹول کر سر کے زخم کا جائزہ

لیا۔ شکر تھا کہ گہرا زخم نہیں آیا تھا اتنا کہ ٹانگے وغیرہ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی میں نے سوچا کہ ابھی باہر جا کر میڈیکل اسٹور سے دوا لا کر خود لگا لوں گا۔ مگر اس سے پہلے مجھے غسل کرنا تھا اور ناشتا کرنا تھا مجھے بہت زور کی جھوک لگ رہی تھی۔

کپڑے میں ساتھ لے آیا تھا میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے اس ٹی شرٹ کا کالر اور گلے کا تھوڑا سا حصہ خون لگنے کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ میں نے اس ٹی شرٹ کو بھی دھو کر ڈال دیا۔

کچن میں آیا تو ناشتے کا سامان موجود تھا۔ انڈے ڈبل روٹی اور دودھ سب کچھ فرج میں موجود تھا۔ میں نے آدھا جلا آدھا کچا انڈا بنایا اور پھر صرف سلاکس پر بٹر لگا کر کھایا کیونکہ انڈا اس قابل ہی نہیں تھا کہ اسے کھایا جاتا۔ مجھے کبھی بھی کچن کے کاموں کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ان کاموں میں میں بالکل ہی صفر تھا۔ ناشتا کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ میرے سیل کی بیل پھر گنگناہٹیں میں نے سمجھتے ہوئے کہ گولی استاد کا فون ہو گا فون ہاتھ میں اٹھایا لیکن نمبر پر نگاہ پڑی تو میں چونک پڑا۔ فون کی اسکرین پر نواب۔ سطوت کا پرسنل نمبر تھا۔ میں نے جھٹ فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کیسے ہوں؟“ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے پوچھا۔ ”بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ میں نے اپنے لہجے میں بشارت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”سب کچھ واقعی ٹھیک ہے کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی۔“ نواب نے مختاط لہجے میں پوچھا۔

اس کا یہ سوال سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔ میرے دل دماغ میں سنسنابٹ سی ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ اسے کیسے اس بات کا علم ہوا کہ میرے

ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ کہیں یہ سب نواب ہی کا تو کیا دھرا نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ایک فیصلہ کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا کہ محترم نواب۔ سطوت صاحب اگر آپ ہوشیار ہیں تو شرمز بھی ڈیڑھ ہوشیار ہے میں نے اپنے لہجے میں حیرانی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”کیسی غیر معمولی بات سر؟“ میرے خیال میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہی رہا۔ میں نے اپنا کام اچھی طرح سے انجام دیا اور یہاں آ کر سو گیا۔ بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔ کیا آپ کو میرے حوالے سے کوئی اطلاع ملی ہے..... غیر معمولی واقعے کی.....“ میں نے آخری فقرہ معنی خیز لہجے میں ادا کیا۔

”ارے نہیں نہیں۔“ نواب نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو بس اپنا اطمینان حاصل کرنا چاہ رہا تھا کہ کل سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا تاہم کہہ رہے ہو تو سب ٹھیک ہی ہو گا۔ اب تم ایسا کرو کہ کل کسی دقت بلکہ.....“ اس نے چند لمحے سوچا پھر بولا۔ ”تم ایسا کرو کہ کل چار بجے شام میرے پاس آ جاؤ میں سر جانی ٹاؤن روحانی سینٹر میں ہوں۔ وہیں ملاقات ہوگی اور ہم کام کی بات بھی کر لیں گے اس کے علاوہ تمہاری اس شاندار کارکردگی کا تمہیں معافہ بھی تو دینا ہے۔“

”میرا معافہ آپ کا مجھ پر اعتماد ہے سر مجھے روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا دست شفقت میرے سر پر ہے اتنا ہی کافی ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ میں نے اپنے لہجے میں حد درجہ انکساری پیدا کرتے ہوئے اور درحقیقت چالپوسی ست کام لیتے ہوئے کہا۔

”گلد۔“ حسب عادت اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”تمہاری یہی سعادت مندی تو مجھے بہت پسند ہے لیکن پھر بھی شرمز ہر انسان کی اپنی ذاتی بہت ہی

ضروریات ہوتی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لیے اسے بہر حال رقم کی ضرورت تو پڑتی ہے وہ رقم تمہارا جائز حق بنتا ہے اور وہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔“

”تو پھر ایسا کر میں سر.....! اتنا کہہ کر میں رک گیا۔“

”ہاں ہاں بولو شرمز تم رک کیوں گئے۔“ نواب نے کہا۔

”مجھے آپ سے رقم لینا اچھا نہیں لگے گا آپ وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیں۔“ میں شرمندہ لہجے میں کہا۔

”جلو یہ ٹھیک ہے تم ایسا کر کہ اکاؤنٹ ریاض کو اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھو دواؤ آئندہ تمہارے حصے کی جو بھی رقم ہوگی وہ اس اکاؤنٹ میں جمع کروادی جائے گی اور تمہیں اس کی اطلاع بھی دے دی جائے گی۔“ نواب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نواب یہ کون سی چال میرے ساتھ چل رہا ہے اگر وہ مجھ سے کام لے رہا ہے تو دوسرے بندوں سے مجھے زرد کو ب کیوں کروایا یا پھر یہ بھی ہو سکتا کہ میں نواب کے بارے میں غلط سوچ رہا ہوں کہ وہ بندے نواب کے بھیجے ہوئے تھے ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات جاننا چاہ رہا ہو کہ میرا پیچھا تو کسی نے نہیں کیا یا پھر مجھے آنے اور جانے میں کسی رکاوٹ کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ ایک بار پھر مجھے نواب کے اس ”روحانی سینٹر“ میں جانے کا موقع مل رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اس کے روحانی سینٹر میں جانے کا موقع ملے میں وہاں کچھ وقت گزاروں تاکہ وہاں سے نواب کی زندگی سے جڑے کی اور راز میرے علم میں آ جائیں اس شخص نے اپنے اوپر مختلف شخصیات کے کئی غلاف چڑھا

رکھے تھے کئی پردے میں سرکا کر دیکھ چکا تھا۔ ایک آدھ پردہ خود اس نے اٹھا دیا تھا۔

یہ سب سوچتے سوچتے مجھے اس کے گاؤں شاداب نگر کا بھی خیال آیا۔ وہ جو اس کی آبائی حویلی ہے وہاں اس کی فیملی آباد ہے اس کی خاندانی بیوی ہے اور ایک بیٹی بھی موجود ہے کاش ایسا ہو کہ میں اس کی حویلی میں بھی کسی طرح داخل ہو سکوں۔ بظاہر تو یہ کام تقریباً ناممکن دکھائی دیتا ہے لیکن کہتے ہیں تاکہ اگر ہمت کرے انسان تو کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہوتا اگر اللہ چاہے اور اللہ میری نیت اور جذبے سے اچھی طرح سے واقف ہے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں ایک شیطان جو انسانوں کے بیچ رحمان کا روپ دھار کر بیٹھا ہے میں اسے سب کے سامنے بے نقاب کر سکوں مجھے پوری امید تھی کہ جس کی نیت اچھے کام کی ہو اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔

میں کل شام چار بجے تک کے لیے فارغ ہی تھا۔ میرے پاس کرنے کے لیے کوئی خاص کام تو نہیں تھا بس یہ سوچ رہا تھا کہ باہر نکلوں میڈیکل اسٹور سے سرکی چوٹ پر لگانے کے لیے کوئی دوا وغیرہ لے کر آؤں اور اپنی بالیونک بھی لے لوں لیکن باہر نکلنے سے پہلے میں نے سوچا کہ سرمی کو فون کر کے حشام کی خیریت معلوم کر لوں کتنے دن گزر گئے میں نے سرمی کو ایک فون بھی نہیں کیا۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں کہ بھائی کیسے ہیں اپنی بہن ہی کو بھول گئے۔ سرمی تو وہ لڑکی تھی جس نے میرے دل کے زخموں پر اپنی محبت کا پھیا رکھا تھا؟ اس کو پا کر میں فاتزہ کے عم کو بھولنے لگا تھا۔

میں نے سرمی کا فون ملایا تو بیل ہوتی رہی اور اس نے فون نہ ریسو نہیں کیا میں فون کاٹنے ہی والا تھا کہ اس نے فون ریسو کر لیا۔ اس کے بے زار سے

لہجے میں آواز سنائی دی۔  
”ہیلو جی کیسے.....!“

میں لمحہ بھر کو عجیب سا ہو گیا کیونکہ پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں جب بھی اسے فون کرتا تھا تو وہ ہمیشہ بہت خوش گوار لہجے میں مجھے سلام کرتی تھی۔ خیریت پوچھتی تھی لیکن آج..... خیر.....! ”کیسی ہو گڑیا؟ تم بھی سوچ رہی ہوں گی کہ کیسا بھائی بنا ہے بہن ہی کو بھول گیا دراصل.....!“

”جی مجھے معلوم ہے آپ بہت بڑی ہوں گے ویسے بتائیں۔ کیوں فون کیا ہے کوئی کام تھا مجھ سے.....!“ اس نے میری بات کاٹ کر سابقہ لہجے میں کہا۔  
”کیسی باتیں کر رہی ہو گڑیا؟ مجھے بھلا تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ میں نے حشام کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا“ کیسا ہے وہ.....!“

میرے لہجے میں ہلکے سے دکھ کی آمیزش تھی۔  
”وہ ٹھیک ہے کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو میں اس وقت بہت مصروف ہوں پھر بات ہوگی اللہ حافظ!“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے میری گڑیا مجھ سے بہت ناراض ہے۔ آئی ایم سوری گڑیا! اپنے بھائی کو معاف کر دو۔ میں انشاء اللہ جلد تمہارے پاس آؤں گا۔“ مجھے لگا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ اس لیے اسے منانے ہوئے اپنے لہجے میں ڈھیر سا راپیا رسودیا۔

”نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”اور یہ کیا آپ نے گڑیا؟ گڑیا کی رٹ نگار تھی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میرا نام سرمی ہے..... سرمی..... پلیز مجھے میرے نام سے مخاطب کریں۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اچھا سرمی صاحبہ اب ناراضگی ختم کریں اور اپنے بھیا کو معاف بھی کر دیں۔ دراصل میں تم سے

اور طلال انکل اور کرنل مشتاق سے ملنا چاہ رہا تھا کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا پھر خجندہ لہجے میں آخری جملہ کیا۔

”کرنل مشتاق اور طلال انکل بہت بڑی ہیں فی الحال کسی سے نہیں مل سکتے اور میں بھی مصروف ہوں اس لیے فی الحال آپ زحمت نہ ہی کریں۔“ سرمی نے ایک بار پھر سخت اور رد کھے لہجے میں کہا تو میں نے سوچا کہ سرمی کے ذریعے ہی یہ بات کرنل مشتاق اور طلال انکل تک پہنچا دوں کہ کل رات نواب نے میرے ذریعے ایک لفافہ پکی بستی کی مسجد کے پیش امام قاری ممتاز بیگ تک پہنچایا ہے اور وہ شخص مجھے سو فیصد مشکوک لگا ہے اس لیے کہا۔

”ٹھیک ہے سرمی میں جانتا ہوں کہ وہ دونوں واقعی بہت مصروف ہوں گے لیکن تم تو میرا پیغام ان تک پہنچا سکتی ہو نابات دراصل یہ ہے کہ.....!“

”سوری۔“ میں نے کہا تاکہ میں بھی بہت بڑی ہوں اللہ حافظ۔“  
سرمی نے میری بات سننے بغیر تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا اور میں حیران اور پریشان فون کو گھور رہا تھا۔ سرمی کا یہ اکھڑا اکھڑا رویہ میزبانی سے بالاتر تھا۔ سرمی لاکھ مصروف سہی لیکن وہ اس قدر بداخلاقی کا مظاہرہ میرے ساتھ کس طرح کر سکتی ہے اس کی باتوں اور لہجے سے صاف صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا ہی نہیں چاہ رہی تھی اور اس کی یہ ناراضی کوئی عام بہن بھائی والی ناراضی نہیں تھی۔ یقیناً کوئی عہد ہے اس کے پیچھے یا کوئی بہت بڑی بدگمانی ہے میری جانب سے، لیکن ہمارے درمیان ایسا کون سا جو اتنی بدگمانی پیدا کر سکتا ہے؟ خرابات کیا ہے میرا؟ مار بڑی طرح چکر رہا تھا۔ ابھی میں ایک کلیہ کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ سرمی کی بدگمانی اور ناراضی سامنے

آگئی۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میرا سر بری طرح دکھنے لگا اور میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

بہت ساری چکر دینے والی سوچیں آئیں تو میرے سر میں شدید درد شروع ہو رہا تھا سر کے زخم میں بھی تکلیف ہونے لگی۔ مجھے جلد از جلد دوا لینا چاہیے۔ پھر میں سیدھا کلفٹن چلا جاؤں گا اور کل تک وہیں رگوں گا مجھے نواب نے اپنے ایسے ہی کسی ”خاص کام“ سے بلوایا ہے اور میرا وہاں جانا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آج رات بھی میرے ساتھ کوئی اور اہم ہونی ہو جائے اور میں ایک اہم بات جاننے سے محروم رہ جاؤں میں نے سوچا کہ نواب کے اس کام سے فارغ ہو کر سیدھا سرمی سے جا کر ملوں گا تاکہ معلوم تو ہو کہ وہ میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں اپنا رہی ہے اسے کسی درجہ سے میری جانب سے بدگمانی ہوگئی ہے۔ میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور جیب میں ہاتھ ڈالا تو احساس ہوا پرس بالکل خالی تھا۔ سرمی سے تو میں نے لائن رینڈ پر بات کر لی تھی۔ میں دوا کہاں سے لوں گا۔ اس لیے میڈیکل اسٹور جانے کا ارادہ ترک کیا اور سیدھا کلفٹن جانے کا سوچا وہاں الماری میں میرے پاس اچھی خاص رقم موجود تھی جو چند دن پہلے ہی نواب نے دی تھی اور میں نے ایسی ہی کسی اشد ضرورت کی وجہ سے بینک میں جمع نہیں کروائی تھی۔ آج صبح گولی استاد کو بھی میرے پاس آتا تھا اور وہ آنے سے پہلے میرے موبائل فون پر فون کر رہا ہوگا تو یقیناً اسے کوئی جواب نہیں ملا ہوگا۔ اس ہنگامے کے پی ٹی سی ایل نمبر کا اسے علم نہیں تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے فون کر کے ساری بات بتا دوں۔ پھر خود ہی اپنا ارادہ رد کر دیا اور چابی اٹھا کر فلیٹ سے باہر آ گیا۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں



اترنے لگا۔ سیڑھیاں اترنے سے میرے سر میں دھمکی پیدا ہو رہی تھی۔

جیسے ہی میں ایک زینہ طے کر کے دوسرے زینے کی جانب بڑھا کسی سے میری ٹکر ہو گئی۔ وہ ایک سفید داڑھی والے بزرگ تھے۔

”سوری بیٹا! بزرگ نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے قدم ایک دم ہی رک گئے اور میں نے بے ساختہ تیزی سے واپس آ کر اس بزرگ کو دیکھنا چاہا لیکن وہ تو کسی جوان آدمی کی مانند تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر کی جانب جا رہا تھا۔ میں اس کی جانب سے پوری طرح مشکوک ہو چکا تھا وہ شخص تھا تو بوڑھا لیکن اس کی زبان سے بے ساختہ جو ”سوری بیٹا“ ادا ہوا تھا وہ کسی جوان کی کراری آواز اور لہجہ تھا اور پھر اس کا ایک جوان کی طرح تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنا۔

میں بھی اسی تیزی کے ساتھ واپس ہوا اور تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جانے لگا میں چھت تک سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا لیکن وہ بوڑھا کسی چھلا دے کی مانند غائب ہو چکا تھا۔ شاید میں نے اس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کرنے میں دیر کر دی تھی۔ اس شخص کا تعلق یقیناً ان لوگوں سے تھا جنہوں نے کل رات میری خاطر توابع کی بھی اب میں یہاں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ یہی بات سوچ کر میں دوبارہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا بلڈنگ کے ٹیسٹ میں آ گیا۔ یہاں پارکنگ تھی میں اس وقت اپنے سر کا درد وغیرہ سب بھول چکا تھا اور جلد از جلد کلغٹن نواب کی کوٹھی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ وہی کوٹھی میرے

لیے محفوظ اور آخری پناہ گاہ تھی۔

روڈ پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں پوری طرح ہوشیار تھا اور اپنے ارد گرد آگے پیچھے دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی کار کوئی بائیک میرا تعاقب تو نہیں کر رہی لیکن ایسا نہیں تھا میں آرام سے کلغٹن والی کوٹھی پر پہنچ گیا اور سب سے پہلے سلمان کو اپنے پاس بلایا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹا اس کا انتظار کر رہا تھا تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ آیا اور آتے ہی طنزیہ لہجے میں بولا۔

”اوہ..... تو آگئے آپ..... اکیلے اکیلے خوب عیش ہو رہے تھے اور مجھ سے کیا گیا اپنا وعدہ بھول گئے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ.....!“

”ارے یار میں کوئی عیش ویش نہیں کر رہا تھا نواب صاحب نے کچھ کام بتائے تھے بس انہیں ہی پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا کل رات میرے ساتھ ایک چھوٹا سا حادثہ بھی پیش آ گیا۔“ میں اس کا مطلب سمجھنے کے بعد بولا۔

”کہا حاشا؟“ وہ چونک پڑا۔

”کل کچھ لڑکوں نے مجھ سے میرا پرس چھین لیا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”چھین لیا اور وہ بھی تم سے..... حیرت ہے اور تم نے آسانی سے چھیننے دیا ارے کیا چوڑیاں پہن رکھی تھیں بکا دیتے سالوں کو۔“ سلمان نے کہا۔

”اس کا تو موقع ہی نہیں مل سکا میں ایک ریسٹورنٹ سے نکل کر اپنی گاڑی تک جا رہا تھا راتے میں ڈرائیو کرتا تھا بس پیچھے سے کسی نے کوئی چیز زور سے میرے سر پر ماری میں چکر کر نیچے گر پڑا وہ شاید بے ہوش بھی ہو گیا تھوڑی دیر بعد ہوش آ پانا میرے پاس سے غائب تھا۔“ میں نے جھوٹی کہانی گھڑ کر سنائی۔

”کون سا ریسٹورنٹ تھا علاقے کا نام بتاؤ ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ اتنی بڑی جرأت کس سالے نے کی ہے۔“ سلمان نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”چھوڑو یار کون سی دولت لٹ گئی ہے ایسا ریکارڈ میں ہی تو تھا اور پرس میں بھی زیادہ نہیں دس پندرہ ہزار کی رقم تھی۔“ میں نے کہا۔

”بات دولت کی نہیں عزت کی ہے یار میں تو.....!“ وہ مزید جوش میں آ کر بولا۔ لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

”تم صرف اتنا کرو کہ میرے سر میں لگی اس چوٹ کے لیے کچھ انتظام کرو میں دوا میں لکھ دیتا ہوں تم وہ منگوا دو اور ہاں مجھے فوری طور پر ایک موبائل فون اور نئی قم بھی چاہیے۔“

”وہ تو میں ابھی منگوا دیتا ہوں لیکن.....!“

”لیکن وکیلن چھوڑو۔“ میں نے کہا اور اسے دوا لکھ کر دے دی۔

سلمان مجھ سے دوا کر پرچہ لے کر اوریہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں میری مطلوبہ چیزیں لے کر آتا ہے۔

میں ہیڈ پر لیٹ کر اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک بعد دیگرے گزشتہ حالات پر غور کرتا رہا۔ مجھے ان تمام حالات کے علاوہ جو میرے ساتھ پیش آ چکے تھے سرنی کے اس ناراض سلوک کا احساس ہو رہا تھا میرا اللہ شا اس بات کا گواہ ہے کہ سرمی کے لیے میرے دل میں کیا جذبات اور احساسات ہیں۔ میں ہمیشہ پیار سے اسے لڑیا کہا کرتا تھا اور اس نے بھی کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا لیکن آج آج اس نے میرے گڑیا سنے پر کتنا برا مانایا تھا اس بات کا پتا تو مجھے سرمی سے سا کر ہی لگ سکتا تھا۔ میں جلد ہی سرمی سے ملوں گا میں نے فیصلہ کر لیا۔

مجھے اس طرح لپٹے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ تب ہی سلمان آ گیا اس کے ساتھ ایک شخص اور تھا میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ فرحان ہے تمہارے زخم کی ڈریسنگ کر دے گا۔

”ارے یار میں خود کر لیتا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے سر کے پچھلے حصے میں زخم ہے تم کیسے ڈریسنگ کر لیتے جبکہ تم اس زخم کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔“ فرحان نے کہا اور زخم کا معائنہ کرنے لگا اور بولا۔

”زخم بہت زیادہ گہرا نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے میں نے ہاتھ لگا کر اس بات کا اندازہ کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ادہو لگتا ہے ڈاکٹر صاحب ہو۔“ فرحان نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا میرے ساتھ وہ دونوں بھی ہنسنے لگے میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور فرحان کو اس کا کام کرنے دیا۔ پھر دوا میں دیکھ کر بولا۔

”ارے واہ تم نے تو یہ اسٹی بائیونک بھی بالکل ٹھیک منگوائی ہیں تمہیں کیسے پتا کہ زخم کو خشک کرنے کے لیے یہی دوا میں کھانی جانی ہیں۔“ اس مرتبہ اس کے لہجے میں ہلکی سی حیرت کی آمیزش تھی۔

”وہ اس لیے کہ مجھے ایسے زخم عموماً لگتے رہتے ہیں اور میں یہی دوا میں لیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اچھا اب میں سمجھا۔“ اس نے مطمئن لہجے میں کہا اور چلا گیا۔

”اگر تم کہو تو تمہارے لیے بخنی وغیرہ ہواؤں تمہیں کمزوری محسوس ہو رہی ہوگی خون بھی تو نکلا ہوگا۔“ سلمان نے ازراہ ہمدردی کہا۔

”کمزوری۔“ میں ہنس پڑا اور کہا ”اچھا ٹھیک ہے ہواؤں۔“

وہ تمام دن میں نے اپنے کمرے میں گزارا۔

سلمان میرے لیے نیا موبائل اور سیم بھی لے کر آ گیا۔ میں نے نواب کو نیا نمبر دے دیا اور سرمئی کے نمبر پر بھی ٹیکسٹ کر دیا میں اب اپنا پرانا نمبر استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نواب سے ملاقات کل چار بجے کرنی تھی۔ میرے پاس آج کی پوری رات تھی۔ میں جی بھر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سوچ رہا تھا کہ اعصاب کو ریلیکس کرنے والی ٹیبلٹ بھی لے لیتا ہوں تاکہ رات پرسکون گزر جائے۔ میں سونے کی تیاری کر کے بیڈ پر دراز ہو گیا سر میں اب وردہ رائے نام تھا۔ وہ اپنے کام کر دکھایا تھا رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے کونھی میں بھی چہل قدمی ہو چکی تھی۔ سناٹا ہی تھا جب نواب کونھی میں موجود ہوتا تھا تو یہاں تمام گارڈز جاگتے رہتے اور نگرانی کرتے رہتے تھے لیکن جب نواب موجود نہیں ہوتا تھا تو تمام لوگ ریلیکس رہتے تھے۔

میں ابھی ہلکی غودگی ہی میں تھا تب مجھے ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی میں نے جھٹ آ نکھیں کھول دیں اور پوری طرح الارٹ ہو گیا۔

وہ جو کوئی بھی تھا بہت احتیاط اور آہستگی سے اندر آیا تھا اندھیرے میں مجھے صرف اس کا ہیولہ ہی دکھائی دیا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بہت احتیاط سے بند کر دیا۔ میں بیڈ پر آنکھیں کھولے لیٹا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ وہ آنے والا میرے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔

اس ہیولے پر میری آنکھیں جمی تھیں۔ وہ بیڈ کے نزدیک آ رہا تھا میں پوری طرح اسے دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ وہ میرے بیڈ کے نزدیک آ کر رکا پھر میرے اوپر چھٹنے لگا میں اسپرنگ کی طرح بیڈ سے اچھلا اور اس کو چھاپ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ

میرے مضبوط جسم کے نیچو باہر اڑا تھا۔ ”کون ہوں؟ اور چوروں کی طرح میرے کمرے میں کیوں آئے ہو۔“ میں نے کروٹ کے بل لیٹے اس انسانی وجود سے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

”ارے بابا چھوڑو مجھے میں راکھی ہوں۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا تو میں نے جھٹ اس کو چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ گیا پھر تیزی سے میرا ہاتھ سوچ بوڑھ کی جانب بڑھا اور میں نے لاسٹ آن کر دی۔

ٹیوب لاسٹ کی دودھیا روشنی میں میں نے راکھی کو اپنے بیڈ پر پڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے رات کو سونے والا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اپنے عریاں بازو بری طرح مسل رہی تھی۔

”تم..... تم اس وقت..... کیا کرنے آئی ہو اور یہ کیا طریقہ ہے کمرے میں آنے کا؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”لیکن اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اپنے بازو اور کمر دباتی رہی پھر منہ بناتے ہوئے بولی۔

”تم نے میری ہڈیوں کا سرمہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جنگلی کہیں کے کتنا فولاو ہے تمہارا جسم۔“ اس نے پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور بیڈ سے اتر کر میرے نزدیک چلی آئی۔ پھر میرے بازو اور سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”کتنا مزہ آتا ہے جب تمہارے یہ فولاوی بازو میرے اس نرم و نازک وجود کو جکڑ لیتے ہیں کتنے ظالم اور بے مروت ہوں۔ ذرا حساب تو لگاؤ کہ کتنے دن ہو گئے ہیں تم سے ملاقات ہوئے اور تمہارا قرب ملنا اب تو پیاس کے مارے حلق توڑنے لگا ہے۔“ یہ سہجہ کر وہ میرے گرد دونوں بازو پھیل کر سینے سے لگ گئی اور

”بوش میں آؤ راکھی یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ میں نے تیزی کے ساتھ اس کو خود سے جدا کر دیا۔

”میں بھلا بوش میں کیسے رہ سکتی ہوں۔ تم جو اتنے دور ہو پلیر شمر دلاتی بے مروتی تو نہ دکھاؤ کچھ تو میرا خیال کرو یاد کرو تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ.....!“

”بس۔“ میں نے سختی کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھئی۔“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے نیند کی دوائی ہوئی ہے میں سونا چاہتا ہوں تم اب جاؤ کل صبح بات کریں گے۔“ میں نے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو شمرز۔ مجھ سے لگاؤ کر رکھو گے تو نقصان میں رہو گے۔“ اس نے ڈھٹائی کے ساتھ میرے بیڈ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیسا نقصان؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”میں کیوں بتاؤں جب نقصان اٹھا لو گے تو خود ہی ہتھیار چل جائے گا۔“ اس نے کہا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ کچھ اس طرح کہ اس کی ٹانگیں بیڈ سے نیچے ٹوک رہی تھیں اور دھڑ بیڈ کے اوپر تھا اس نے بے حیائی کے انداز میں اپنے دونوں بازو دوسرے کی پیچھے کر رکھے تھے۔ اس طرح کرنے سے اس کے لباس کے سامنے والے حصے کے بن کھلنے لگے تھے۔ میں اس کے جسم سے نگاہیں چراتے ہوئے بیڈ کے سائیڈ میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہے شرافت کے ساتھ اٹھ کر بیٹھو پھر بات کرو۔“ ”بس ہو گئے چت۔“ اس نے ہلکا سا تہقیر

لگاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر گردن موڑ کر میری جانب دیکھا اور میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئی اور میری جانب مسکراتے ہوئے دیکھنے لگی بالکل ایسے جیسے وہ اس ساری پتجویشن کو بہت انجوائے کر رہی ہو۔

”اب بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ میں نے اپنی پیشانی کو دو انگلیوں سے مسلتے ہوئے پوچھا۔

”سوری۔ تمہیں میرا یہاں آنا برا لگا ہے نا تو میں جاری ہوں پھر شکایت نہ کرنا کہ راکھی نے دوست ہوتے ہوئے بھی تمہیں اندھیرے میں رکھا۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”پلیز بیٹھو۔“ میں نے نرم لہجے میں مسکرا کر کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ فوراً بیٹھ گئی۔ پھر بے تابی سے اپنے دونوں بازو میرے گلے میں حمال کیے اور من مانی میں مصروف ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگا اور دعا کرنے لگا کہ اللہ پاک تو مجھے اس شیطان کی خالہ کے شر سے محفوظ رکھ۔

مجھے اس وقت وہ ایک جنسی بلی کی طرح لگ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ مزید آگے بڑھتی اور میں اپنے ضبط کے امتحان میں قیل ہو جاتا میں نے اسے خود سے جدا کیا اور نرم لہجے میں کہا۔

”یہ سب بعد میں کر لینا پہلے بات تو بتاؤ۔“ میں اس سے اس لیے ضد کر رہا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کونھی میں دن رات راتی ہے اسے نواب سے وابستہ بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے بہت ممکن ہے کہ اس وقت بھی اس کے پاس میرے لیے کوئی اہم خبر ہو۔

میرے ہٹانے سے وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی اور اشارے سے پانی مانگا۔



کہنے اگر دل و دماغ میں گھر کر جائے تو انسان انسانیت سے کوسوں دور چلا جاتا ہے۔ غارت خون بن کر اس کی رگوں میں موڑنے لگتی ہے۔ وہ ہر حال میں منزل سر کرنے کی حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔  
ہوٹل کے ایک کمرے میں ہونے والے اندھے قتل کی روایت اس کا نہ تو کوئی عینی گواہ تھا نہ قاتل نے کوئی قیوت اور کھرا چھوڑا تھا۔  
ایک سچی تفتیشی کہانی اس دور کی پولیس کا احوال جب جدید آلات ایجاد نہیں ہوئے تھے۔

والسلام  
ریاض ہٹ  
حسن ابدال

ضروری کارروائی کے بعد میں نے سپاہی دلاور کی ہمراہی میں لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔  
اور خود ہوٹل کے ایک کمرے میں آ بیٹھا۔ سپاہی خورشید کو میں نے ادھر ادھر سے تفتیش کرنے پر مامور کر دیا۔

دونوں ویٹروں اور منیجر کو اپنے سامنے بٹھالیا اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سے جو کہانی سننے لگی وہ میں آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔  
مقتول کا نام شفیق تھا۔  
شفیق ایک ناول نگار تھا اور اکثر اس ہوٹل میں آ کر ٹھہرتا تھا۔

وہ زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ کرتا تھا۔ بقول ویٹروں کے کم گو اور وحشی مزاج کا تھا۔ زیادہ تر اپنے لکھے کا سامان لے کر دور پہاڑی کی مشرق کی سمت نکل جاتا تھا۔

ہم نے ہوٹل کا رجسٹر چیک کیا۔ شفیق کا پتہ ایک مشہور شہر کا تھا۔

ان دنوں شناختی کارڈ بننے تھے۔ شفیق کا شناختی کارڈ ہمیں کمرے میں مل گیا تھا۔ اس کے مطابق اس کی عمر پالیس سال تھی۔ ان دنوں ابھی نادرا متعارف نہیں ہوا

اب میں عمر کے اس دور میں داخل ہو چکا ہوں کہ باہر کی دلچسپیوں میں حصہ لینے کو بالکل جی نہیں مانتا۔  
زباہہ تر چارپائی کے ساتھ ہی دوستی رہتی ہے۔ میں نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی۔ کبھی بھی خیالات کی گاڑی مجھے خاصی میں لے جاتی ہے اور میں دوبارہ سے تھانیدار بن جاتا ہوں۔

وہ ایک ایسا لودن تھا اور ہم ایک ہوٹل کے کمرے میں کھڑے اس لاش کا جائزہ لے رہے تھے جس کی اطلاع ہمیں ملی تھی۔ یہ ہوٹل ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ اور اس کے ارد گرد قدرتی حسن بکھرا ہوا تھا۔  
لاش سینے کے بل پڑی تھی اور کمرے میں خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔

اس وقت میرے ساتھ سپاہی دلاور اور سپاہی خورشید بھی تھا۔

سپاہی دلاور نے لاش کو سیدھا کیا۔ دل کے مقام پر سوراخ تھا اور خون اس سوراخ سے بہہ بہہ کر چھوٹے سے تالاب کی صورت میں جم چکا تھا۔ میں یہ بھی بتاؤں کہ ہمارے ساتھ ہوٹل کا منیجر اور دو ویٹرز بھی موجود تھے۔

ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جائے گا۔ اے میرے مالک یا ذوالجلال واکرام میرے مدد فرما۔

اور پھر میرے رت نے کچھ اس طرح میز کی مدد کی کہ راکھی اپنی تمام تر خوشیوں کو کھٹک گئی اور سزا گئی اور میں بھی سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو راکھی کمرے سے جا چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا اور فجر کی قضا نماز ادا کرنے کے بعد شکرانے کے نفل پڑھے۔ رات میرے ضبط و نفس کا بہت کڑا امتحان تھا لیکن اللہ نے میری مدد فرمائی اور میں گندگی میں گرنے سے محفوظ رہا۔

میں نے سر کی چوٹ کا جائزہ لیا اس پر خاصی خشکی آ گئی تھی میں نے وہ کریم لگائی اور ناشتے کے بعد دوا کھائی۔

میں مسلسل راکھی کی رات دہائی ان باتوں پر غور کر رہا تھا جو اس نے نواب اور کل راؤ کے بارے میں بتائی تھیں۔ میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ نواب مجھ سے کیا کام لینے والا ہے اور کس کے پاس بھیجے گا۔

نواب کے پاس جانے سے پہلے مجھے ایک بہت ضروری کام کرنے تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی الباری میں موجود ساری رقم نکالی اور گاڑی لے کر ضروری خریداری کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

واپسی میں مجھے تقریباً ڈھائی گھنٹے کا وقت لگا۔ شکر تھا کہ مجھے اپنی مطلوبہ تمام اشیاء مل گئی تھیں۔ اب میں نواب کے پاس جانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

(انشاء اللہ باقی آئندہ)



”اچھا یہ بتاؤ کہ یہ کس راؤ نامی شخص بھارت میں کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کا ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار ہے ادھر بھارت میں اس کی کئی گارمنٹس فیکٹریاں تھیں پھر مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان آ گیا ہے اور مسلمانوں والا نام رکھ کر یہاں کاروبار کر رہا ہے یہاں بھی اس نے گارمنٹس فیکٹریاں لگا رکھی ہیں۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب میں نواب کی منظور نظر تھی۔“

”اچھا اچھا سمجھ گیا۔“ میں نے کہا پھر مجھے راکھی سے کہنا ہی پڑا کہ ”اب تم جاؤ مجھے بہت گہری نیند آرہی ہے۔“ کیونکہ راکھی کے ہاتھ اندھیرے اور قربت کے باعث ایک بار پھر بکینے لگے تھے۔

”میں باہر کیسے جا سکتی ہوں تمہیں پتا تو ہے کہ اطہر یہیں تمہارے کمرے کے باہر ٹہل رہا ہے۔“ راکھی نے جواب دیا۔

”اچھا پلیز مجھے سونے دو میرا سر بری طرح چکرا رہا ہے۔“ میں نے کہا اور لیٹ گیا۔

”ایسے ہی سونے دوں تم نے اپنا مطلب تو نکال لیا اور میرا مطلب.....!“ راکھی نے کہا اور میرے برابر لیٹ گئی۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں سو گیا ہوں وہ مجھے دھیرے دھیرے آواز دینے لگی اور میں نے ہلکے ہلکے خراٹے لینے شروع کر دیے تب وہ انتہائی حرکتوں پر اتر آئی۔ غصے اور جنون میں ویوائی ہونے لگی اور میں دل ہی دل میں اپنے رب کو پکارنے لگا کہ اے میرے رب میں تیرے حضور ان تمام گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں تو میری مدد فرما۔ ابھی میرا نفس بہت کمزور ہے۔ میں خود سے نہیں بچ سکتا۔ اس شیطانی طوفان کا یہ منہ زور ریلٹا مجھے اپنے ساتھ بہا لے

تھا لیکن شناختی کارڈ کے بغیر تھے۔ شناختی کارڈ پر لکھا ہوا پتہ رجسٹر میں درج پتے سے کے مطابق تھا۔ اس ہوٹل کے تقریباً پچاس کمرے تھے۔ کل رات تک جاگیس کمرے بک تھے۔ صبح صبح بندے کمرے خالی کر کے جا چکے تھے۔ ہم نے ان کے پتے نوٹ کر لیے تھے۔ کمرے کو سیل کر کے ہم تھانے واپس آ گئے۔ میں تھانے کا انتظام رانصر ام اے ایس آئی رانا تنویر کے حوالے کر گیا تھا۔ وہ مجھے میرے فیس میں ملا۔ اس وقت دن کے دو بج چکے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے کھانا کھایا اور پھر جائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کیس پر بحث کرنے لگے۔ ”سر..... لگتا ہے قاتل ہوٹل میں موجود تھا۔ رانا نے سگریٹ کا شلے لے کر کہا وہ اپنی بیانی خالی کر چکا تھا۔ ”تمہارا اندازہ صحیح بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے بھی آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور ان چھ بندوں کی لسٹ اس کے حوالے کر دی وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ ساتھ ساتھ سگریٹ سے بھی شغل جاری رکھا۔ شفیق کا حلق جس شہر سے تھا وہ شہر بھی ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ جبکہ جو چھ بندے ہوٹل کے کمرے چھوڑ کر گئے تھے ان کے پتے مختلف جگہوں کے تھے اور یہ سب جگہیں ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں آتی تھیں۔ میں آپ کو قانونی پیچیدگیوں میں الجھا کر آپ کا وقت اور ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات کو ضائع نہیں کروں گا۔ صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ دوسرے تھانوں میں جا کر تفتیش کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ اے ایس آئی چلا گیا۔

اور میں تھانے کے دوسرے معاملات میں سر کھپانے لگا۔ چونکہ اس وقت جب ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر مجھے سلوٹ کیا اور گویا ہوا۔ ”سر ایک جوان اور دو بزرگ نائپ بندے آپ سے ملاقات کے متنی ہیں۔“ آپ جان ہی گئے ہوں گے کہ یہ سپاہی خورشید تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بھیج دو۔ چند لمحوں کے بعد ایک جوان اور دو بزرگ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جوان کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ نام عام معلوم ہوا اور یہ شفیق کا اکووتا بیٹا تھا۔ بزرگ محلے کے معزز تھے۔ عامر چہرے سے پریشان ضرور لگتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ لگ رہا تھا جیسے وہ اتنا غمگین یا پریشان نہیں ہے جتنا ایک بیٹے کو باپ کے مرنے پر ہونا چاہیے تھا اور وہ بھی مل ہونے پر۔ یہ بات میں نے ذہن میں رکھ لی۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ قاتل کا کچھ پتہ چلا اور انہیں لاش کب تک ملے گی؟ نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ صرف رسماً ہو رہا ہو۔ آپ بات سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے ان کو کہا۔ ”پوسٹ مارٹم کے بعد شام تک ان کو لاش مل جائے گی اور اس کے بعد تفتیش شروع ہوگی۔“ جو بزرگ ساتھ آئے تھے ان کے چہرے یہ غماز کر رہے تھے کہ انہیں شفیق کے مرنے کا دکھ ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن عامر کی موجودگی مانع ہو۔ خیر جو کچھ بھی تھا۔ ایک دن سامنے تو آنا ہی تھا۔ اگلے دن دوپہر تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔

اسے ہم ابتدائی رپورٹ کہتے ہیں۔ تفصیلی رپورٹ اور لاش کو شام ڈھلے آتا تھا۔ شفیق کی موت سینے میں گولی لگنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی اور گولی تقریباً ایک گز کے فاصلے سے چلائی گئی تھی۔ میں نے لاش کا معائنہ کرتے ہوئے غور سے دیکھا تھا۔ یہ گولی دوسری طرف یعنی پیٹھ کی طرف سے نکل گئی تھی۔ لیکن ہمیں گولی نہیں ملی تھی۔ فائر شدہ..... ہم نے کمرے میں تلاش کرنے کی سعی کی تھی۔ بہر حال گولی مل جاتی تو رپورٹور کے کلپیر کے متعلق پتہ چل جاتا۔ زخم کی نوعیت دیکھتے ہوئے پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر نے تفصیلی رپورٹ میں (جو ہمیں شام کو موصول ہوئی تھی) کرپورٹور کے کلپیر کے متعلق لکھا تھا۔ جب لاش واپس آئی تو اواحقین آئے بیٹھے تھے۔ وہ لاش لے کر چلے گئے۔ اگلے دن میں نے سپاہی دلادور کو ساتھ لیا اور شفیق کے گھر پہنچ گیا۔ یہ ایک تین کمروں پر مشتمل نفاست سے بنا ہوا گھر تھا۔ ہمیں ایک جی جانی بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ اس وقت تک لاش کو دفنایا جا چکا تھا۔ صحن میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں اور دعا کے لیے آئے ہوئے لوگ ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھک میں آنے سے پہلے ہم نے بھی ادھر ہی بیٹھ کر دعا وغیرہ کی تھی۔ ہم دیر نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے فرائض ہی ایسے تھے۔ بہر حال ہم نے تین آدمیوں کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ان میں ایک مقتول کا سالانہ ایک بھائی اور ایک اس کا

قریبی دوست تھا۔ ابھی ہم نے انہیں صرف ٹولنا تھا۔ اس وقت جذبات بھڑکے ہوئے تھے ایسے وقت میں ابتدائی تفتیش بعض اوقات فائدہ مند رہتی تھی۔ سالہ کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ رنگ اس کا گندمی اور ڈیل ڈیل کے لحاظ سے ایک کمزور سا بندہ لگتا تھا۔ جبکہ بھائی صحت مند تھا اور اس نے بڑی بڑی موچیں رکھی ہوئی تھیں۔ مقتول کے دوست کو دیکھ کر اس کے متعلق ذہن میں اچھا تاثر ابھرتا تھا۔ عمر اس کی مقتول سے تین چار سال زیادہ ہوگی۔ ”ہاں تو جناب..... ہم اپنے فرض سے مجبور ہیں۔ آپ لوگ گھرے غم میں ہیں لیکن..... میں نے سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔“ ”تھانیدار صاحب! ہم آپ کی بات سمجھ گئے ہیں۔ آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ میرا بھائی تو واپس نہیں آ سکتا لیکن ہم اس کے قاتل کو تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔“ مقتول کے بھائی نے دھکی لپٹے میں کہا۔ ”سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ عامر کہاں ہے؟ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔“ ”جناب کیا پوچھتے ہیں؟ وہ تو باپ کو دفنانے کے بعد کہیں چلا گیا تھا مقتول کے دوست نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟“ میں نے حیران لگا ہوں سے متیوں کے چروں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک بے پروا اور لالہ بالی سالہ کا ہے جناب۔“ مقتول کے بھائی نے کہا۔ ”مگر ابھی تو دفنانے پہلا دن ہے اور بیٹا کسی کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔“ میں نے مقتول کے بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔



وہ خاموش رہا۔

”اچھا..... یوں بتا ہی سکتے ہیں کہ شفیق کا ایسا کون سا دشمن ہے جس نے اسے قتل کیا ہے؟“

”جناب تھانیدار صاحب۔ شفیق صرف نام کا ہی شفیق نہیں تھا بلکہ نام بمسکی تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ.....“

مقتول کے دوست نے کہا اور اس کے بھائی نے بھی سر ہلادیا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ مقتول کا سالانہ جس کا نام صفدر تھا۔ اس دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہیں اور ہو۔

”اچھا..... اب ہم چلتے ہیں۔ صفدر صاحب اچانک میں نے صفدر کی طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کل آپ کسی وقت تھانے آ جائیں۔ آپ سے وہیں باتیں ہوں گی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا ہے اور اس کا گندی رنگ مزید گندی ہو گیا ہے۔

پھر وہاں سے تھانے میں واپس آ گئے۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ آج صبح ہی میں نے مقتول کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے (ندیم) خبر کی ڈیوٹی لگادی تھی۔ اس کا ذکر میری چھٹی کہانیوں میں آچکا ہے۔ اے ایس آئی رانا تنویر ان ہندوں کے متعلق چھان بین کر رہا تھا جو اس صبح ہوٹل چھوڑ کر گئے تھے۔

مجھے اچانک عامر کا کہیں چلے جانا بھی کھٹک رہا تھا۔ جب وہ پہلی بار تھانے میں آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ اسے باپ کے قتل کا زیادہ قلق نہیں ہے۔

اگلے دن تقریباً گیارہ بجے صفدر (مقتول کا سالانہ) آیا تو میں نے اسے کرسی پر بٹھایا۔ پہلے اسے پانی پلایا اور پھر چائے اور بسکٹ سے اس کی تواضع کی۔ وہ نہ

نہ کرتا رہا لیکن میں نے دوستانہ انداز میں یہ سب کچھ کر دیا۔

پھر دوستانہ انداز میں میں اسے سوال جواب کی آماج پر لے آیا۔

”صفدر بھائی مجھے کچھ اشارہ دیں گے تو بات آگے بڑھے گی۔“

”تھانیدار صاحب قتل تو میں بھی اسے کرتا چاہتا تھا۔“ صفدر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں اچھل پڑا اور تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس نے میری بہن کی زندگی برباد کر دی تھی۔“

”کیسے؟“ میرا مطلب ہے آپ کی بہن کو اس سے شکایت کیا تھی؟“

”اے صرف لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔“ صفدر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ کچھ سمجھ تو گیا ہوں لیکن صرف اتنی سی بات.....“ میں نے اسے ٹٹوٹے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری بہن کتنی تھی کہ اس نے کہیں باہر آ کھڑائی ہے۔“

”کیا اس نے کبھی کسی عورت کا نام بھی لیا تھا؟“

”نہیں.....“ صفدر نے جواب دیا۔

”لیکن..... صفدر صاحب جس طرح آپ نے کہا ہے کہ آپ بھی شفیق کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ کیا اس طرح مسئلہ حل ہو جاتا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب..... جب بہن روتی تھی تو مجھے غصہ آ جاتا تھا۔ ویسے اگر آپ کو شک ہے کہ میں نے ہی اپنے بہنوئی کو قتل کیا ہے تو آپ مجھے حوالہات میں بند

کر دیں اور اپنی تقیث کر لیں۔“ اچانک اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

میں ہنس پڑا اور صفدر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”صفدر صاحب اتنے جذباتی نہیں ہوتے۔“

پھر.....

میں نے اسے رخصت کر دیا۔

آہستہ آہستہ پردے اٹھ رہے تھے۔

میں صفدر سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا اور اسے مشکوک افراد کی فہرست سے خارج نہیں کیا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ باتیں چھپا رہا ہے۔

بہن پولیس والوں کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔

میں نے دو چار دنوں تک مقتول کی بیوہ سے ملاقات کرتی تھی۔ انھی مجھے پتہ چلا تھا کہ اس کی حالت اس قابل نہیں کہ اس سے تقیث فائدہ مند ہو سکے۔

اگلے دن اے ایس آئی واپس آ گیا۔ وہ پانچ بندوں سے تقیث کر آیا تھا۔ جیسے بندے کے متعلق پتہ چلا کہ جو پتہ اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں درج کروایا تھا۔ وہ پتہ غلط ثابت ہوا تھا۔

ان دنوں ہوٹلوں میں کمرہ دیتے ہوئے زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی تھی اور نہ شناختی کارڈ طلب کیا جاتا تھا۔

اب تو حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ بغیر شناختی کارڈ کے کمرہ دیا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ شناختی کارڈ دکھایا جاتا ہے اور کمرہ چھوڑنے پر واپس دیا جاتا ہے۔

لیکن اس..... دور میں بھی.....

جب معاملہ اس قسم کا ہوتا تھا تو ہم ہوٹل مالکان کی ایجنسی طرح خبر لیتے تھے۔ دو گھنٹے بعد میں اور سپاہی نوآمید ہوٹل میں موجود تھے۔

اور.....!

ہمارے سامنے ہوٹل کا منیجر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا نام بشارت تھا۔ اس نے ہماری خاطر تواضع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔

”ہاں تو بشارت صاحب آپ نے بغیر تحقیق کیے اور شناختی کارڈ چیک کیے بندے کو کمرہ کیوں دے دیا تھا۔“

میں نے اسے رخصت کر دیا۔

آہستہ آہستہ پردے اٹھ رہے تھے۔

میں صفدر سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا اور اسے مشکوک افراد کی فہرست سے خارج نہیں کیا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ باتیں چھپا رہا ہے۔

بہن پولیس والوں کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔

میں نے دو چار دنوں تک مقتول کی بیوہ سے ملاقات کرتی تھی۔ انھی مجھے پتہ چلا تھا کہ اس کی حالت اس قابل نہیں کہ اس سے تقیث فائدہ مند ہو سکے۔

اگلے دن اے ایس آئی واپس آ گیا۔ وہ پانچ بندوں سے تقیث کر آیا تھا۔ جیسے بندے کے متعلق پتہ چلا کہ جو پتہ اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں درج کروایا تھا۔ وہ پتہ غلط ثابت ہوا تھا۔

ان دنوں ہوٹلوں میں کمرہ دیتے ہوئے زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی تھی اور نہ شناختی کارڈ طلب کیا جاتا تھا۔

اب تو حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ بغیر شناختی کارڈ کے کمرہ دیا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ شناختی کارڈ دکھایا جاتا ہے اور کمرہ چھوڑنے پر واپس دیا جاتا ہے۔

لیکن اس..... دور میں بھی.....

جب معاملہ اس قسم کا ہوتا تھا تو ہم ہوٹل مالکان کی ایجنسی طرح خبر لیتے تھے۔ دو گھنٹے بعد میں اور سپاہی نوآمید ہوٹل میں موجود تھے۔

میں نے اسے رخصت کر دیا۔

آہستہ آہستہ پردے اٹھ رہے تھے۔

”قارئین اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی مجھے اس کے چونکنے کا انداز یاد ہے۔ یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ میرے ذہن میں کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ہوا میں تیر چلانے والی بات تھی۔“

”وہی بات ذوالفقار جو تم چھپا رہے ہو۔“

”لیکن جناب وہ..... وہ..... کوئی جرم والی بات نہیں ہے۔“

اس نے ہنوک نکتے ہوئے کہا۔

”اس کا فیصلہ ہم نے کرنا ہے تم بتاتے ہو یا.....؟“

”میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

اس نے بتایا۔ تو میں اچھل پڑا۔ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

بہر حال بات یہ پتہ چلی کہ ایک جوان نے اسے کچھ پیسے دے کر کہا تھا کہ مقتول پر نظر رکھنی ہے جو نہی کوئی عورت اس سے ملنے آئے اسے مطلع کیا جائے۔

اس نے ایک نوں نمبر بھی دیٹر کو دیا تھا۔

ہم نے ٹیلی فون نمبر اس سے لے لیا اور ہوٹل سے نکل آئے رستے میں سیاہی خورشید اور میں اس کیس کے سلسلے میں بات چیت کرتے رہے۔

ویٹر نے اس جوان کا حلیہ بھی بتایا تھا اس کے متعلق میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔ البتہ اتنا بتا دوں کہ ہوٹل چھوڑ کر جانے والا جوان نہیں تھا..... بلکہ ادھیڑ عمر تھا۔ تھانے واپس پہنچ کر پتہ چلا کہ ندیم (مخبر) آیا بیٹھا ہے۔ وہ اب تک کی حاصل شدہ معلومات میرے گوش گزار کر کے چلا گیا۔

ان کا ذکر ابھی مناسب نہیں..... اب انہی معلومات کی روشنی میں ہم نے آگے کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

ہی خورشید کی میں نے یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر جانے والے شخص کا خاکہ تیار کروائے۔

دو گھنٹے میں یہ کام بھی ہو گیا۔ ہوٹل سے تھانے میں واپس آتے ہی میں نے سپاہی دلاور کو بلا کر اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ جمیل (مقتول کے دوست) اور رفیق (مقتول کے بھائی) کو کہہ آئے کہ ذرا اندھیرا ہوتے ہی وہ تھانے میں آجائیں۔

اندھیرے میں بلانے کی وجہ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ یعنی میں مجرم یا مجرموں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جس وقت دونوں آئے اے ایس آئی رانا تو میرے کمرے میں بیٹھا حسب معمول سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔

ہم نے انہیں بٹھایا اور ان کو بلانے کا مقصد واضح کر دیا۔

”ہم ہر طرح حاضر ہیں۔ تھانیدار صاحب.....“

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”جمیل صاحب، شفیق (مقتول) آپ کا جگر ہی بار تھا۔ وہ آپ سے دل کی بات بھی کرتا ہوگا۔“ میں نے خبر ندیم سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔

”تھانیدار صاحب“ جمیل سے پہلے رفیق بول پڑا۔ شفیق مجھ سے صرف دو سال چھوٹا تھا ہم بھی دوستوں کی طرح تھے۔ وہ ہم دونوں سے دل کی ہر بات کرتا تھا۔

”مجھے پتہ ہے اسی لیے تو میں نے آپ دونوں کو اکٹھا بٹھایا ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ وہ دونوں میری طرف دیکھتے رہے۔

”اچھا.....“ میں نے ہنکارا بھرا اور کہا ”کیا واقعی..... پچھلے دو تین ماہ سے شفیق نے کہیں باہر دل لگایا تھا؟“

”نہ تو ہم نے بھی تھا۔“ جمیل نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔“

”تھک.....!“

میں سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن جس مقصد کے لیے میں نے سوال کیا تھا وہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ ساری معلومات تو مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔

”آپ لوگ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے..... میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شفیق اس معاملے میں کیا کہتا تھا؟“ میں نے اپنے سوال کی وضاحت کر دی۔

”اوہ..... تھانے دار صاحب، شفیق کے قتل نے تو ہماری مت ہی ماری ہے۔ وہ ہماری بات سن کر نہیں دیا۔ کرتا تھا۔ آخر ہمارے اصرار پر ایک دن غصے میں آ گیا تھا اور صرف اتنا کہا تھا۔

”سب کو اس ہے۔“

تھانیدار صاحب شفیق کو ہم نے اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جمیل نے جواب دیا۔ آخر میں اس کا لہجہ کھلی ہو گیا تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ایک لڑکا تھا تو دھڑلے کی طرف ضرور دیکھتا تھا اور بولتے وقت جم کا صیغہ یعنی ”ہم“ استعمال کرتا تھا۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوئی تھی کہ شفیق کے ساتھ دونوں بے تکلف تھے۔

”آپ لوگ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتے رہیں۔“ رانا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا اور جو بھی کوئی بات آپ کے علم میں آئے۔ ہم تک پہنچانے میں تاخیر نہ کریں۔“ انہیں رخصت کرنے سے پہلے ندیم مخبر سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہم نے ان سے سوالات کر کے اس بات کی تصدیق کر لی کہ تقریباً ساری معلومات صحیح ہیں۔

لیکن یہ بات راز میں ہی رہی کہ کیا واقعی شفیق بے راہروی کا شکار ہو گیا تھا۔

یہ بات بھی پتہ چلی تھی کہ شفیق کی بیوہ آج کل اپنے گھر میں ہی تھی ورنہ پچھلے ایک ماہ سے صفر (اس کا بھائی) اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ صفر کی بیوی روٹھ کر اپنے مکے میں پٹختی ہوئی تھی۔ وہ ٹھکڑا اور درخت طبعیت کا تھا۔

اس سارے معاملے میں رات کے دس بج چکے تھے۔

ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلے دن ہم نے مقتول کی بیوہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن.....!

اگلے دن وہ کچھ ہو گیا جس کی بالکل توقع نہیں تھی۔ میں ابھی آ کر اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ دو

سیاہی ایک جوان کو پکڑ کر لائے۔ اس نے چادر اور ڈھمی ہوئی تھی۔ اچانک اس نے چادر اتار دی۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے خون آلود تھے اور اس نے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھمپا پکڑا ہوا تھا۔

دفعاً اس نے زور لگا کر سپاہیوں کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور بولا۔

”میں مغرور یا بھگواڑا نہیں ہوں خود گرفتاری دینے آیا ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیں اور یہ ہالہ قتل۔ میں نے دوئل کیے ہیں۔“

پھر اس نے کپڑے کے تھیلے سے نکال کر جو کچھ مجھے دیا وہ ایک لمبے پھل والی (تصابوں والی) چھری تھی۔ وہ پرانے اخبار میں لپٹی ہوئی تھی اور اس پر لگا ہوا خون جم چکا تھا۔ ہم نے اسے باقاعدہ گرفتار کرنے سے پہلے اس کی رام کہانی سن لی اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔

یہ ایک عبرت ناک کہانی ہے اور اس کا زیادہ تر حصہ پہلے ہی ہمارے علم میں آ چکا تھا۔ ہم نے بعد میں مقتول



کی بیوہ غزالہ سے بھی ایک انٹرویو لیا تھا۔ ان سب باتوں کو شامل کر کے جو کہانی بنتی ہے وہ آپ کے گوش گزار کر دیتا ہوں۔

پہلے یہ بتا دوں کہ یہ جوان عامر تھا۔ جی ہاں مقتول کا بیٹا۔ کہانی سن کر آپ سمجھ جائیں گے کہ باپ کے مرنے پر وہ زیادہ غمگین کیوں نہیں تھا لیکن جب حقیقت اس پر آشکارا ہوئی تو.....

کسی شادی کی تقریب میں شفیق نے غزالہ (عامر کی موجودہ ماں) کو دیکھ لیا اور یہ لڑکی اس کے دل کو بھاگ گئی۔ دو چار ملاقاتوں (جن کا بندوبست مقتول کے دوست جمیل نے اپنے گھر میں کیا تھا) میں شفیق اور غزالہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ جدائی مشکل ہو گئی۔

لیکن رشتہ طے نہ ہو سکا.....! آخر ایک دن غزالہ شفیق کے پیچھے گھر سے نکل آئی اور انہوں نے عدالت میں جا کر لو میرج کر لی۔ جمیل اور رفیق نے ان کی بھرپور مدد کی۔

غزالہ کے والدین اور خاص طور پر اس کے بھائی نے اس بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ انہیں قتل کی دھمکیاں دیں۔ دونوں نے عدالت میں جا کر یہ بتایا کہ انہیں جان کا خطرہ ہے اور خاص طور پر صفدر سے۔

بہر حال عدالت نے انہیں قانون کے مطابق تحفظ فراہم کر دیا تھا۔ یہ قانونی معاملات ہوتے ہیں اس لیے میں اس پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھوں گا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

صفدر کو والدین نے باہر بھیج دیا اور خورد و خوراک کے بیٹھ گئے۔

صفدر چھ ماہ پہلے ہی باہر سے آیا تھا۔ وہ تقریباً اٹھارہ سال بعد آیا تھا۔ اس دوران خط و کتابت ہوئی رہی تھی۔ چھ سات بار وہ ملنے بھی آیا تھا۔ ایک ماہ کے لیے اور کسی

دو ماہ کے لیے۔ باہر بھیجنے سے پہلے اس کی شادی کر دی گئی تھی۔

ہر بار والدین نے اسے سمجھایا تھا کہ ہم غزالہ کو بھول گئے ہیں تم بھی بھول جاؤ.....

اس دوران اس کے تین بچے پیدا ہو چکے تھے۔ وہ غزالہ والے واقعے کو بھول چکا تھا یا نہیں اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اٹھ ماہ پہلے جب اس کے والدین ایک حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو وہ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے نہیں آ سکا تھا۔ اسے اطلاع مل چکی تھی۔ تقریباً دو ماہ میں اس نے وہاں کی نوکری چھوڑ کر واپس پاکستان آنے کا بندوبست کیا تھا۔

یہاں آ کر وہ والدین کی قبر پر جا کر بہت رو دیا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ چڑچڑاہو گیا تھا۔ غصہ بھی بڑھ گیا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا کرنے لگا تھا اور بات اس حد تک بڑھی تھی کہ دو ماہ سے اس کی بیوی اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس دوران دو باتیں ہوئی تھیں ایک تو اس کے تعلقات (جس کو ہم ناجائز تعلقات کہتے ہیں) ایک عورت شمشاد سے ہو گئے تھے۔ وہ ایک قریبی قصبے میں رہتی تھی۔

وہ اکثر اس کے سامنے روتا رہتا تھا اور یہ کہتے کہتے غصے میں آ جاتا تھا کہ غزالہ نے اسے اور اپنے والدین کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ شمشاد اسے تسلیاں دیتی رہتی تھی اور کہتی تھی اسے دُفع کر لیکن وہ کہتا تھا کہ اس کا دل کہتا ہے کہ دونوں کو قتل کر دے۔

شمشاد ایک بیوہ عورت تھی اور اسے صفدر سے (بقول اس کے) محبت ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ صفدر قاتل بن کر جیل میں چلا جائے۔ اس نے اسے کہا کہ کسی طرح غزالہ کے دل میں شفیق کے لیے نفرت کا بیج

بو دیا جائے اور اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کی جائے۔ یہ بات صفدر کو اچھی لگی۔ اس سے سناہٹ بھی مر سکتا تھا اور لاشی بھی محفوظ رہ سکتی تھی۔ شمشاد نے اپنی ایک تصویر ایک عورت کے ذریعے غزالہ تک پہنچادی اور کہا کہ وہ غفلت کی نیند سوئی ہوئی ہے۔ اس کا خاوند جس کے لیے اس نے گھر بار چھوڑا تھا۔ اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مٹاتا ہے۔ غزالہ نے تصویر چھپا کر رکھ لی۔ یہ بات سب کو پتہ تھی کہ شفیق ہوئے جاتا ہے اور کئی راتیں اور دن وہاں گزارتا ہے۔ عقل کی اندھی عورت نے اس بات کا رنگ بھی اپنے شک کے اوپر چڑھا لیا اور خاوند کو ایک دن اس طرح مشتبہ بٹھالیا جس طرح ہم بٹھائے ہوئے ہیں شفیق نے غزالہ کو دل و جان سے چاہا تھا اور وہ کسی اور طرف دیکھنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن یہ بات بھی ان کے درمیان کسی رنجش کا باعث نہیں بنی تھی۔ جب غزالہ نے اس پر شک کیا تو وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے شک کی وجہ پوچھی..... لیکن اس نے تصویر نہیں دکھائی۔ اس کا تو دماغ خراب ہو گیا تھا اور شاید پہلی بار اس بات کا اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنے ماں باپ اور بھائی کی عزت اپنے پاؤں تلے روند دی تھی اور جس شخص کی خاطر وہ گھر سے نکل آئی تھی وہ ایسا نکلا تھا۔

مختصر یہ کہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ وہ صوبہ احتیاطیں بالائے طاقت رکھ کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی اور اسے کہا کہ یہاں سے گھر میں رکھ لے یا قتل کر دے۔ وہ اب ایک بلکہ اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

صفدر تو پہلے ہی اس بات کا منتظر تھا۔ اس نے پہلے تو اسے شرمندہ کیا اور پھر شفیق کو دو چار گالیاں دے کر کہا کہ وہ یہاں رہے ہیں شفیق کو کوئی کیوں گا۔

عامر جوان تھا باشعور تھا جب سارے حالات کا اسے علم ہوا تو اس نے منت سماجت کر کے تصویر اپنی

ماں سے لے لی اور کہا کہ وہ یہیں رہے ہیں خود سب کچھ دیکھ لوں گا۔ ہوئے میں جا کر اس نے ویدر سے بات کی تھی کہ اگر کوئی عورت ملے آئے تو اسے مطلع کیا جائے۔ یہیں ٹیلی فون نمبر کے متعلق تحقیقات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

بہر حال ایک دن تصویر والی عورت اسے نظر آ گئی اس نے اس کا تعاقب کیا اور اس کا گھر دیکھ کر واپس آ گیا۔ پھر اس نے قصا ہوں والی ایک چھری خریدی اور اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک فلم میں اس نے دیکھا تھا کہ ہیرو نے چھری اپنی ٹانگ کے ساتھ باندھی ہوئی ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

دو دن بعد وہ رات کے پچھلے پہر دیوار بھاند کر شمشاد کے گھر میں گھس گیا۔ ایک کمرے میں نئی مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے دروازے کو دھک دیا وہ اندر سے بند نہیں تھا جب کسی کا دقت پور ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ماسوں اور وہ عورت فطری لباس میں ایک پٹنگ پر سوار ہے ہیں۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے ایک ایک ٹھوکہ مار کر ان کو جگادیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ شمشاد نے بستر کی چادر سے اپنا جسم ڈھانپنا چاہا لیکن عامر نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ پھر اپنے ماسوں کی شہہ رگ پر چھری رکھ کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ”یہ سب کیا ہے مجھے صرف سچ چاہیے ورنہ.....“

صفدر نے شمشاد کی طرف دیکھا۔ وہ پٹنگ کے ایک کونے میں کٹمی بیٹھی تھوڑے کپڑے پہنی تھی اور اشارہ کر رہی تھی صوبہ کچھ بتاؤں صفدر نے سب کچھ بتا دیا۔ عامر کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا اور پھر وہ ہوا جو پاگل پن کے ان لحظوں میں ہوتا ہے۔ اس نے چھری کے متعدد وار کر کے دونوں کی آنتیں باہر نکال دیں۔ گھر میں اسے اخبار اور کپڑے کا تھیلہ مل گیا۔ اس

نئے افق 122 مئی 2013ء



چلنے والی گاڑیوں کا شور چلتا اور دکان پر چلنے والے میوزک کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسے اٹھ کر گھبراہٹ سے دیکھ کر پڑی، پہل صاف کرنا ہوتا، دودھ والے برتن میں بیچ بھاتا، کسی گاہک کے لیے سامنے کی دکان سے سگریٹ لاتا۔ استاد کے گھر کوئی سامان پہنچاتا۔ استاد کے لیے کھانا لے کے آتا۔ مگر وہ سارے کام ایک روٹ کی طرح کرتا۔ دھیان اس کا ہمیشہ اپنے برتنوں کی طرف رہتا۔ اسے ہمیشہ ایک دھچکا لگا رہتا کہ کوئی اس کے برتنوں کی ترتیب خراب نہ کرے۔ کوئی برتنوں میں سے ایک کپ ادھر سے ادھر نہ کر دے اور جب بھی وہ کسی کام سے واپس برتنوں کی طرف آتا ان میں سے آدھے برتن وہاں سے غائب ملتے اور ان کی جگہ گندے برتنوں نے لی ہوئی۔ کئی دفعہ جب کوئی گاہک دکان کے اندر داخل ہوتا تو وہ گاہک کو کھانا اب برتن اٹھ جائیں گے اور ترتیب اس کی مرضی کی نہ رہے گی۔ اسے برتنوں سے لگاؤ ہو چکا تھا۔ شاید یہی واحد چیز تھی جو اس کی دسترس میں تھی۔ ویسے بھی شروع ونوں میں جب اس سے ایک گلاس ٹوٹا تھا تو استاد نے اسے زور دیا پھینک مارا اور نئے انداز کی گالیاں سنائیں۔ تھپڑ اور گالیاں شاید اسے اتنا تنگ نہ کرتیں۔ یہ تو وہ ماں کی گود سے سنتا آ رہا تھا۔ مگر استاد کی ہمت کی کہ اسے کام سے نکال دے گا، اس پر اثر کر گئی اور اس کے نزدیک برتنوں کی اہمیت بڑھ گئی۔

☆☆☆.....

وہ کام سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید یہاں اس کی دلچسپی کا سامان تھا۔ وہ اپنے گھر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اسے کام پر آئے ہوئے یہ دوسرا مہینہ

ہی تھا۔ پہلے وہ گھر پر ہی رہتا۔ گھر میں اس کے علاوہ اس کے چھ بہن بھائی بھی رہتے تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اور کچن برائے نام تھا۔ یہاں سے وہ گلی میں نکلتا جہاں پانی کی پائپ لائن جمع رہتا اور بمشکل گزرنے کی جگہ ہوتی وہاں سے نکل کر وہ بڑی گلی کی کھڑ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ جہاں سے اس کا باپ اسے گالیاں دیتا اور مارتا پھر گھر واپس لے آتا۔ اس کے گھر میں صرف اس کی ماں کام کرتی تھی۔ وہ روزانہ صبح نکل جاتی اور ساتھ والے محلے میں کچھ گھروں میں کام کرتی۔ دوپہر کو گھر واپس آتی اور آتے ہوئے گھروں سے کچھ کھانے کا سامان لے آتی۔ طرح طرح کے کھانے ملتے جو وہ اور اس کے باقی بہن بھائی کھاتے۔ ماں پھر کام پر چلی جاتی اور شام ڈھلے گھر واپس آتی۔ وہ اپنی ماں سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ رات کو وہ اور اس کے باقی بہن بھائی ایک بڑی چار پائی پر سوتے جہاں ساری رات وہ اپنی جگہ بنانے کے لیے کہنیاں اور ناگوں کے ذریعے دوسروں کو ڈھیلے۔ کئی دفعہ وہ چار پائی سے گرا اور پھر کچے فرش پر ہی سو بارہا۔ دن میں ایک دفعہ کھانے کو ملتا اور کبھی کبھی تو بس ماری پڑتی۔ جب کبھی گھر سے نکل کر محلے میں جاتا تو اسے سارے لوگ اپنے جیسے ہی ملتے۔ کہیں کوئی بیٹھا نشہ کر رہا ہوتا۔ کہیں کوئی ماں اپنے بچے کو مار رہی ہوتی۔ کہیں ہٹنے کی آواز، کہیں لڑائی، کہیں رونے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ایک دن اس کی ماں بیمار تھی اور کام پر نہ جا سکی۔ اس دن ایک صاحب اور ان کی بیوی ان کے گھر آئے۔ اتنے صاف کپڑے پہنے ہوئے اچھے لوگ اس نے پہلی دفعہ دیکھے۔ اس سے پہلے اس نے اپنے لوگ شاید محلے کی دکان پر لگے

دی پروکھے ہوں۔ مگر ٹی وی تو بچ نہیں ہوتا۔ یہ تو بچ میں ایسے لوگ تھے۔ وہ ان کے جانے تک انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اپنی ماں سے ان کے بارے میں پوچھا۔ مگر ماں نے اس کی بات ان سنی کر دی اور ڈانٹ سنا دی کہ فضول سوال نہ کیا کرے۔

☆☆☆.....

ہر روز صبح جب وہ گھر سے نکلتا تو گلی کی کھڑ پر بیٹھ کر بڑے لڑکوں کی باتیں سنتا۔ وہ اکثر کہتے کہ ”میں کام پر جا رہا ہوں۔ آج کام سے دیر ہو گئی۔ آج کام پر جلدی جانا ہے۔ آج کام سے جلدی واپس آؤں گا۔“ لڑکوں کی آواز میں کھٹک اور ان کی جلدی کو دیکھ کر ان پر رشک کرتا۔ جب وہ انہیں شام کو کام سے واپس پر دیکھتا تو ان کے چہرے کی چمک اس کے دل میں کام پر جانے کی خواہش اور بڑھادی۔ وہ اکثر ان کی باتیں پوری توجہ سے سنتا۔ اس طرح دن بدن کام کے بارے میں اس کا شوق اور تجسس بڑھتا گیا۔ وہ ان لڑکوں کو حسرت سے دیکھتا رہتا، جو صبح کھانے کی پوٹی ہاتھ میں لیے تیز قدموں سے کام پر نکلتے اور شام کو خراپاں خراپاں گھروں کو واپس لوٹتے۔ جیسے پرانے وقتوں میں سپاہی جنگوں کے بعد تھکے بارے مکر سردار نے قبیلوں میں واپس لوٹتے۔ وہ اپنی خواہش کسی کو بھی نہ بتا سکا۔ بتاتا بھی تو کسے بھائی تو اس سے چھوٹے تھے۔ ماں اسے گھر پر ملتی ہی نہ تھی اور باپ کے سامنے آتے ہی گالیاں اور تھپڑ پڑتے۔ لہذا وہ گھر آ کر کونے میں دبک جاتا اور اگر باپ نہ ہوتا تو چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھینا شروع کر دیتا۔ ایک دن اس کے اصرار پر اس کی ماں اسے اپنے ساتھ ایک گھر میں لے

گئی اور رستے میں اس کی ماں نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے پروفیسر صاحب کے گھر پر لے کر جائے گی۔ ”صاحب بڑے اچھے انسان ہیں وہ اپنے بچوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان سے بڑا پیار کرتے ہیں وہ گھر میں ایک طرف بیٹھا رہے کوئی چیز نہ مانگے اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے بیگم صاحبہ جلدی غصہ میں آ جاتی ہیں۔“ اسے ماں کی باتوں کی سمجھ نہ آئی۔ خاص طور پر بچوں سے پیار کرنے والی بات۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ بھلا بچوں سے وہ کیوں پیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ان کے بچے کام پر جاتے ہوں اس لیے پیار کرتے ہوں۔ پروفیسر صاحب کے گھر اس نے دیکھا کہ ان کے بچے کسی چیز کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کوئی کھلونا تھا جسے وہ توڑتے اور پھر جوڑتے۔ وہ دور سے بچوں کو کھیلنے دیکھتا رہا۔ رنگ برنگے بلاک علیحدہ ہو کر کارپٹ پر گرتے۔ پھر ان میں سے ایک بچہ ماہرانہ انداز میں تھوڑی کوشش کے بعد اسے جوڑتا۔ جس پر باقی بچے شور مچاتے اور خوشی کا اظہار کرتے۔ بیگم صاحبہ اپنے اس بچے پر فخر کر رہیں اور باقیوں کو ڈانٹتی کہ تم نکلے اسے جوڑ نہ سکے۔ باقی بچے اس بچے کی ہدایات غور سے سنتے مگر جوڑ نہ سکتے۔ اس کا نئی دفعہ دل چاہا کہ ان سے یہ کھلونا چھین کر بھاگ جائے اور گھر جا کر اسے جوڑ لے۔ مگر ماں کی طرف دیکھ کر وہ ارادہ بدل لیتا۔ گھر واپسی پر اس نے ماں سے اس کھلونے کے متعلق پوچھا تو ماں نے اسے بتایا کہ پروفیسر صاحب اپنے بچوں کے لیے ایسے کھلونے لاتے رہتے ہیں۔ کل وہ اپنی بیگم سے کہہ رہے تھے کہ یہ کھلونا بچوں کو کھیلنے کو دو اس سے بچے بہت سیکھتے ہیں۔ بتا

# کیا آپ شوگر سے نجات چاہتے ہیں؟

اس دنیا میں آج کل بھلا کون سا ایسا نادان انسان ہوگا جو شوگر سے نجات نہ چاہتا ہو۔ شوگر کی وجہ سے انسانی جسم اندر ہی اندر بے جان، بے کار، کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ شوگر کی وجہ سے اعصابی کمزوری بھی ہو جاتی ہے۔ شوگر کے عارضی، وقتی علاج سے اجتناب کریں۔ ہم نے شوگر کا مستقل حل ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ صرف خالص قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا ہے۔ آج ہی فون کر کے بذریعہ ڈاک شوگر کورس وی پی VP منگو لیں۔

## دارالشفاء المدنی

(دبئی لبنی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0334-9392646

0300-7522987

فون دوپہر 12 بجے سے شام 6 بجے تک کریں

ہے۔ ہر کوئی اسے مشورہ دیتا ہے اور ہر کوئی اس کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے۔ ہر کوئی اس کی مزاج پر سی کرتا ہے اور اس سے امیدیں رکھتا ہے اور وہ خود اندر سے ڈر رہتا ہے کہ اگر وہ جیت گیا تو کل اس سے زیادہ توجہ ملے گی اور اگر ہار گیا تو سارے لوگ ہار کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرائیں گے۔ جیت انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ شاید انسانی زندگی کا کاروبار ہار کے خوف سے ہی چلتا ہے اور ہارنے کا خوف ہی ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ اس رات سوتے وقت اس نے کسی چیز کو نہ توڑا۔ شاید وہ اس کھیل سے ڈر گیا تھا یا ہر دفعہ استاد کا چہرہ اسے اس کھیل سے دور رکھتا۔ وہ خیالوں میں گم رہا خوشی اور خوف کی ملی جلی کیفیات میں رہا۔ کبھی ہاتھوں میں کھانے کی پوٹی تھا سے سفید گھوڑے پر نیٹھے کام پر جا رہا ہوتا۔ راستے میں کھڑے لڑکے اس کی طرف لیلیائی نظروں سے دیکھتے۔ محلے کی عورتیں باقی لڑکوں کو اس کی مثال دے رہی ہوتیں۔ شام کو کندھے پر خنروٹ اور کھلونوں کے بھرے ہوئے کنستریلے گروا پس گھر لوٹتا تو سارا گھر گلی کی کٹڑ پر کھڑے اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔ کھلونے رکھتے ہی وہ بیگ کھولتا اور کھلونے نکال کر سارے بہن بھائیوں کو ان کا استعمال سکھاتا۔ محلے کے بچے چھت پر آ جاتے۔ سارے بچے پوری آنکھیں کھول کر اسے ایسے سنتے اور دیکھتے جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دائمی زندگی کا نسخہ دے رہا ہو۔ وہ کسی بھی معمر کو حل کرنے کے بعد جب کھلونے میں موجود ہلاک جوڑ دیتا تو فخر سے ہاتھ ہوا میں بلند کرتا اور بانی بچوں سے داد و تحسین وصول کرتا۔ اسی دوران استاد زوردار دھماکے کی

چٹکی بھرتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ہونا سمجھنے لگا جو دیو کے گھر میں گم ہو گیا ہے۔ خوف کی وجہ سے اس نے وہاں سے بھاگنے کا سوچا مگر اسے بعد میں اندازہ ہوا کہ اس کے باپ نے اسے دیو چاہا ہے۔ واپسی پر اس کے باپ کا رویہ مشفقانہ رہا۔ اسے ایک دوکان سے جلیبی بھی لے کر دی اور اسے سمجھایا کہ ”وہ دل لگا کر کام کرے۔ استاد کی ہر بات ماننے کا بکوں کا دھیان کرے۔ صبح سب سے پہلے کام پر پہنچے اور شام کو استاد کے ساتھ دوکان بند کر کے آئے۔ آج کل کام بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ تو استاد ہے جس نے ہمارے اوپر احسان کر دیا ورنہ کون کام پر رکھتا ہے۔ دیئے بھی اتنی مہنگائی ہے۔ تمہاری ناں اب تھک جانی ہے۔ اب تم کام کرو پیسے کماؤ۔“ وہ رستہ بھر سوچتا رہا کہ کام اگر اتنا ہی ضروری ہے تو اس کا باپ کام پر کیوں نہیں جاتا۔ مگر وہ باپ سے یہ سوال پوچھنے کی جرات نہ کر سکا۔

☆☆☆.....

اس شام اسے کھانا بھی باقی بہن بھائیوں سے زیادہ اور سب سے اچھے گھر سے لایا گیا دیا گیا۔ اسے گالیاں بھی نہ سننی پڑیں اور ماں نے بھی اسے پیار کیا۔ باقی بہن بھائی اس کی طرف حسد کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس رات اس کے باپ اور ماں نے بھگڑا بھی نہ کیا۔ محلہ بھی پرسکون رہا۔ اپنا گھر کھلا اور چار پائی ضرورت سے زیادہ محسوس ہوئی۔ آج سارا دن مارنے پڑنے کی وجہ سے بدن بھی نہ دکھا اور نہ ہی کسی بہن بھائی نے اسے کہنی سے دھکیلنے کی کوشش کی..... اس کی حالت کسی ٹیم کے کپتان کی سی تھی جو فائنل فٹ بال کھیلنے سے پہلے رات کو سب کی توجہ کا مرکز ہوتا

نہیں کیا سیکھتے ہیں۔ مگر بچے کل سے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے ماں سے کوئی سوال نہ کیا۔ مگر سارا راستہ اس کھلونے کے متعلق سوچتا رہا۔ اس شام اس کا دل چاہا کہ گھر میں موجود ہر چیز کو توڑے اور دوبارہ جوڑے۔ مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ کچھ چیزیں توڑنے کے بعد جوڑی نہیں جاسکتیں۔ رات سوتے وقت وہ گھر کی چھت توڑتا اور جوڑتا رہا اور ساتھ ساتھ چار پائی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے کے ایک کونے میں اس کا باپ اس کی ماں کو کسی بات پر کوس رہا تھا۔ مگر ایک بات سن کو وہ چونکا اور کان باپ کی طرف لگا دیئے۔ اس کا باپ اسے کام پر لگانے کی بات کر رہا تھا۔

☆☆☆.....

دوسرے دن صبح اس کا باپ اسے ساتھ لے کر گلیوں سے ہوتا ہوا۔ بازار گیا اور بسوں کے اڈے کے قریب ایک دوکان پر لے آیا۔ وہاں اس کی ملاقات استاد سے ہوئی۔ استاد کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے باپ جیسے اور لوگ بھی دنیا میں رہتے ہیں..... استاد بات کرتے ہوئے ہاتھ پر تل لاتا۔ بڑی مونچھیں اوپر اٹھاتا، پہلے دانت باہر نکالتا اور بات کرتے ہوئے زور سے بولتا۔ اس کے باپ نے بڑی منت سماجت سے اسے کام پر لگوادیا۔ اسی دوران وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اسے دیکھ کر ہنستے، کئی لوگوں نے اسے تھپکی بھی دی۔ اسے ایسے لگا جیسے اسے کسی بڑی جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا ہو۔ میدان میں شیر ہوں اور لوگ اسے دھکیلنا چاہ رہے ہوں اور کبھی کو پتا ہو کہ وہ اس جنگ میں مار جائے گا۔ کوئی اسے سر سے پکڑ کر گھمانے کی کوشش کرتا۔ تو کوئی



آواز سے اسے بلاتا اور وہ آنکھ کھول کر بیٹھ جاتا۔ انہی خیالات میں اس نے ساری رات گزار دی۔ صبح سویرے اس کے باپ نے اسے جگایا اور ساتھ لے کر کام دانی دکان پر چھوڑ دیا۔ وہاں اسے اپنی عمر سے زیادہ ایک لڑکا اور ملا۔ دونوں نے ایک دوسرے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد استاد نے اپنے پاس بلایا اور اسے ٹیبل صاف کرنے کا کام دیا۔ دوسرے دن اسے برتن دھونے کا کام سکھایا گیا۔ تیسرے دن وہ گاہکوں کو چائے دینے لگ گیا۔ وہ چائے دینے کے علاوہ گندے برتن ٹیبل سے اٹھا کر دھونے والی جگہ پر بھی رکھتا۔ سارے میزوں پر کپڑا لگاتا۔ دکان میں جھاڑو دیتا۔ کرسیاں اپنی جگہ پر رکھتا۔ پانی کے جگ اور گلاس بدلتا ان میں پانی بھرتا۔ گاہکوں سے پیسے لے کر کاؤنٹر پہ جمع کر داتا۔ کبھی کبھی کوئی گاہک اسے سکے دیتا جسے وہ لیک کر پڑ لیتا۔ ایک دن استاد نے اسے دوسرے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر سامان پہنچانے کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد یہ بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا۔ روز صبح وہ منہ اندھیرے گھر سے نکلتا مگر گھر سے آتے وقت اسے کوئی کھانا نہ دیتا۔ نہ ہی اس وقت گلی میں کوئی موجود ہوتا اور نہ ہی وہ کسی کو دیکھتا۔ اسے جلدی پہنچنا ہوتا تھا۔ شام کو تھکا ہارا واپس آتا تو آتے ہی اس کا باپ اسے کسی نہ کسی بات پر مارنا شروع ہو جاتا۔ رات بدن سہلاتے، کہنیوں کے دھکے سبتے وہ سو جاتا۔ اسی طرح وہ کام کا عادی ہو گیا اور اس نے کام میں ہی اپنی دلچسپی کے سامان ڈھونڈنا شروع کر دیے۔ مختلف قسم کے کھیل ایجاد کر لینے اور مختلف کرداروں سے شناسائی پیدا کر لی۔ گھر سے

جاتے ہوئے وہ دروازے کو الوداع کہتا۔ راستے میں موجود دکانوں کو گنتا۔ گزرنے والی گاڑیوں کے رنگ یاد رکھتا اور دکان کی مختلف چیزوں کے ساتھ دن بھر کھیلتا۔ گھر آتے ہوئے ڈنٹا اور چوڑوں کی طرح گھر داخل ہونے کے بعد چارپائی پہ چلا جاتا۔ دن میں استاد اسے اپنے گھر بھیجتا تو وہ سامنے اختر کے مزار پر ہو کر گزرتا جہاں لڑکے کھیل رہے ہوتے۔ وہ ایک لمحے کے لیے وہاں رکتا۔ گزلیٹ ہو جانے کے ڈر سے فوراً وہاں سے نکلتا جیسے استاد اس کے پیچھے آ رہا ہے اور اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اس سارے عرصے کے دوران استاد کا ڈور دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ دوسرے لڑکے نے بھی استاد کی بہت سی کہانیاں سنا لیں کہ ”استاد بہت ہی سخت ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی مارتا ہے۔ اس سے پہلے وہ یہاں کام کرنے والے کئی لڑکوں کو نکال چکا ہے۔“ اسے مار اور گالیوں کا اتنا ڈر نہ تھا مگر کام سے نکالے جانے کے خوف سے وہ لرز جاتا۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کام کے دوران وہ استاد کے رویے کا مشاہدہ کرتا رہتا، جب کبھی کسی بات پر استاد قہقہہ لگاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بازار ہنس رہا ہے۔ اگر استاد غصے میں ہوتا تو وہ چھپتا پھرتا اور اس کے ہاتھ کاغیا شروع ہو جاتا۔ پہلے مہینے میں ہی کام کے دوران اس سے ایک گلاس ٹوٹ گیا جس پر استاد نے اسے نئی طرز کی گالیاں دیں اور گال پر زور کا کھپڑ رسید کیا۔ اس رات اسے اپنی گال سوجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس دن سے وہ کام پر جانے والوں کے گالوں کو غور سے دیکھتا رہتا۔

☆☆☆

مہینے کے آخر میں استاد نے اسے تین سو

روپے دیے۔ وہ بیسوں کو لیتے ہوئے چکرارہا تھا۔ پیسے لینے کے بعد وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہا اور گنتا رہا۔ پھر اس نے انہیں مردو کرتہ درتہ شلوار میں لپیٹ لیا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ لوگ پیسے چھین لیتے ہیں۔ وہ دکان سے نکلا اور لوگوں سے چھپتا چھپتا، رستہ بدلتا بازار سے گزرا۔ اسے ایسے لگا جیسے ہر گزرنے والا جانتا ہے کہ اس کے پاس تین سو روپے ہیں اور وہ اس سے پیسے چھین لے گا۔ راستے میں کسی دکان پہ رکتا۔ چیزیں دیکھتا۔ تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی اور خود کو اپنی عمر سے بڑا محسوس کرتا کہ اب وہ چیزیں خرید سکتا ہے۔ پیسے کما سکتا ہے۔ آزادی کا خیال آتے ہی اسے اپنا آپ اور مضبوط لگا۔ کئی دفعہ اس نے رک کر مختلف اشیاء کی قیمتیں معلوم کرنا چاہی۔ مگر باپ کا خیال آتے ہی شلوار میں موجود بیسوں کو دوبارہ چیک کرتا اور دکان سے دوری اختیار کر لیتا۔ انہیں خیالوں میں وہ گھر پہنچا۔

☆☆☆

اس کی ماں نے پہلی دفعہ اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ اسے اس پیار کی حرارت اپنی روں روں میں محسوس ہوئی۔ ایسے لگا جیسے آسمان سے چاند والی بڑھیا اتر کر اس کی بلائیں لے رہی ہے۔ اس رات پہلی دفعہ اسے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ اور دل لگا کر کام کرنا شروع ہو گیا۔ مگر کام میں دلچسپی کے باوجود اس کا جوڑ توڑ والے کھیل کے بارے میں شوق کم نہ ہوا۔ بلکہ وہ روز بروز بڑھتا گیا۔

وہ روز کسی نئی چیز پر اپنی مہارت آزمانے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی دفعہ ٹوٹے ہوئی برتنوں کو جوڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہی ہوئے پلٹوں کو

حادثہ جہاں تکلیف دہ ہوتے ہیں وہیں یہ زندگی کا رخ موڑنے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔  
ایک دلہن کے آگ میں جھلس جانے کا قصہ اس کا حسن شوہر کو متاثر نہ کر سکا تھا مگر اس کے جھلسے ہوئے چہرے نے اس کو دیوانہ بنا دیا۔  
ہمارے اپنے معاشرے کا احوال ایک سچی کہانی

آگ کے شعلوں نے بانو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کی چیخیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں چیخوں کی آواز سن کر محلے دار دوڑے چلے آئے تھے مگر بانو کی سانس اور سر ابھی تک اونچی آواز کیسے لی دی پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھنے میں مگن تھے ایک دو بار چیخنے چلانے کی آوازیں ان کے کانوں میں بھی پڑیں لیکن وہ پروگرام دیکھنے میں اس قدر مگن تھے کہ انہوں نے کسی ان سنی کر دی۔ جب بانو کی چیخوں کے ساتھ محلے داروں کی چیخ و پکار بھی شامل ہو گئی تو انہوں نے یہ جاننے کے لیے کہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں ٹی وی کی آواز کم کر دی آواز کم ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ چیخ و پکار تو ان کے قریب ہی ہو رہی تھی انہوں نے ٹیلی وژن بند کیا اور دونوں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔

وہ دونوں اپنے بیڈ روم سے باہر آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے کچن کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور سب کی نگاہیں کچن کے اندر لگی ہوئی تھیں کچن کے دروازے اور کھڑکیوں سے دھواں نکل رہا تھا وہ چیخنے چلاتے لوگوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو کچھ لوگوں نے انہیں پکڑ لیا اور آگے جانے سے منع کر دیا۔

بانو فرس بے ہوش پڑی تھی آگ ابھی تک اس کے کپڑوں کو لگتی ہوئی تھی کسی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوری طور پر گیس کی مین سپلائی

جیرانگی سے تک رہے تھے۔ وہ میگا کی انداز میں بلاک پکڑتا اور ان کو جوڑ کر رنگ برنگے کھلونے بنا دیتا۔ ہر دفعہ جب وہ کھلونا بناتا تو سارے بچے تالیاں بجاتے جنہیں سن کر وہ اور اونچا ہوتا گیا۔

اتنی دیر میں ایک دیونودار ہوا جو اس سے بہت اونچا تھا۔ جوں جوں دیو قریب آتا گیا۔ اس کی سیاہ مونچھیں اور پیلے دانت بڑے ہوتے گئے۔ پھر آہستہ آہستہ دیو استاد کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے ارد گرد مختلف آوازیں بڑھنے لگ گئیں۔ یکدم بچے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ دیو کے ساتھیوں نے لے لی۔ کچھ بانوس آوازیں اس کے کانوں سے نکلنے لگیں۔ کچھ ہاتھ اس کی طرف بڑے۔ ہاتھوں کے علاوہ کچھ دوسری چیزوں کے نکلنے کی آوازیں آتی گئیں۔ اس کی ماں اور باپ کا جھگڑا اور بڑھتا گیا۔ پورا محلہ چیخنے لگ گیا۔ بہن بھائی۔ کہنیوں سے اور زرد لگانے لگ گئے۔ فرش پر بھی شیشے کے ٹکڑے جیسے شروع ہو گئے۔ اندر والی بڑھیا ڈانسن کی شکل اختیار کر گئی۔ اس رات زور کی آندھی چلی۔ لاشیں کی روشنی مدھم رہی۔ موٹروں کی آوازیں، گاہکوں کی آوازیں کی طرح بڑھتی رہیں مگر صبح تک ساری کرسیوں کو جوڑ کر اس نے ٹرے کو واپس اپنی اصلی حالت میں رکھ دیا اور جوڑنے کے بعد اس نے زور کا غرہ بلند کیا۔ اس کی آواز اور جوش سے سارا محلہ جاگ اٹھا۔ اس کی خوشی پر وینس صاحب کے بچوں سے بہت زیادہ تھی جو آسان سا کھلونا جوڑ کر خوش ہوتے رہے۔



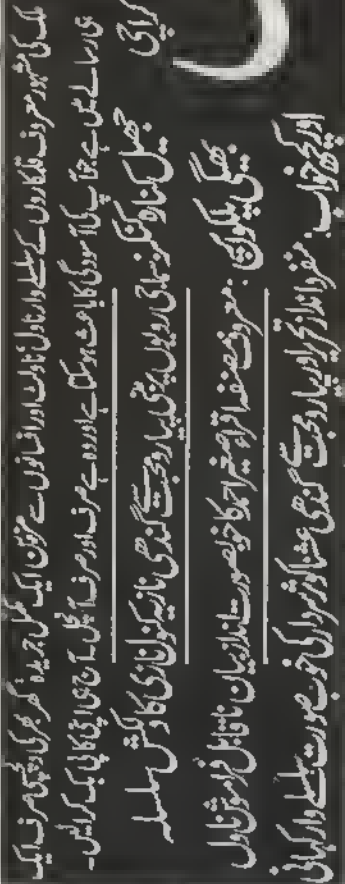
دوران وہ پرانی ٹرے کو ہی استعمال کرتا اور نئی کو برتنوں کی الماری میں ہی رکھتا۔ استاد کے کہنے کے باوجود وہ ٹرے نہ نکالتا۔

اس کے ذہن میں اس ٹرے کے بارے میں کئی طرح کے خیالات گردش کرتے رہے کہ وہ اسے کہیں اونچی جگہ پر سجادے یا گھر لے جائے۔ مگر سب سے غالب ٹرے کے ٹوٹنے اور جڑنے کا خیال تھا۔ وہ سوچتا کہ کسی طرح یہ ٹرے ٹوٹے اور وہ پھر اسے جوڑے۔ اس خیال نے کام سے توجہ ہٹا دی۔ کئی دفعہ استاد نے اسے ٹوکا۔ بلایا سمجھایا۔ گھر بھیجے کہ کبھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور کام بھی کرتا رہا۔ مگر ساتھ ساتھ اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔

☆☆☆☆

اس دن دو پہر کو گاہکوں کا رش عام دنوں سے زیادہ تھا۔ استاد بھی اس بات پہ کافی خوش دکھائی دیا جو کہ بات بات پر تھپتھپ لگا رہا تھا۔ اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ کانپتے ہوئے اس نے دو کپ ٹرے میں رکھے اور ایک نیبل سے جان بوجھ کر ٹکرا گیا اس کا یہ قدم کسی خود کش حملے سے کم نہ تھا۔ اس کے گرتے ہی ٹرے کرسیوں میں بدل گئی۔ رنگ برنگی کرچیاں۔ مختلف رنگ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ ہولے ہولے وہ رنگ ایک محلول میں مل گئے۔ محلول پھر مادہ شکل اختیار کرتا گیا اور چھوٹے چھوٹے بلاک بننے لگے۔ کسی بلاک پر آدھا پتا تھا تو کسی پر بیل کا تنا۔ کسی پر کسی جانور کا کان اور کسی پر سرخ ٹوپی ابلے کپڑے پہنے ہوئے بچوں کا ایک ہجوم اس کے ارد گرد کھڑا تھا۔ وہ اپنے قد سے بہت اونچا لگنے لگ گیا۔ بچے اس کی طرف تجسس اور





ہر چہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون: 35620771/2

اسپلنڈر کی سولی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھی کہ ہونہ ہونم  
لوگوں نے بانو کو جلایا ہے کیونکہ وہ دونوں ہی اس وقت

ہوئے عمرِ فاطمہ اور قدیر کے نام لکھوا دیے تو انہوں نے کاروائی کا آغاز کر دیا وہ ابتدائی تقیش کے لیے فاطمہ اور قدیر کو ایک الگ کمرے میں لے گئے تاکہ

یہ بات سبھی کے علم میں تھی کہ عمر کو نیورٹش میں اپنی کلاس فیلو مہوش کو پسند کرتا تھا اور اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر عمر کے والدین نے اس کے لیے بانگو کو

گھر میں موجود تھے جبکہ عمر اپنے دفتر گیا ہوا تھا۔ انسپکٹر ایک کے بعد دوسرا سوال کر ڈالتا اس کے چہرے ہونے سوالوں کا جواب فاطمہ اور قدیر سے نہیں بن یا رہا تھا وہ کسی طرح انسپکٹر سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے تھے لیکن اس کے آگے ان کی ایک نہیں چل رہی تھی۔

عمر پریشانی کے عالم میں باہر کھڑا تھا پریشانی کے ان لمحات میں اسے حوصلہ دینے والا کوئی نہیں تھا اس کے سسرال والے ایک طرف منہ پھلائے بیٹھے تھے جو محلے دار بانو کے ہمراہ موٹر سائیکلوں پر اسپتال آئے تھے وہ بھی کچھ دیر بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ عمر کی ایک نظر آپریشن تھیٹر کے دروازے پر لگی ہوئی تھی اور دوسری نظر اس دروازے پر لگی تھی جہاں اس کے والدین انسپکٹر کے سوالات کا سامنا کر رہے تھے۔

جب کافی دیر گزر گئی اور عمر کے ماں باپ میں سے کوئی بھی باہر نہ آیا تو اس کی پریشانی بڑھ گئی اور اس سے مزید صبر اور انتظار نہ ہو سکا اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اس کی والدہ آنسو بہا رہی تھی اور والد انسپکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑے فریادی بنا کھڑا تھا وہ ماں باپ کو اس حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے انسپکٹر صاحب! کسی نے کہا؟“ یا اور آپ نے مان لیا؟ ذرا سوچیں تو سہی کیا یہ دونوں مجرم ہو سکتے ہیں؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے ہاتھوں سے بیٹے کا گھر اجاڑ سکتے ہیں، لیکن آپ کیا سوچیں گے آپ کے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے ایک تو ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور اوپر سے آپ کا جراحہ انداز گفتگو میری سمجھ سے تو باہر ہے۔“

بات سنتے ہی انسپکٹر عمر پر چھوٹ پڑا اس نے عمر کو گریبان سے پکڑ کر دو تین گھنٹے اس کے پیٹ پر دے مارے اور سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا ”تم

کھڑے کھڑے میرا منہ کیا پکڑ رہے ہو ابے پکڑاؤ اور لے جا کر حوالات میں بند کر دو یقیناً ای نے آگ لگا کر اپنی بیوی کو جلا دیا ہے۔“ انسپکٹر کا حکم سنتے ہی دونوں سپاہی تیزی سے آگے بڑھے اور عمر کے ہاتھوں میں آہنی ٹڑیاں ڈال کر باہر لے گئے کچھ دیر بعد انسپکٹر بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گیا کیونکہ حوالات میں عمر پر غصہ اتارنے کے علاوہ اسے جانے دینے کے معائنے کے لیے بھی جانا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد قدیر اور فاطمہ بھی وہاں سے باہر آ گئے انہیں باہر آتے دیکھ کر عمر کے سسرال والوں نے نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا اور یوں انجان بن کر بیٹھ گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ قریب ہی دوسرے بچ پر قدیر اور فاطمہ بھی بیٹھ گئے وہ دونوں آنسو بہائے جا رہے تھے کبھی قدیر فاطمہ کو چپ رہنے کی تلقین کرنے لگتا کبھی فاطمہ قدیر کو حوصلہ دیتی تھی۔

بانو کو آپریشن تھیٹر سے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا اس کے جسم پر پڑنے والے چھالوں پر زوا لگا دی گئی تھی اور ڈرپ کے ذریعے مختلف انجکشن دیے جا رہے تھے لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھی ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جب تک اسے ہوش نہیں آ جاتا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جو بھی ادویات بازار سے آ رہی تھیں وہ سب بانو کے گھر والے لا کر دے رہے تھے۔ دوپہر سے رات ہو گئی تھی مگر بانو ہوش میں نہیں آئی تھی عمر کے بہن بھائی بھی خبر ملتے ہی وہاں آ پہنچے تھے اور بانو کے ہل خانہ کے دریے پر احتجاج کر رہے تھے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے سامنے تنے بیٹھے تھے اور ساتھ ساتھ بانو کے ہوش میں آنے اور اس کی صحت یابی

کے لیے دعائیں بھی کی جا رہی تھیں۔

ایک نرس چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ لیے ان کے پاس آ کر کی نرس کو دیکھتے ہی کبھی افراد اٹھ کھڑے ہوئے نرس نے آتے ہی سب کے چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے بانو کے ہوش میں آنے کی نوید سنا دی بانو کے ہوش میں آنے کا سنتے ہی سب رشتہ دار وارڈ کی طرف دوڑ پڑے۔ ”کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟“ نرس نے انہیں روکا۔

سب لوگوں کے اٹھے ہوئے قدم رک گئے اور وہیں کسی مجرم کی طرح گردن جھکا کے کھڑے ہو گئے اتنے میں نرس کی پھر آواز آئی ”آپ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں، ایحال بانو کے پاس صرف ایک شخص جاسکتا ہے اب یہ فیصلہ آپ لوگ کر لیں کہ سب سے پہلے کون جائے گا۔“

”میں جاؤں گی اپنی بیٹی کو دیکھنے۔“ بانو کی ماں نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... ہاں“ سسرال سے ہی جانے ویس بیٹی کو دیکھنے کے لیے دوپہر سے ہی تڑپ رہی ہے۔“ بانو کے باپ نے تائید کی۔

”ٹھیک ہے بی بی بی“ آپ چلیں اور دیکھیں اسے بانے کی کوشش نہیں کرنی اور زیادہ دیر تک اس کے پاس بیٹھنا بھی نہیں۔“ نرس نے ہدایت دیں اور چل پڑی بانو کی ماں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی اور باقی افراد بانو کے ہوش میں آنے پر مجبور ہوا کرتے گئے۔

کچھ دیر بعد انسپکٹر اپنے دونوں سپاہیوں کو ساتھ لے دیا پھر آ گیا وہ اس کوشش میں تھا کہ بانو کے ذہن میں آتے ہی فوری طور پر اس کا بیان لے لیا بانے بانو ہوش میں تو آ گئی تھی مگر ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھی کو کوئی بیان دے سکے انسپکٹر نے ایک سپاہی کی وہاں ڈیوٹی لگادی اور خود واپس چلا گیا۔

رات دعائیں مانگتے گزر گئی صبح ہوئی تو دعاؤں اور دعاؤں نے اپنا اثر دکھایا اور بانو مکمل طور پر ہوش میں آ گئی اس کے ہوش میں آنے کے بعد اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے پرائیویٹ کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ڈاکٹروں نے اسے خطرے سے باہر قرار دے دیا تھا۔

کبھی رشتے دار ایک ایک کر کے بانو کی خیریت معلوم کرنے اس کے پاس آ رہے تھے لیکن اس کی آنکھیں اسے جیون سا بھی کو ڈھونڈ رہی تھیں جو انہیں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ تھک ہار کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی لیکن کچھ ہی دیر بعد آنکھیں پھر کسی کی تلاش میں لگ جاتیں گو کہ بانو منہ سے کچھ بول نہیں پا رہی تھی مگر اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی آخر کسی نے چپکے سے اس کے کانوں میں عمر کے حوالات میں بند ہونے کی خبر ڈال دی۔

عمر کے حوالات جانے کا سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اسے اپنے والدین کی سوچ پر بہت دکھ ہوا وہ عمر کے لیے بے چین ہو گئی وہ جیسا بھی تھا اس کا شیوہ تھا۔ ایک مشرقی عورت بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا مجازی خدا سلاخوں کے پیچھے قیدی بنا کر ڈال دیا جائے اس نے نہ صرف اپنے والدین کو عمر کی بے گناہی کا یقین دلایا بلکہ پولیس کو بھی صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ آگ محض حادثاتی طور پر لگی تھی اس میں عمر یا اس کے گھر والوں کا کوئی ہاتھ نہیں۔

بانو کے بیان سے اس کے والدین کی تسلی ہو گئی تھی مگر انسپکٹر کسی بھی طرح مطمئن نہیں ہو رہا تھا وہ اسے طرح طرح کے سوالات کر کے الجھار رہا تھا اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح بانو کے منہ سے اگلو الے کہ آگ عمر نے ہی لگائی تھی ”بی بی ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ جب آگ لگی تم اس وقت کچن میں کیا کر رہی تھیں۔“ انسپکٹر نے بانو کو کریدا۔



”انسپیکٹر صاحب! میں نے کہاناں میں کھانا تیار کر رہی تھی۔“ بانو نے مختصر جواب دیا

بانو کا جواب سن کر انسپیکٹر کے چہرے پر ہلکی سی طنز بہ مسکراہٹ پھیل گئی اور بولا ”تم کہتی ہو کہ جب آگ لگی تو اس وقت تم کچن میں کھانا بنا رہی تھیں جب کہ وہاں ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے۔“ پھر خود ہی بولا ”اچھا چلو اس بات کو چھوڑو کیا تمہیں کچھ یاد ہے کہ آگ سب سے پہلے تمہارے جسم یا کپڑوں کے کس حصے کو لگی؟“

بانو نے کچھ لمحوں کے انتظار کے بعد جواب دیا اور بولی ”میرے خیال میں آگ سب سے پہلے میرے دوپٹے کو لگی تھی۔“

”بانو! تم کیوں جھوٹ پر جھوٹ بولے چلی جا رہی ہو آگ نے تمہارے دوپٹے کو چھو تا تک نہیں وہ اب بھی ویسے کا ویسا صحیح سلامت کچن میں ایک طرف بڑا ہے۔“

”انسپیکٹر صاحب! آپ نہ جانے مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں لیکن سچ یہی ہے کہ آگ کسی نے لگائی نہیں محض حادثاتی طور پر لگی تھی۔“ بانو چیخ کر کہہ رہی تھی ”انسپیکٹر صاحب! کوئی ضروری نہیں کہ کہیں آگ بھڑک اٹھے تو اس میں کسی نہ کسی کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے حادثے بھی اسی دنیا میں ہوتے ہیں اور..... اور..... آپ مانتے ہی نہیں۔“ بانو یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

ڈاکٹر اور نرسیں اس کے پاس آ پہنچے انہوں نے فوری طور پر سب کو کمرے سے نکال دیا اور انجکشن لگا کر بانو کو سلا دیا۔

بانو کی بار بار واضح یقین دہانیوں کے باوجود انسپیکٹر کسی بھی طرح نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا آخر کاغذ کے نیلے اور سبز لکڑوں نے اپنا کام کر دکھایا اور عمر کو آزاد

کر دیا گیا۔ عمر اسپتال پہنچا تو اسے دیکھ کر بانو کی ویران آنکھیں مسکرا اٹھیں اور ان میں روشنی بھر گئی۔ کچھ دن تک عمر کے سر پر والے کھچے کھنچے رہے مگر پھر عزیزا رشتے داروں کے سمجھانے سمجھانے پر فریب آ گئے۔

عمر نے آفس سے طویل رخصت لے لی اور بانو کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیا اب عمر یا بانو کے گھر والوں میں سے کوئی بھی فرد بانو کی خیریت معلوم کرنے آتا تو کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا جاتا مگر عمر ہریل بیوی کی تیارواری میں رگڑتا اس کی آنکھوں سے عشق کی بندھی ہوئی مٹی تو کب کی اتر گئی تھی دن رات کی قربت نے عمر کو بانو کے اور کبھی قریب کر دیا تھا اب عمر کو آگ میں جھلسی ہوئی بانو بھی پیاری لگنے لگی تھی۔

بانو مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی مگر اس کے چہرے پر جلنے کے داغ باقی تھے ڈاکٹروں نے اسے گھر جانے کا بھی کہہ دیا تھا لیکن عمر کی ایک ہی ضد تھی کہ چاہے اس کا سب کچھ بک جائے لیکن وہ بانو کو اس وقت تک گھر واپس نہیں لے کر جائے گا جب تک وہ اپنی پہلے والی حالت میں نہیں آ جاتی۔ ڈاکٹروں کو بھی عمر کی ضد ماننا پڑی اور بانو کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کر دی گئی یہ ایک طویل اور صبر آزمایہ مرحلہ تھا جسے عمر نے من کر گزار دیا۔

سرجری کے بعد بانو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دینے لگی تھی عمر نے اسے گاڑی میں اپنے برابر والی سیٹ پر بٹھالیا گاڑی چلی تو بانو نے پیار سے اپنا سر عمر کے کندھے پر رکھ دیا وہ بہت خوش تھی کہ موت کا مزہ کچھ کر ہی سہی اسے اس کا بیاڑل گیا تھا تاہم زندگی بھر کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو سکتی کہ آگ کسی اور نے نہیں بانو نے خود لگائی تھی کیونکہ شوہر کا پیار پانے کے لیے اسے بھی ایک راستہ دکھائی دیا تھا۔

# قلندرِ اہلِ نبلہ

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بدتر، رچہ اور کئے بچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آپ کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی لنگیوں پر بچایا جو اپنے تئیں دنیا صغیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رستانیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے کیونکہ یہ محض خانہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

”نام؟“

پولیس چوکی میں تعینات موٹے اسکھ آفیسر نے اپنے سامنے کھڑے جہاں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں پوچھا۔

”جہاں سنگھ۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”باپ کا نام.....؟“ اس نے یوں تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا جیسے باہر سے آنے والے کسی سکھ کے باپ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

”آنجہانی..... کلندر سنگھ.....“ اس بار پھر اس نے لہجے کو پرسکون رکھا تھا۔

”یہاں کس کے پاس آئے ہو اور کیوں؟“ اس بار پولیس آفیسر کے لہجے میں شک کا زہر گھلا ہوا تھا۔

”میں یہاں آنے گھر آیا ہوں۔ اس گاؤں میں میرے آباؤ اجداد کا گھر ہے۔ جواب بھی موجود ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا ہوں اور اب.....“ جہاں نے جذباتی لہجے میں کہنا چاہا تو اس کی بات کاٹ کر آفیسر بولا۔

”لیکن یہ سب تیرے ان کاغذات میں نہیں لکھا ہوا اور نہ ہی میرے سوال کا جواب ہے۔ میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ.....“ موٹے آفیسر نے انتہائی

خفارت اور ہنگامہ میز لہجے میں اکتاتے ہوئے کہا۔

اس پر جہاں نے گہری سانس لی اور سمجھوتہ کرنے والے انداز میں بولا۔

”میں انوجیت سنگھ کے پاس آیا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔“ اس نے ذرا فاصلے پر بیٹھے انوجیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی سرد پن اُتر آیا تھا۔

”کتے دن کا پروگرام ہے؟“ آفیسر نے یوں کہا جیسے اس کی پہلے والی بات کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

”جتنے دن کا دیر ہے۔ یہ بات میرے کاغذات میں درج ہے۔“ اس بار لہجے میں سرد پن کے ساتھ طنز بھی اُتر آیا تھا۔ اس پر آفیسر نے ذرا سی آنکھیں موند کر اس کی جانب دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے مگر تمہاری جتنی بھی مومنٹ ہوگی اس کی اطلاع یہاں تھانے میں ہونی چاہیے۔“

”مطلب میں اس آزاد ملک میں بھی آزاد نہیں ہوں؟“ وہ آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”آزادی ہمیشہ پابندیوں کے ساتھ ملتی ہے مسٹر جہاں سنگھ۔ ہر ملک کے قانون کی پاسداری کرنا پڑتی ہے۔ اور ہم قانون کی حکمرانی ہی کے لیے یہاں بیٹھے



ہوئے ہیں۔ اب تمہارے ساتھ پر تو نہیں لکھا ہوا کہ تم..... وہ شہت گرد نہیں ہو۔ جس قدر یہ چاہے کہ تم یہاں امن و امان سے رہ کر واپس چلے جاؤ گے، اتنے ہی چاہیں یہ بھی ہیں کہ تم کسی دشمن ملک کی سرگرمیوں میں جتنی ملوث ہو، سکھ آفیسر نے حقارت، طنز اور اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہو آفیسر، لیکن ہر قوم ہر ملک ہر ملک اور ہر بندے کا اپنا ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔ اس کی اپنی قوی ردایات بھی ہوتی ہیں۔ اس کے اپنے آباؤ اجداد کا ورثہ بھی ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے؟ آپ جبکہ مجھے ایک غیر ملکی اور مشکوک آدمی بنانے پر تکل ہی لگتے ہیں تو سنو..... آپ سے ملنے کے بعد بھارت، پنجاب اور خصوصاً سکھ قوم کے بارے میں جو میرا تاثر تھا وہ قسم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے لہجے میں بھی نفرت عود کر آئی تھی۔

”کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ ایک دم ہتھے ہی سے اکھڑ گیا۔ اس لیے وہ اسی ہی کے لہجے میں بولا۔

”وہی جو تم سمجھ گئے ہو۔ نیا سوال بولو۔“ اس بار جہاں لنگھ باوجود کوشش کے اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے صاف لفظوں میں وہی کہہ دیا جو اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ پولیس آفیسر چند لمحے سوچتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسی ہنک آمیز لہجے میں اس کے کاغذات سمیٹ کر واپس دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں کوئی سوال نہیں ادھر جاؤ میرے اسسٹنٹ کے پاس، اس کے پاس جا کر فارم پُر کرو اور اس پر دستخط کر کے چلے جاؤ۔ مگر.....! میری ہدایت کو ذہن میں رکھنا اب جاؤ۔“

جہاں نے بمشکل خود پر قابو رکھا، اپنے کاغذ

پکڑے اور اپنی جانب دیکھتے ایک پولیس کانسٹیبل کی طرف دیکھا، جس کی طرف آفیسر نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے پاس انوجیت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا، کانسٹیبل نے سامنے بڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹھے۔“  
”شکریہ۔“ اس نے کہا اور انوجیت کے ساتھ بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب تک اس نے دروازے سے ایک فارم نکال کر اس کے سامنے رکھا اور بڑے آرام سے بولا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے اس آفیسر کا سو بھلا (مزاج) ہی ایسا ہے۔ طبیعت کا کچھ گرم ہے ویسے یہ اندر سے بہت اچھا آدمی ہے۔ آپ یہاں ضروری معلومات لکھ کر دستخط کریں۔“

جہاں لنگھ نے ایک نگاہ میں وہ معلومات پڑھیں اور پھر جلدی جلدی سب لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے۔ دوبارہ ایک نگاہ ڈال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

”لیں۔“  
کانسٹیبل نے ایک نگاہ فارم پر ڈالی اور پھر واپس رکھتے ہوئے بس کر بولا۔

”آپ اپنے ساتھ سکاچ وینسکی تولائے ہوں گے۔“

”نہیں، میں نہیں لایا، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ جہاں لنگھ نے چونک کر کہا تو انوجیت بولا۔

”وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔“ پھر کانسٹیبل سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تم آؤ دو رات میرے ساتھ باہر۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاں لنگھ بھی باہر جانے کے لیے لپکا تو کانسٹیبل بھی ان کے پیچھے ہی آ گیا۔ انوجیت نے اپنی جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”اپنے آفیسر کو سمجھا دینا کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے مہمانوں کے ساتھ بات ذرا تمیز سے کیا کرے۔ اگر نہیں سمجھتا تو اسے بات کرنا سکھا دیں گے ہم۔ اب جاؤ۔“

کانسٹیبل نے نوٹ جیب میں ڈالے اور واپس پلٹ گیا۔ انوجیت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جہاں لنگھ کو سمجھایا تو دونوں گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

”یار مجھے بہت غصہ آ رہا ہے اس پر.....“ جہاں لنگھ نے کہا۔ جب وہ تھانے کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔ پھر دونوں ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تو انوجیت نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کئی سے کہا۔

”تیرا کیا مطلب ہے مجھے اس پر پیارا رہا ہے۔“  
”تو پھر انہیں رشوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”رشوت میں نے کون سی رشوت دی ہے میں نے کون سا کوئی ناجائز کام کر لیا ہے۔ تم سمجھو جہاں لنگھ یہاں جائز کام کے لیے بھی رقم دینا پڑتی ہے۔ سمجھ لو یہ بھی غلط فہم ہے۔ یا بھتہ، ورنہ یہ جائز کام کو بھی اتنا مشکل بنادیتے ہیں کہ بس.....“ انوجیت نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”آئندہ.....! تم نے کسی بھی معاملے میں یوں تمنا سنائی نہیں کرنی، میں خود چاہوں گا کہ یہ میرے نام کو مشکل بنائیں۔“ جہاں لنگھ نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ انوجیت نے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔“ جہاں لنگھ نے کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔ اس پر انوجیت خاموش ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہونے میں تھوڑی سی وقت تھا جب وہ پولیس چوکی سے نکلے۔

میرے حواس بیدار ہوئے تو میں ایک اندھیرے کمرے میں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے روشنی کا احساس ہونے لگا۔ مجھے اپنے گرد پیش کا احساس ہوا تو دیکھا کہ کچھ پولیس والے کھڑے تھے اور میں فرش پر جیت لیٹا ہوا تھا۔ ایک پولیس والے کے ہاتھوں میں پانی کی بوتل تھی جس سے وہ پانی میرے چہرے پر پھینک رہا تھا۔ باوجود خواہش کے میں اپنے ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکا۔ میں نے اپنی طرف سے چیخ کر کہا تھا کہ مجھ پر پانی مت پھینکو..... لیکن میرے لبوں سے بھی ایک لفظ تک ادا نہیں ہو پایا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں پتھر کا بن گیا ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنے لگا۔ یہاں تک کہ مجھے ارد گرد کی آوازیں صاف سنائی دے لگیں۔

”اوسے ہوش نہیں آیا..... اس بہن.....“ کسی نے کرخت انداز میں پوچھتے ہوئے نہایت غلیظ انداز میں گالی دی۔ ابھی میرے قریب ہی سے آواز آئی۔

”بس آئی گیا ہے جی۔“  
”تو لے آؤ پھر اسے.....“ اتنا کہنے کے بعد گالیوں کی ایک لمبی فہرست تھی جسے برداشت کرنا انتہائی ناممکن تھا۔ میرے بدن میں آگ بھڑک گئی۔

میرے ہوش کرنے پر انہوں نے مجھے زبردستی اٹھایا اور چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے افضل رنڈھاوا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کرسی کی ٹیک چھوڑ کر بولا۔

”اوسے (..... گالی) اب جلدی سے بک دے ڈکیتی کا مال کدھر ہے؟“  
میں اس وقت تک پورے حواس میں آ گیا تھا، اس لیے اپنا آپ چھڑواتے ہوئے بولا۔

”تیری بہن کے گھر بڑا ہے چیمبر کی کئی تھی۔۔۔۔۔ وہ پوری کی ہے۔“

میرے اس طرح کہنے پر وہ بری طرح چونک گیا۔ حیرت سے چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بجائے بھڑکنے کے اسی کرخت لہجے میں یوں بولا جیسے میں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔

”جیپ تیرے گھر کے باہر سے برآمد ہو گئی ہے یہ میرے سامنے چوہدری حفیظ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے بیٹے سے گاڑی چھین گئی تھی۔ جو مال۔۔۔۔۔ اس نے کہنا چاہا مگر میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”اگر کوئی تیری بیوی میرے گھر کے سامنے لا کر چھوڑ دے تو کیا اسے بھی میں نے اغوا کیا ہے؟“

”اوائے زیادہ سیانا نہ بن اور اپنی زبان قابو میں رکھ۔ ورنہ تیرے بدن کا ہر سوراخ بولے گا کہ مال کہاں ہے بے غیرت۔۔۔۔۔“ اس نے غصے میں سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ میں رخ پھیر کر اس چوہدری حفیظ کو دیکھنے لگا جو بڑے ٹھنڈے سے کرسی پر براجمان تھا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ اور میرے گھر سے باہر جیپ تک کیسے پہنچا؟ یہ سوال میرے ذہن میں گونج کر رہ گئے۔ تب تک افضل رندھاوا نے کہا ”اتنی ٹھکانی کے بعد تجھے عقل آجانی چاہیے ورنہ رات بھر تک تیرے جسم کے ریشے تک ادھر جا میں گے۔“

”اوائے سن اوائے رندھاوا۔۔۔۔۔ اس جیپ پر چھ حملہ دار اسلحہ سمیت مجھے قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے ان بزدلوں کو مار بھگا دیا۔ یہ جیپ ان لوگوں نے وہاں چھوڑی اور بھاگ گئے۔ مجھے نہ کسی ذمہ داری کا پتا ہے اور نہ میں کسی مال کے بارے میں جانتا ہوں۔ یہی سچ ہے اور یہی میرا بیان ہے۔ اب تو جو چاہے کر لے میرا بیان یہی رہنا ہے لیکن یہ یاد رکھاؤ اپنی اپنی ہی اوقات دکھانا جتنی تو بعد میں برداشت

کر سکے۔“ میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے پھر وہ انتہائی غضب میں بولا۔

”تو بول کہاں سے رہا ہے مجھے تو اتنا بے وقوف نہیں لگتا کہ تجھے یہ معلوم ہی نہ ہو تو کہاں کھڑا اور کس سے بات کر رہا ہے۔ تو میری اوقات دیکھنا چاہتا ہے تو پھر دیکھ میں دکھاتا ہوں تجھے اپنی اوقات۔“ یہ کہہ کر اس نے چوہدری حفیظ کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری صاحب! آج آپ جا میں ہیں ذرا اسے بات کرنا سکھالوں کل آپ تشریف لائیں میں جیپ آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”جی بہتر۔۔۔۔۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا تبھی اس نے دوسرے کمرے میں موجود اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور دھڑکنے سے نکلتا چلا گیا۔ تبھی افضل رندھاوا نے اپنے قریب کھڑے پولیس والوں سے کہا۔

”اوائے لے جاؤ اسے اور چھتر دل کر کے سمجھاؤ کہ بولتے کیسے ہیں۔ آج رات کوئی ڈکیتی کوئی مال برآمد کروانے کی ضرورت نہیں ہے مرتا ہے تو مرجائے۔۔۔۔۔ میں سنبھال لوں گا۔“

اس ہاتھ کی پچھنی ہوئی مٹھی کر کے پیچھے مٹھی دہی ایک طرف تھا میں نے آگے بڑھ کر اس کے ریو اور پر ہاتھ ڈال دیا دوسرا ہاتھ اس کی مٹھی والے بازو پر ڈالا اور چشم زدن میں گھوم کر اس کی گردن میں بازو جھک کر دیا۔

وہ ایک دم سے ٹھٹھک گیا اور پھر وہیں ساکت ہو گیا۔ میں نے ریو اور کے وزن سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جانی نہیں ہے۔ بس سیٹھی کی سی نہیں ہٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ریو اور لا کر سیٹھی کیج بٹایا اور سر دلہجے میں بولا۔

”یہ ہے تیری اوقات۔۔۔۔۔ اب چل وہیں لے چل جہاں سے تو مجھے لایا تھا ورنہ تو مرنے لگا ہی باقی کا مجھے بتائیں۔“

”دیکھ گولی نہ چلانا میں۔۔۔۔۔ تجھے لے چلتا ہوں۔۔۔۔۔ چل۔۔۔۔۔“ اس نے تیزی سے کہا ہار باہر جانے کو تیار ہو گیا۔ قریب کھڑے سپاہی اس صورت حال سے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک تیزی سے باہر کی جانب بھاگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ کر بھاگا تھا۔ چاہے انتہائی غصے میں ہی سہی مگر میں خواہ مخواہ خود کو مجرم ثابت کر رہا تھا۔ میرا شعور ٹھنڈی حرکت کرنے سے باز رکھ رہا تھا۔ گردہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں ذرا سی بھی کمزوری دکھاؤں۔ بعد میں جو بتا وہ میں جھگٹ لیتا۔ اس وقت جو انہوں نے مجھے ذلیل کر کے پکڑا تھا اس نے میرا دماغ گھما کے رکھ دیا تھا۔ میں رندھاوا کو قابو کیسے جب اندرونی کمرے سے باہر برآمدے میں آیا تو پورے تھانے میں لوگ ہم دونوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور سولہا بھی۔ کچھ جذباتی پولیس والوں نے اپنی گنیں سیدھی کیس اور کچھ غیر ملکی طور پر ہماری جانب لپکے مگر افضل رندھاوا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں

اچھائی اور برائی کی تیز۔۔۔۔۔ ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا کہ آپ ﷺ سے خیر و شر کے بارے میں کچھ پوچھتے ہو جب وہ حضور ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ”تم مجھ سے سوال کرو گے یا میں خود ہی بتا دوں۔“ انہوں نے عرض کیا ”آپ ﷺ ارشاد فرمائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔

”تم مجھ سے خیر و شر اور نیکی و گناہ کی بابت سوال کرنے آئے ہو“ پھر آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت ان صاحب کے سینے پر رکھ کر فرمایا

اپنے دل سے پوچھ لو کیوں کہ نیکی وہ ہے جس کا نفس کو الہام ہو اور دل اس سے سکون و قرار پکڑے اور شر وہ ہے جو دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو اگرچہ تمہیں اس کے جواز ہی کا فتویٰ دیا جائے۔“

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک بڑی نعمت ضمیر کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ ضمیر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ کسی مصلحت یا مفاد کو کسی خاطر میں نہیں لاتا اور ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان کی روشنی میں نیکی اور برائی میں شناخت ہرگز کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ نیکی وہ ہے جس پر آپ کا ضمیر خلش محسوس کرتا ہے اور آپ کو ٹوٹتا ہے ہمیشہ یہ بات یاد رکھئے ”آپ کا ضمیر ہمہ وقت آپ کو مطلع کرتا ہے۔ ضمیر کی بات پر توجہ دینا یا نہ دینا آپ کا اختیار ہے۔“

(نازیہ اسلم ہری پور)

بظاہر سکون سے پوچھا تھا لیکن اس کے لہجے میں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

”گاڑی برآمد ہوئی تھی اس سے چند دن پہلے ڈیکٹی ہوئی تھی اور اس.....“ رندھاوا نے کہنا چاہا مگر اس کی بات کاٹتے ہوئے پیرزادہ وقاص نے پوچھا۔  
 ”یہ بتایا کس نے کہ گاڑی اس کے گھر کے سامنے کھڑی ہے.....؟“

”وہ چودہری حفیظ..... ابھی کچھ دیر پہلے یہاں تھا۔ اس نے بتایا تو میں نے چھاپہ مارا اور گاڑی مل گئی۔“ رندھاوا نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہ اس وقت تک کافی حوصلہ پکڑ چکا تھا۔

”یہ تصدیق کیے بغیر کہ گاڑی اس نے چرائی ہے یا نہیں، تم اسے پکڑ کر یہاں تھانے میں لے آئے اور وہ بھی اس قدر ذلیل کر کے..... کیوں..... اس کا جواب دو.....“ شاہ زیب نے غصے میں کہا۔

”سچ کیا ہے وہ بولو اسپیکر..... یہ بچوں جیسی باتیں مت کر دو ورنہ مجھے اور شاہ زیب کو یہاں دیکھ کر تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ یہ علاقہ تمہارے لیے عذاب بن جائے گا۔“ پیرزادہ وقاص نے سخت لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر الجھتے ہوئے بولا۔  
 ”دیکھئے ابھی آپ اسے لے جائیں۔ میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔“

رندھاوا نے یہ لفظ بہت مشکل سے کہے تھے۔ شاید اس کے اندر ہی اندر کچھ درد لاوا پک رہا تھا یا پھر وہ فحالت کے باعث بات نہیں کر پار رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ اذیت محسوس کر رہا تھا۔  
 میں نے اس کی اذیت میں اضافہ کرنے کی خاطر کہا۔  
 ”در اصل یہ جو ہمارا سسٹم ہے نا اس میں بے چارے پولیس والے بھی کیا کریں جاگیرداروں کو

وڈیروں، سیاسی لیڈروں اور سرکاری افسروں کو

میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میری توجہ دینی اور شاید اس پر افضل رندھاوا نے میری گرفت کو ڈھیلی محسوس کیا۔ اس لیے میرا بازو اپنی گردن سے ہٹانے کی تیزی سے کوشش کی۔ میں نے اسے مزید دبا دیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ یہ لہجوں میں ہوا تھا۔ دوسری گاڑی فوراً ہیل جپ بھی جس کے شیشے کاٹے تھے۔ اس میں سے پیرزادہ وقاص باہر نکلا۔ وہ میری طرف انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ ابھی شاہ زیب نے اونچی آواز میں کہا۔

”چھوڑ دے جمال اسے..... میں آ گیا ہوں..... اب یہ تجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“  
 میں نے افضل رندھاوا کو چھوڑنے میں ذرا سا توقف کیا تھا۔ شاید اس لیے پیرزادہ وقاص پر سکون مگر بھاری لہجے میں بولا۔

”اب چھوڑ بھی دے یا یہ رندھاوا اپنا ہی بندہ ہے۔“

میں نے ایک دم سے اسے چھوڑا تو وہ کھانسنے لگا۔ میں نے ریوالور کے جیمبر میں سے گولیاں نکالیں اور خالی ریوالور اس کے ہولسٹر میں ڈالنے کی بجائے اس کی جانب بڑھا دیا۔ جسے اس نے آرام سے پکڑ لیا اس کے انداز میں شرمندگی کا بھرپور تاثر تھا۔ میں باہر کی جانب نہیں لپکا بلکہ واپس مڑا اور ایس ایچ او کے کمرے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آ گئے۔ اس بار رندھاوا کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ میری جانب ٹیز سی آنکھ سے بھی دیکھے۔ میرے دائیں جانب پیرزادہ وقاص اور بائیں طرف شاہ زیب آ کر بیٹھ گئے۔

”کیوں پکڑ کر لائے ہو اسے؟“ شاہ زیب نے





سیاہ دراز گیسواس کی کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سفید نازک سا جوتا پہنے وہ بڑے انداز سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہاتھ میں بڑے پکڑے چلتی چلی آ رہی تھی۔ جہاں ایک لمحے کے لیے اسے دیکھ کر مہبوت ہو کر رہ گیا۔ کیا بھرپور حسن تھا۔ اگر چہ اس مہ جہیں کے نقشِ تیکھے تھے مگر اس کے بدن کی طرح ہر خط اس طرح مناسب تھا کہ حسن خود بخود چھٹک رہا تھا۔ پنچاب کا حسن، موٹی آنکھیں، جو کاجل کی مانند سیاہ ہنسنورائیں، بھاری پلکیں، نیکی تلوار ناک، تینے ریلے ہونٹ اور دامیں گال میں ڈمپل وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بڑے میز پر رکھی تو جدید پرفوم کی مہک نے ایک دم سے اسے فریش کر دیا۔ وہ اسے اتنے قریب سے دیکھ کر نہال ہو گیا تھا۔

”یہ کیسی جی آپ کے لیے۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو جہاں کو ہوش آ گیا۔ اس نے سامنے بڑے ہوئے بڑے سارے پیتل کے گلاس کو دیکھا جو لبالب لسی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے یوں اٹھایا جیسے حکم مان رہا ہو۔ پھر گلاس ہونٹوں سے لگا کر اس وقت الگ کیا جب خالی ہو گیا۔

”یہ ہر پریت کور ہے..... اپنے انوجیت سے تھوڑے سال چھوٹی۔“ کلجیت کور نے تعارف کرایا یہ جہاں کو احساس تھا کہ سبھی نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں جی ہر پریت نے کہا۔

”آئیں..... میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں.....“

”چلو.....“ جہاں سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی اور جہاں کے ذہن میں بچانے کیوں صحرا میں پھرنے والی ہرنی کا تصویر ابھر رہا تھا۔ چچل ہی ہر پریت کور اس کے من میں ایک دم سے ساگئی تھی۔ وہ میز ہیاں چڑھ کر دوسری منزل تک گئے

اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو کر ہر پریت بولی۔

”لو جی، جیسی سنگھ جی یہ ہے آپ کا کمرہ فی الحال فریش ہو جائیں۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود ہے۔ پھر بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو بہت سارے نوکر ہیں یہاں پر آواز دے لیں۔“

”تمہیں..... تمہیں آواز دے لوں تم ان کی ہیڈ ہو۔“ جہاں سنگھ نے شرارت سے کہا۔

”اودہ ہمیں اپنا نوکر ہی سمجھ لیں تو بڑی بات ہے جی آپ آواز دے کر تو دیکھیں جی۔“ ہر پریت نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا تو جہاں ایک دم سے ٹھنک گیا۔ ہر پریت اسے بڑی ذہین اور تحمل مزاج لگی تھی۔ اسے لگا کہ شاید اسے مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا تب وہ بولا۔

”سوری ہر پریت میں تو مذاق میں.....“

”اوند جی جیسی جی ہمیں آپ کا مذاق بھی اچھا لگتا ہے۔ آپ فریش ہو جائیں باتوں کے لیے برا وقت ہے جی میں چلی آپ جلدی آجائیں مہمان کھانے پر آپ کا انتظار کریں گے۔“

یہ کہہ کر وہ مزید کوئی بات سے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ جبکہ جہاں کانی دیر تک اس کی سادگی پر اس کے بات کرنے کے انداز میں معصومیت اور اس کے حسن میں کھویا رہا۔

کھانے کا اہتمام کوشی کے بائیں لان میں کیا گیا تھا جو کانی بڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سیدھا راستہ جاتا تھا جس کے ایک جانب سوئمنگ پول اور دوسری جانب لان ٹینس کورٹ تھا۔ آگے پھر ایک لان اور اس کے بعد ملازمین کے کمرے تھے جسے ایک دیوار کے ساتھ الگ کیا ہوا تھا۔ کھانے پر زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ بس اس کے سفر اور ویکوور کے بارے میں باتیں ہوئی ہیں۔ ہر بندے نے اپنا تعارف کرایا

اپنے ہاں آنے کی بصد شوق دعوت دی۔ کھانے کے بعد گھر میں سناٹا اچھا گیا۔ انوجیت مہمانوں کے ساتھ مصروف رہا اور یہی حال ہر پریت کور کا تھا۔ آخری مہمان کے رخصت ہوتے ہی کلجیت کور اسے لے کر رانگ روم میں آ گئی۔

”چل پتر.....! اب جا اپنے کمرے میں اور سکون سے جا کر سو جا۔ تو بہت تھک گیا ہوگا نا آرام کر۔“ وہ بڑے خلوص اور مانتا بھرے لہجے میں بولی۔

”نہیں پھو پھو جی! مجھے ابھی نیند نہیں آئے گی۔“

جہاں بھی کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ اس نے کلجیت کور کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ہر پریت اور انوجیت دونوں وہیں آ گئے۔ شاید انہوں نے جہاں کی بات سن لی تھی۔ اس لیے ہر پریت بولی۔

”چلیں بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”ابھی تو اتنے ملازم تھے یہاں۔“ جہاں نے بے ساختہ کہا۔

”لیکن خاص مہمانوں کے لیے خاص سید اپنے ہاتھوں سے کی جاتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تو چلو مجھے یہ تو معلوم ہوا کہ میں خود کو اس گھر کا فرد نہیں، بس مہمان ہی سمجھوں۔“ اگرچہ یہ بات جہاں نے یونی مذاق میں کہی تھی لیکن کلجیت کور نے تڑپ کر کہا۔

”نہ پتر.....! نہ ایسے نہ کہو۔ تو اس گھر کا فرد ہی نہیں بلکہ اس گھر کا مالک بھی ہے۔ یہاں بیٹھ میں تجھے سمجھا دوں۔“

”پھو پھو جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ جہاں نے تجسس سے پوچھا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہر پریت تو جاو رہی تھی سے چائے لانے کو کہہ

نظم

جب سے میں نے شعور کی دلیلیز پر رکھا قدم - تو.....

دنیا میں ہر طرف یہی دیکھا ہر دم

بارو سے الی نضا

لبو بہ رنگ گھٹا.....

غرہت، بھوک اور بے سکونی سے نڈھال اوگ

ہر سو ماتم، ہر سو سوگ

خطر میں، تیل کے کنوؤں اور طاقت کا حصول.....

انہی اغراض اور لانچ میں پڑ کر.....

انسان، انسانیت کو گیا بھول

میرے من میں ہے کہ.....!!!

میں اک ایسی دنیا باؤں

جس میں.....!!!

نہ کوئی ظالم ہو، نہ کوئی مظلوم

نہ کوئی فاحش ہو، نہ کوئی مفتوح

نہ کوئی قابض ہو، نہ کوئی مقبوض

جس میں دکھ ہوں، نہ ہی غم

نہ ہی آنسوؤں سے پلکیں غم

جہاں ہر طرف.....

اس خوشحال اور محبت کا راج ہو

اور یہی انسانیت کی معراج ہے

(توبہ نذیر فیصل آباد)

دے۔“ کلجیت کور نے کہا جس پر وہ بولی۔

”جی ابھی کہہ آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی کلجیت کور چند لمحے جہاں کے چہرے پر پھر انوجیت کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ تقریباً تیرا ہم عمر ہے۔ کوئی چند ماہ زیادہ ہوگی

تیری پھو پھو سکھ جیت کور اور میں دونوں ایک ہی

آگن میں بھیٹی رہی۔ سبھی وہ ہمارے گھر ہوئی یا میں

اس کے گھر سارا دن یونہی گزر جاتا پھر ایک دن



میرے باپو نے ہم دونوں کو پکڑا اور اس پنڈ اؤگی کے اسکول میں چھوڑ دیا جہاں اور بہت سارے بچے پڑھتے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور ہم نے جوانی میں قدم رکھا۔

”یہ آپ دونوں کے آنگن کہاں تھے.....؟“

جسپال نے پوچھا۔  
”وہیں اب جس حویلی میں ٹو گیا تھا یہ پہلے کچا گھر ہوتا تھا تیرے دادا کے زمانے میں اور اس کے ساتھ والا گھر ہمارا تھا پھر میرے باپو نے گاؤں سے باہر نیا گھر بنوایا تو ہم نے وہ گھر تیرے دادا کو دے دیا تھا تاکہ گاؤں میں کھلی اور اچھی حویلی بن جائے۔“

جسپال نے بتایا۔

”اچھا تو پھر.....! جسپال نے پوچھا۔  
”پھر.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے حوصلہ جمع کر رہی ہو۔ چند لمحے یونہی خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”سن پتر.....! وہ باتیں بھی سن لیں جو تو نہیں جانتا۔“

”ہاں پھوپھو.....! تو آج ہی بتا دے مجھے.....“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ بڑا کالا دن تھا جب ہم دونوں میں اور سکھ جیت کھیتوں کی طرف سے واپس آ رہی تھیں۔ اس دن سرخ کا بیٹا رویندر سکھ اپنی کار پشہر کی طرف جا رہا تھا وہ بہت عرصے سے چندی گڑھ میں رہ رہا تھا وہیں بڑھتا تھا چھٹیوں میں ہی یہاں آتا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی کار روک لی ہمارے تو ذہن میں بھی نہیں تھا کہ یہ کار ہمارے لیے بھی رک سکتی ہے۔ جیسے ہی ہم قریب گئیں وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا اور بڑے بڑے انداز میں سکھ جیت کو دیکھنے لگا۔ ہم چپ چاپ وہاں سے گزر جانا چاہتی تھیں کہ اس نے سکھ جیت کا بازو پکڑ لیا اور ساتھ ہی اس نے کوئی فضول بات کی جسے سکھ

جیت برداشت نہیں کر سکی۔ اس نے گھما کے پتھر اس کے منہ پر دے مارا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ سرخ کے بیٹے کو ایسے رد عمل کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے دست درازی کرنا چاہی، لیکن سکھ جیت اس کے قابو کہاں آنے والی تھی اور پھر میں اس کے ساتھ تھی ہمارے شور مچانے اور مزاحمت کی وجہ سے ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ ہماری جانب دوڑے لیکن تب تک رویندر وہاں سے کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شاید معاملہ وہیں رنچ ورنج ہو جاتا اگر دو باتیں نہ ہوتیں۔

”کون سی؟“ جسپال نے تیزی سے پوچھا۔ اس دوران ہر پریت وہاں آ کر انو جیت کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔  
”ایک تو ارد گرد لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا اور دوسرا بازو کے قریب سے سکھ جیت کو کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ لازمی طور پر گھر میں پوچھ گچھ تو ہونی چاہی کہ یہ کیا ہوا۔ تب سکھ جیت نے گھر جاتے ہی ساری بات اپنے باپو کو بتادی۔ وہ شدید غصے میں آ گیا مگر اس نے خود قابو رکھا اور بات کرنے سرخ کے پاس چلا گیا۔ اب بھائیوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا لیکن باپو انہیں روک کر گیا تھا کہ میرے آنے تک کوئی کچھ نہ کرے۔ پھر دوپہر وھل گئی۔ باپو واپس نہ آیا تو بھائیوں کو اس کی فکر ہوئی۔ تیرا پاپ کلوندر سکھ اس کا پتا کرنے کے لیے گھر سے نکلا مگر جلد ہی دونوں باپ بیٹا واپس آتے ہی دکھائی دیے۔“ طبیعت کو رساں لینے کے لیے رک گئی تو جسپال مضطرب ہو کر رہ گیا۔ تبھی وہ پھر بولی۔ ”اس سرخ نے باپو کی بات ماننے کی بجائے انہیں بے عزت کر دیا تھا کہ تو میرے پتر پرائز ام لگا تا ہے۔ شام تک پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے سرخ کو بتا بھی دیا کہ رویندر

نے غلط کیا ہے مگر اس نے اپنے پتر کو برا نہیں کہا بلکہ یہ کہہ دیا کہ سکھ جیت ہی غلط تھی جس نے خواہ مخواہ الزام لگایا۔“

”سکھ جیت کے بھائیوں نے کچھ نہیں کیا۔“ جسپال نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں پتر.....! وہ تو چاہ رہے تھے کہ ابھی کہ بھی جائیں اور رویندر سمیت سرخ کو بھی مار دیں لیکن باپو نے عقل مندی اور اندر بیٹھ کر انہیں سمجھایا۔ وہ خاموش ہو گئے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سانس لینے کے لیے زکی۔

”وہ کیوں خاموش ہو گئے پھوپھو.....“ وہ تڑپ اٹھا۔ اس دوران بھوتی چائے لکڑا گئی تھی۔

”بتا رہی ہوں پتر!“ یہ کہتے ہوئے اس نے بھوتی کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”تم جاؤ اور جلدی سے کام سمیٹ لو چائے ہر پریت بنا لے گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ بھوتی نے اوب سے کہا اور اگلے قدموں واپس پلٹ گئی۔ جسپال سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

”باپو اگلے دن ہی صبح ساتھ واپس لے گاؤں چلا گیا۔ تاکہ سکھ جیت کی جہاں ممکن ہو گئی انہیں کہہ دے کہ وہ سکھ جیت کو یہاں لے جائیں۔ ان کا لڑکا جالندھر میں سرکاری نوکری کرتا تھا۔ انہوں نے چند دن ہی میں سکھ جیت کو بیٹا ہار دیا وہ اپنے گھر کی ہوگی۔ اب سارے بھائی انتظار کرنے لگے کہ کب رویندر گاؤں میں آتا ہے سکھ جیت سے دست درازی کرنے کے ٹھیک دو ماہ بعد رویندر گاؤں آیا تو سارے بھائیوں نے مل کر رویندر کو پکڑ لیا۔ مجھے بھی ساتھ لیا اور اس جگہ حلے گئے جہاں رویندر نے دست درازی کی کوشش کی تھی۔ وہاں لے کر انہوں نے رویندر کو اتار دیا اتنا مارا کہ اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ

گئیں۔ دونوں ہاتھ توڑ دیے۔ پھر اسے لے جا کر گاؤں کے چوراہے پر پھینک دیا۔“

”سرخ نے کوئی رد عمل.....؟“ وہ بولا۔ اور اپنے سامنے پڑا چائے کا گلاس اٹھالیا۔

”اس نے اپنے بندے بھیجے کی بجائے پولیس بھیج دی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی تیرا پاپ کلوندر سکھ تھانے چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر یہ قبول کیا کہ رویندر کو اس نے مارا ہے۔ سرخ نے اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے پولیس بھیجی لیکن وہ کسی کو پکڑے بغیر واپس چلی گئی۔ تیرے دادا نے تو سب کچھ پہلے ہی سوچا ہوا تھا۔ ایک دن بعد تیرے باپو کی ضمانت ہو گئی وہ گھر آ گیا۔ اب عدالت میں مقدمہ ہی چلنا تھا۔ دوسری طرف دادا نے سرخ کو دھمکی لگادی تھی کہ اب اس کی باری ہے اسے یونہی مارنا ہے اور گاؤں کے چوراہے میں اپنا ج کر کے پھینکنا ہے۔ بات بڑھ گئی گاؤں کا گاؤں دادا جی کی طرف ہو گیا۔ یہاں تک کہ سرخ کو مقدمہ واپس لے کر معافی مانگنا پڑی اور معاملہ وقتی طور پر دب گیا۔ بہر حال رویندر کو پاپا بھوں کی طرح بنا کر انہوں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔“

”پھر کیا ہوا۔“ اس نے پوچھا۔  
”تقریباً ایک سال تک کوئی بات نہیں ہوئی اور سن چوراسی کی بیساکھی آ گئی۔ میری شادی بھی ہو گئی تھی اور میں اس گاؤں میں رہ رہی تھی۔ تیرے باپو کی شادی بھی ہو چکی تھی اور تو پیدا ہو چکا تھا۔ اس برس تیرا پاپ دربار صاحب گیا اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ اندرا حکومت نے بہت بڑا ظلم کر دیا تھا۔ ترے سارے گھر والے تیرے باپ کی تلاش میں تھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے سکھ نو جوانوں کو پکڑ پکڑ کر مارا جا رہا تھا۔ کوئی اس ڈر سے بھی باہر نہیں نکلتا تھا کہ پتا نہیں واپسی ہو بھی یا نہیں۔ یہاں تک کہ



اندر لگانہ کی قاتل ہو گیا۔ پھر جو سکھوں پر بھاری آئی وہ یاد کر کے ہی رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

”ہم سن رہے تھے کہ گھر گھر تلاشیوں کی جارہی ہیں۔ لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ انہی دنوں میں اچانک ایک رات اس گاؤں کو بھی فوج نے گھیر لیا۔ مجھے اس وقت یقین ہوا جب وہ ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور انوجیت کے باپ کو پکڑ کر لے گئے۔ اس وقت انوجیت اس دنیا میں آنے والا تھا۔ میری حالت اتنی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر میں ہمت کر کے باہر نکلی تاکہ اپنے باپ کو بتا دوں۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ میرے باپ کو رہائیوں سمیت سب کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ پھر میں تم لوگوں کے گھر کی طرف گئی تاکہ تیرے دادا سے مدد لوں۔ مگر وہاں بھی سارے گھر کے مردوں کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ تیری ماں چاچی تائیاں رو رہی تھیں۔ اچانک گاؤں کے باہر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم تڑپ اٹھیں کہ نجانے کیا ہو گیا ہے۔ تیری ماں اور تائی تیار ہو گئیں کہ جا کر معلوم کر لیں۔ اس نے تجھے میری گود میں دیا اور وہ دونوں چل پڑیں۔ ہم تینوں ابھی دالان پار کر کے باہر والے بھانک سے نکلی ہی تھیں کہ سامنے سے ایک جھٹکا تانا ہوا دکھائی دیا۔ ہم فوری طور پر تونہ سمجھ گئیں لیکن وہ تیرے باپ اور دادا کو غلط گالیاں نکال رہے تھے۔ اس وقت نجانے کیوں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جو بلی پر حملہ آور ہوں گے۔ میں تجھے لے کر سامنے والے گھر میں گھس گئی۔ تیری ماں اور تائی واپس پلٹ کر پھاٹک بند کرنے لگی تھیں، لیکن نہ کر سکیں۔ فائرنگ ہوئی اور دونوں وہیں ڈھیر ہو گئیں پھر میں دیکھ تو کچھ نہ سکی لیکن حویلی سے فائرنگ کی آوازیں جیج و پکار ابھرنی رہی۔ پھر حویلی کو آگ لگا دی گئی۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے اندر تھے سب کو جلا دیا گیا حویلی کو آگ لگے سب نے

دیکھا لیکن کسی نے آگ بجھانے کی ہمت نہیں کی۔ میں پریشان تھی تو ہلک رہا تھا میں واپس گھر چلی گئی۔ وہیں تمہیں سمیٹ کر واگور کو یاد کرتی رہی۔ اس سے مدد مانگتی رہی۔

”پھر کیا ہوا؟“ جہاں نے دھیرے سے کہا۔

”ہونا کیا تھا گاؤں سے جتنے بھی مرد پکڑ کر وہ لے گئے تھے انہیں گاؤں سے باہر سڑک پر لے جا کر گولی مار دی تھی۔ ان پر دہشت گرد ہونے کا شک تھا۔ اس میں انوجیت کے باپ بھی.....“ عجبت کور کہتے کہ گئی پھر کافی دیر تک اس سے بولا نہیں گیا۔

”سوری پھوپھو.....“ جہاں نے مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس دوران عجبت کور نے خود پر قابو پایا تھا۔ اس لیے خود کو سنہال کر بولی۔

”وہ رات قیامت کی رات تھی میرے گھر کے صحن میں میرے شوہر کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ایک ماں کی گود سے انجانا بچہ اور خود میں میری ماں کے گھر میرے باپ اور بھائیوں کی لاشیں حویلی جل کر حواں دے رہی تھی وہاں سب تم بہ چوکے تھے۔ گاؤں کے کئی گھروں میں یہی قیامت ٹوٹی تھی۔ کون کس کو سنہالنا، صبح ہوئی تو گاؤں کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مجھے یاد رہا تو بس سکھ جیت کور کا چہرہ وہ آئی تو اس نے سب کچھ سنہال لیا۔ اس کا شوہر بہت سمجھدار بندہ تھا۔ اس نے سب کی آخری رسومات ادا کیں اور تجھے لے کر اپنے گاؤں چلے گئے۔“ اس وقت عجبت کور یوں ہو گئی جیسے اب اس سے بولنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس کی آنکھیں بھیک گئی تھیں۔ یہ بھی انوجیت بولا۔

”بے بے..... آگے بتاؤ نا اب جہاں کے سارے سوالوں کا جواب دو۔“

”بتاتی ہوں پتر.....! اس نے یوں کہا جیسے اپنے اندر کی ساری ہمتیں جمع کر رہی ہو۔“ پھر سکھ

جیت کور اپنے شوہر کے ساتھ چند دن بعد آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کینڈا جا رہے ہیں اور پھر میرا ان سے بہت عرصے تک رابطہ نہ ہوا۔ لیکن سکھ جیت کور کے سر نے میری بڑی دیکھ بھال کی اس نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا میں رہتی تو بیٹیں آدگی پنڈ میں لیکن میرا خیال وہی کرتے رہے۔

”پھر پھوپھو سکھ جیت کور سے آپ کا رابطہ کب ہوا؟“ جہاں نے بہت سوچ کر سوال کیا۔

”کوئی تین چار سال بعد وہ خود تو یہاں نہیں آتا چاہتی تھی لیکن اپنی ساری زمین اور جائیداد مجھے دینا چاہتی تھی ہمارے دو درمیان یہ تکرار سال بھر چلتی رہی۔ پر میں نے یہاں آپ کا جو کچھ بھی تھا وہ سنہال لیا اس میں سکھ جیت کے سر نے میری بہت مدد کی چند سال پہلے ان کا دیہانت ہو گیا ہے۔“ عجبت کور کافی حد تک سنہال گئی تھی۔

”لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔“ جہاں نے کہا۔

”وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم کبھی بھی بھارت واپس آؤ۔ وہ تم سے یہ سب کچھ چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ ادھر میری کوشش بھی تھی کہ جس کی امانت ہے اسے مل جائے۔ پتر.....! یہ گھر یہ زمینیں تمہاری ہیں۔ تم ان کے مالک ہو۔ ہم تو محض امانت سنہالے بیٹھے ہیں۔ میں نے ہی انوجیت سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح تم سے رابطہ کرے۔ یہ اس رابطے کا نتیجہ ہے کہ تم یہاں پر ہو۔“ یہ سب سن کر جہاں نے کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے منہ پھیرے ہوئے انداز میں بولا۔

”ایک سوال ہے پھوپھو..... انوج نے گاؤں کے ہمارے بڑے بھتیجے تھے کہ یہ خالصتان کے حامی ہیں اور فوج کے نزدیک دہشت گرد ہیں۔ لیکن گاؤں کے سرے گھروں کو جلا دیا نہیں گیا۔ اس بے دردی سے

ان کے گھروں کو تباہ نہیں کیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نہیں مارا گیا۔ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں؟“

”سرخ کی وجہ سے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔ ”سا کا چوراہی کے بعد لوگوں نے اپنی دشمنیاں بہت نکالیں۔ سرخ نے فوج کو گاؤں میں موجود ان لوگوں کے نام بتادیئے جو کسی نہ کسی حوالے سے خالصتان تحریک کے حامی تھے۔ یہ فوج اور حکومت کا سرچنوں پر دباؤ بھی تھا۔ لہذا جہاں انہوں نے خالصتان کے حامی سکھوں کے نام بتائے وہاں ان لوگوں کے نام بھی بتادیئے جن سے وہ کسی نہ کسی حوالے سے دشمنی رکھتے تھے۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے۔ حکومت نے فوجی طور پر تو قابو پایا مگر سکھ نسل کو چل کر رکھ دیا۔ یہ اب تک سنہال نہیں پائے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا پھوپھو.....! اب آپ آرام کریں۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ اچانک ہی جہاں اٹھ گیا تو باقی سب بھی اٹھ گئے۔ اس وقت جہاں کو خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔



ساری رات میرے بدن سے ٹپسیں اٹھتی رہیں۔ رات گئے بدن ٹھنڈا ہونے پر کئی جگہوں سے درد آگ آیا تھا۔ میری ماں دسی ٹوٹنے لگی زانی چلی جارہی تھی۔ درد کی ہر اٹھتی ہوئی میں کے ساتھ میرے اندر نفرت ابلی جارہی تھی۔ شاید میں اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کس کی منافقت کا شکار ہوا ہوں۔ پیر زادہ وقاص شاہ زیب یا پھر ملک سجاد میرے سامنے نکولن تھی اور میں سمجھ نہیں پار تھا کہ ان تینوں میں سے کون ہو سکتا ہے۔ پہلے دو کے بارے میں تو پھر بھی سوچا جاسکتا تھا، لیکن یہ تیسرا کون ہے؟ کیا وہ کوئی بلا شخص ہے کہ سامنے آئے بغیر ہی اتنا کچھ میرے ساتھ ہو گیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ

میری اس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ پھر ایک سوچ اور بھی تھی کہ کیا یہی بھگت سے گھڑی ہوئی کوئی کہانی تو نہیں؟ وہ منافقین جن کے بارے میں شک ہوتا ہے وہ ایسی ہی سازشیں کرتے ہیں۔ نجانے کتنے سوال تھے جو مجھے ذہنی اذیت دے رہے تھے اور یہی ذہنی اذیت میری قوت فنی، جلی جادہ تھی۔ میرے اندر ایسا آتش فشاں اکٹھا ہو رہا تھا کہ جس پر پھٹتا وہاں تباہی لازمی تھی۔ چاہے میں نہ رہتا یا پھر سامنے والا ختم ہو جاتا۔ ہمارے گاؤں کا واحد ڈسپنسر مجھے کچھ دوائیاں دے گیا تھا۔ جن سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ صبح دن چڑھے وہ شہر سے اعلیٰ قسم کے انجکشن اور دوائیاں لے کر آیا۔ اس نے جلدی جلدی مجھے لگائے تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ ساری رات کا جاگا ہوا اور کچھ دوائیوں کا اثر میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میری ماں میرے سر ہانے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ کھانے کو مانگا تو وہ یکن میں چلی گئی اور میں منہ ہاتھ دھو کر واپس چار پائی پڑ بیٹھا۔ میں کھانا کھا چکا تو ماں نے کہا۔ ”صبح سے تیرے کئی دوست پوچھ گئے ہیں۔ اب مجھے تم کچھ ٹھیک لگ رہے ہو۔ اب جاؤ باہر والے کمرے میں دو ہیں ان سے مل لینا۔“

میں نے تفصیل نہیں پوچھی۔ کیونکہ ماں نے کسی کا نام تو بتانا نہیں تھا۔ میں باہر والے کمرے میں چلا گیا۔ تازہ ہوا کے لیے میں نے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں پھر بیڈ پر آ کے لیٹ گیا جو دائیں دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ذہن کو ڈرا سکون ملا تو پھر وہی ٹکون میرے ذہن پر حاوی ہونے لگی جسے میں نے جھٹک دیا۔ خواہ خواہ دماغ کھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ جب تک ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں

ملتا۔ میں اندھیرے ہی میں تھا۔ میں ٹانگ ٹوئیاں مارا نہیں چاہتا تھا۔ انہی لمحات میں سوہنی چھم سے میرے خیالوں میں اتر آئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بولتی ہوئی آنکھیں، لفظوں کو محاسن بخش دینے والے ریلے ہونٹ اور جذبات کو لگدلا دینے والا تراشیدہ بدن میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ چند دن مزید یہاں رہنا چاہتی تھی مگر کیوں.....؟ یہ احساس جسم میں ایک لذت آگئی لہر دوڑا دینے کے لیے ہی کافی تھا۔ میں سوہنی کے خیالوں میں گم تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی، میں نے دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ میں اشفاق عرف جھاکا کھڑا تھا۔ وہ میری جانب عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اوائے آچھا کے۔۔۔۔۔ اوھر کیوں کھڑا ہے اھر آبیٹھ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس بیڈ پر ہی آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ٹنگ میری طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ تب میں نے پوچھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟“

”میں یہ دیکھ رہا ہوں جمال کہ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار پولیس تیرے گھر پائی اور تجھے پکڑ کر لے گئی۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے اس دن تو نے پندے ذہنی کر کے بھگائے وہ سوہنی تیرے گھر میں تھی۔ یہ اتنا سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ یہ کیا ہے سب.....؟“

”یار تیرے سامنے ہی ہے سب کچھ۔۔۔۔۔ میں نے عام سے لکچ میں کہا تو وہ بڑے گمبیر لکچ میں بولا۔“ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں مانتا ہی نہیں۔۔۔۔۔ کوئی ایسا چکر ہے جسے تو ہمیں بتانا ہی نہیں چاہتا۔ تو اب اتنا دوسر ہو گیا ہے کہ دوستوں کو بھی نظر انداز کر دیا؟“ وہ ایک ہی سانس میں گلے شکوے کر گیا تو مجھے برا عجیب سا لگا۔ یہ جھاکا تو ایسا نہیں تھا۔ یہ مجھ سے کیوں بدظن ہو

رہا ہے؟ میں نے چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوائے نہیں اوائے جھاکے۔۔۔۔۔! تجھے بتائے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کرتا، یقین جانو مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ سب ہو کیا رہا ہے؟“

”نہیں سمجھ آئی تو کسی سیانے بندے سے بات کر لیتے ہیں۔ کسی دیوار ہی سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ کوئی نیکوئی عقل کی بات آ جاتی ہے دماغ میں۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

”اب تجھ سے زیادہ سیانا بندہ دوسرا کون ہے میری جان لیکن کیا کروں بات کرنے کا وقت ہی نہیں دیا۔“

”میں تو اتنا جانتا ہوں جمائے“ بچپن سے لے کر اب تک پہلی بار تو نے مجھ سے ہٹ کر مجھے بتائے بغیر کچھ کیا ہے اور تو اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ میں کچھ نہ کچھ کو کرنا تا تیرے لیے۔“ اس نے چند لفظوں میں میری اوقات میرے سامنے رکھ دی۔ بچپن سے لے کر اب تک کے تجھانے کتنے واقعات چشم زدن میں میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ جب چھپا کے نے میرے لیے اپنی جان کی بازی تک لگادی تھی۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر آہستہ آہستہ اختصار کے ساتھ اسے ساری بات بتادی۔

”اب بتا میں تجھے کس وقت یہ ساری باتیں بتاتا۔“ ”تیری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تو شاہ زیب کی دعوت پر کسی کو بتائے بغیر اکیلا گیا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس دفعہ پہلی بار میلے میں لڑائی ہوئی ہے“ مطلب شاہ زیب کے دماغ میں کچھ تھا جو وہ اپنا لشکر تیار کر کے وہاں گیا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ میں نوان کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں ان کی چاکری کرنے کی۔ میں حیران ہوں کہ تو نے کس

## ”افسانہ“

جب میں نے پہلی بار تمہیں بھائی کے ساتھ دیکھا تو اسی وقت دل ہاری بھی اور جب تمہارا تعارف بھائی نے کر دیا تو میں تمہاری کچھ اور گردیدہ ہو گئی۔ تمہارا اسٹائل، انداز، اور تمہاری آواز سن کر میں تو دیوانی ہی ہو گئی۔ جب بھائی نے میرے جذبات میں تمہارے لئے پسندیدگی دیکھی تو میری خوشی کو مزید بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ یہ اب تمہارے ہی پاس رہے گا۔ یہ سن کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔ کیا دعا میں اتنی جلد قبول ہو جاتی ہیں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب تو میرے سب شب دروڑ تمہارے ساتھ ہی بسر ہوتے تھے۔ اور مجھے بھی تمہاری موجودگی تحفظ کا احساس دلاتی تھی اور بھائی کو بھی تم پر بلا کا اعتماد تھا اسی لئے ہر جگہ تم میرے ساتھ ہوتے تھے۔ پھر اچانک ہی ہماری خوشیوں کی بہار کو خزاں کی نظر لگ گئی۔ اور تمہارا ایک سیڈنٹ ہو گیا۔ چوٹ تو تمہیں کم آئی تھی مگر میرا صدمہ سے برا حال تھا۔ اے میرے پیارے ”موبائل“ تم جلدی سے پہلے کی طرح ”ٹوٹوٹوٹو“ کرنے لگ جاؤ۔

(ارم رٹن)

مقصد کے لیے اس کی دعوت قبول کی۔ ”چھاکے کے لکچ میں دبا دبا غصہ تھا۔

اس کی حیرت بجا تھی۔ میرا شاہ زیب کی دعوت قبول کر لینے میں اپنا مقصد تھا۔ مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنا مقصد چھاکے ہی کو کیا اپنے سائے کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میرے مقصد کی کامیابی اسے راز ہی میں رکھنے سے تھی۔ یہی میری قوت تھی اور یہی مجھے بناتے سنوارنے اور میری تربیت کر دینے والی ان دیکھی طاقت تھی۔



”بس یونی یار! اس نے مجھ سے کہا اور میں نے ہاں کر دی۔ پھر میں چلا گیا۔ اب دیکھو اگلے ہی دن ان کا مقصد سنا منے آ گیا۔“ میں نے چھاکے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”یار جس طرح پولیس والوں کے بارے میں مشہور ہے نا کہ ان کی دوستی بھی بری اور ان کی دشمنی بھی بری۔ اس طرح ان جاگیرداروں، وڈیروں اور سیاست دانوں کی دوستی دشمنی دونوں ہی بری ہیں۔ یہ انسان کھا جاتے ہیں۔ دونوں کی سیاست کرتے کرتے یہ انسانوں کی قسمت سے کھیلنے لگتے ہیں۔ کیا تجھے نہیں پتا۔“ اس نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ تب میں نے اسے تھوڑا اٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

”چل یار غلطی ہوگئی۔ معاف کر دے۔ اب بتا باقی کدھر ہیں۔ آئے نہیں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اب نہیں آئیں گے وہ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے اپنے گھروں کو گئے ہیں۔ تب سبھی باری باری کئی چکر تیرے گھر کے لگا چکے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر نگلیہ اپنی رانوں میں دبا کر بولا۔ ”جمال۔۔۔۔۔! غور کیا ہے تو نے وہ جیپ لے کر آنے والے بندے کون تھے؟“

”مجھے تو سردار شاہ دین پر شک ہے۔ اس نے باہر سے بلوا کر یہ بندے مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ میں ان کی بات مان لوں اور شاہ زیب کے ساتھ اس کا باڈی گارڈ بن کر لاہور چلا جاؤں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میرا دل نہیں مانتا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خاموش پا کر وہ کہتا چلا گیا۔

”میں یہ مانتا ہوں کہ سردار شاہ دین ایک منافق سیاست دان ہے۔ اس سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ گھٹیا کام بھی کر سکتا ہے لیکن اپنے ہی بچہ میں اور کم از کم تیرے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں ایسا نہیں کر سکتا؟ وہ سیاست دان بنی نہیں ہوتا جو اپنے مخالفین کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے۔“

اس نے میری صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی ناکامی پر سوچا ہوگا کہ یہ کسی دن اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ سو اس نے فوراً ہی۔۔۔۔۔

”تم غلط ٹریک پر سوچ رہے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری بندے پر کھنے کی صلاحیت کدھر گئی یار کیا تم نہیں جانتے ہو کہ سردار شاہ دین اس وقت تک مخالف کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہو جائے اس کی یہ خوبی ہے جسے ماننا چاہیے آج نہیں تو کل آنے والا وقت بتا دے گا کہ یہ حملہ شاہ دین نے نہیں کروایا۔“ اس نے تیزی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ تب میں نے مجس سے پوچھا۔

”تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟“

”سوچ۔۔۔۔۔! اور جتنا چاہے سوچ لے اس حملے کے پیچھے نہ سردار شاہ دین ہے اور نہ ہی بیروزادے ہیں تیسرا اگر کوئی ہے تو اس کا سراپا ملے کے اس پنڈال میں ہے چونکہ یہ سب میرے دھیان میں نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی تمہاری طرح اندھیرے میں ہوں۔ تو سوچ اور وہ سرا تلاش کر۔۔۔۔۔ پھر اس تیسرے تک پہنچ جانا مشکل نہیں ہوگا۔“ چھاکے نے گہری تنیدگی سے کہا تو میں چونک گیا۔ اس کی بات سو فیصد درست تھی۔ میرے دل کو لگی تھی۔ پہلے میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ ایک دم سے وہ میلہ اس میں جا ہوا پنڈال میری نگاہوں کے سامنے واضح ہو گیا۔ چند لمحے غور کرتے رہنے کے باوجود مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تب میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”یار مجھے نہیں لگتا کہ وہاں کچھ ہو۔ یہ جو ہنگامہ وہاں پر ہوا ہے اس میں کسی کی کیا منصوبہ بندی تھی۔ شاہ زیب اگر اپنا لالہ لشکر بنا کر لے گیا تھا تو یہ کون سا نئی یا انوکھی بات تھی۔ ہر سال ایسے ہی ہوتا ہے۔ اس بار اس نے مجھے دعوت دی اور۔۔۔۔۔“

”اور تیری وجہ ہی سے وہ وہاں سے بچ کر نکلے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ وہ وہاں سے کب نکلا زخمی کون اٹھا کر لایا“ تجھے تو یہ تک معلوم نہیں کہ بندے کتنے زخمی ہوئے ہیں۔“ اس نے بھڑکتے ہوئے کہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”خیر۔۔۔۔۔! میں نہیں کہتا کہ تو ابھی اپنے دماغ پر بوجھ ڈال سکون سے تنہائی میں بیٹھ کر ایسے کسی تیسرے کے بارے میں سوچ۔ یہ ہنگامہ وہاں سے شروع ہوا ہے تو ان حملہ آوروں کا سراغ بھی تجھے وہیں سے ملے گا۔“ چھاکے نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر بات بدل کر وہ تھانے میں ہونے والے واقعہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ کرم علی ڈسپنسر آ گیا۔ اس نے میری طبیعت پوچھی۔ میں نے اسے بتایا تو بولا۔

”ابھی تیرے صرف ایک انجکشن مزید لگنا ہے۔ دوائی کھا کر وہ انجکشن لگوالے۔ صبح تک تو بہت بہتر ہو جائے گا۔ باقی یہ اندرونی جو میں ہیں۔ پوری طرح ٹھیک ہونے میں چند دن تو لگیں گے۔“

”چل پھر لگا دے انجکشن، دوائی میں کھانچا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

”اندر چل وہاں لگا تا ہوں۔ انجکشن لگنے کے بعد تجھے نیند آ جائے گی۔“

”تو بے فکر ہو جا“ میں ادھر ہی ہوں۔ دروازے لگا کر چھت پر سو جاؤں گا۔ تو جاندر۔“ چھاکے نے کہا تو میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں واقعتاً بے فکر ہو گیا تھا۔

مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ چھت پر سوئے گا نہیں بلکہ پوری رات جاگ کر پہرا دے گا۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ حسب معمول اماں جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پرندے چچہارے تھے۔ گاؤں میں صبح سویرے ہونے والی روایتی معمولات کی دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اٹھ کر محن ہی میں ٹھٹھکے لگا۔ ابھی اماں جائے نماز سے اٹھ گئیں۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر میں ماں نے لسی کا گلاس مجھے ٹھمایا اور بولیں۔

”چل اٹھ کر نہا لے لسی تیرے کپڑے نکال دیتی ہوں تازہ دم ہو کر ناشتہ کرنا۔“

”چھا کا۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے گھر چلا گیا ہے۔“ ماں نے کہا اور بچن کی طرف پلٹ گئیں۔ میں نے سکون سے لسی پی اور تازہ دم ہونے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا۔

اس وقت میں تیار ہو کر ناشتے کے انتظار میں تھا جب پھانک کے باہر بھاری جیپ رکی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹرک رکنے کی آواز آئی۔ میں چونک گیا۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟ میں نے سرہانے پڑا اپنا پٹل ٹٹولا اور اسے نیچے میں اُٹس لیا۔ پھر اٹھ کر پھانک کی طرف بڑھا۔ ابھی میں پھانک سے چند قدم کی دوری پر تھا کہ پھانک کھلا اور سونہنی اندر آ گئی۔ میں اسے پہلی نگاہ میں پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس کے تھکے تھکے حسین چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کسی سسنان معبد میں وہاں سلگ رہا ہو۔ اس نے زلفوں کو گس کر باندھا ہوا تھا۔ پتلون پر ڈھیلا ڈھالا چمک دار کرتا پاؤں میں نازک سے لیڈر سلپرز میک اپ سے بے نیاز چہرہ اور میری جانب دیکھتی ہوئی گہری آنکھیں۔



”تم.....؟“ میں نے کافی حد تک حیرت سے پوچھا۔

”کیوں میں نہیں آسکتی کیا؟ خیر.....! یہ بحث بعد میں کر لینا لیکن میرے ساتھ کچھ لوگ ہیں انہیں باہر والے کمرے میں بٹھاؤ۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور جواں سال لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کی جگہ پر نگاہ پڑی اور پھر دیکھی سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کافی سارے شاہجنگ بیک پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے تعارف کی زحمت نہیں کی۔ کیونکہ اس وقت میرا ایک دوست طیفانہ نمودار ہوا۔ وہ پھانک میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے باہر والا کمرہ کھولنے کو کہا۔ وہ اندر چلا گیا تھا تو میں دالان میں آ گیا۔ وہاں سوہنی ماں سے مخاطب تھی۔

”اماں آپ بس اندر میرے پاس بیٹھیں۔ یہ فری ہے تا سب کچھ بنا لے گی آپ فکر نہیں کرو۔“

”اسے کیا پتا کون کی چیز کہاں رکھی ہے؟“ ماں نے کہا لیکن اس دوران فری بچن کے لیے چلی گئی تھی۔

”وہ دیکھ لے گی.....! آپ میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے اماں کو کاندھوں سے پکڑا اور اپنے قریب چارپائی پر بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ تبھی میں نے اس سے بڑے محل سے پوچھا۔

”یہ تم..... یہاں واپس کیوں آئی ہو؟“

”میں پھر یہی کہوں گی کہ کیوں میں نہیں آسکتی ہوں کیا؟“ وہ ہنسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو تو سکتی ہو مگر اس قدر جلدی پلٹ آنے میں کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی۔ میرے خیال میں تو ابھی تک تیری تھکن بھی نہیں اتری ہوگی۔“

”یہ سچ ہے کہ ابھی تک میری تھکن نہیں اتری مگر

میں آگئی۔ میں کیوں آئی ہوں یہ بھی میں تمہیں بتا دوں گی لیکن پہلے تم دو کام کرو ایک تو یہ کہ گاؤں سے چند منزل دور منگواؤ جو ٹرک میں سے سامان اتار کر یہاں رکھیں۔ دوسرا ان لوگوں کو ناشتہ واشتہ کروا کر فارغ کر دو پھر سہولت سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اس نے تیز تیز انداز میں کہا تو میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ذرا تم کیا کر رہی ہے تو..... سیدھی بات بتاؤ یہ ٹرک میں سے سامان اتارنے والی دج کیا ہے؟ کس کا سامان ہے یہ..... یہاں کیوں لائی ہو تم؟“

”اوسر کارا اتنا غصہ کیوں ہوتے ہو۔ میں یہ سامان اپنی ماں کے لیے تھے کے طور پر لائی ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تم مزور نہیں لاسکتے تو نہ سہی میں خود خود ہونٹ لاؤں گی اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ مجھے کسی گاڑی میں اڈے تک چھوڑ آؤ میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں اور میرا ڈرائیور میرے ساتھ ہے۔ وہ پہر ہونے سے پہلے میں واپس پلٹ جاؤں گی۔ اب کوئی ہے تمہیں اعتراض؟“ تبھی مجھے یک دم سے ہی اس پر غصہ آ گیا۔ اس نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟ میں نے بھنا کر کہا۔

”اؤئے..... اؤئے سوہنی..... تمہیں ہمارے گھر میں کس شے کی کی نظر آتی ہے ہم سادہ زندگی گزارنے والے لوگ ہیں پھر بھی اس گھر میں ہر سہولت میرے ہر اور پھر تیرے تھے ہم کیوں قبول کریں۔ لے جاؤ واپس لے جاؤ اپنا یہ ٹرک ہمیں تیرے تھکن کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہیں ضرورت ہے یا نہیں میں نہیں جانتی“ کیونکہ میں تیرے لیے نہیں ایک ماں کے لیے لے کر آئی ہوں اور تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ اگر اب بھی تمہیں اعتراض ہے تو میں سامان لگی میں

اتر وادوں گی۔ تم اسے آگ لگا دینا اگر تم میں ہمت ہوئی تو..... اس بار وہ غصے میں بولی تھی ابھی میری نگاہ جھانکے پر پڑی جو بجائے کب سے صحن میں کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایسے میں اماں نے کہا۔

”جمال.....! تیری اس کے ساتھ کیا بحث ہے تو جاندر کمرے میں جا کر آرام کر میں تیرا ناشتہ ادھر ہی بچواؤ جیتی ہوں۔“ پھر چھانکے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اؤئے چھانکے لے جا لے اندر۔“ ماں کے یوں کہنے پر میں اٹھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ میں حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں بیڈ پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ یہ سوہنی آخر کر کیا رہی ہے اور یہ چاہتی کیا ہے؟ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ دہے قدموں سے اندر کمرے میں آگئی چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر بلا تکلف میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”دیکھ جمال.....! یوں غصہ نہ کر میں شاید پلٹ کر کبھی یہاں نہ آئی“ لیکن مجھے آنا پڑا اسے میری مجبوری سمجھ لیں یا پھر..... جو تیرا دل چاہے۔ اگر تم مجھ سے نفرت کرتے ہو یا پھر تمہارے خیال میں ہم کوئی گھٹیا مخلوق ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھے اس سے بالکل انکار نہیں ہے کہ میں طوائف ہوں۔ میرا وجود ہی اس سانچ میں ایک گالی ہے۔ تم بھی اگر مجھ سے نفرت کرو گے تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم طوائف ہو یا نہیں مگر جو تو ذرا سے بازی کر رہی ہے نا اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ یہ تم کر کیا کر رہی ہو وہ کون سی مجبوری ہے جو تمہیں یہاں لے آئی ہے؟“

”یہی تو میں تمہیں بتانے کے لیے آئی ہوں“

یہاں اتنا سفر کر کے تھکن اتارے بغیر۔ اس نے میرے چہرے پر دیکھا اور پھر میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بڑے اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم اب بھی پریشان ہونا کہ جیب پر آنے والے وہ حملہ آور کون تھے۔ تم اب بھی اچھے ہوئے ہو کہ اس کے پیچھے کون ہے پیر زادہ ہے یا شاہ زیب.....؟ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ دونوں ہی نہیں ہیں۔“

”تو پھر کون ہے وہ.....؟“ میں نے تیزی سے بیڈ کی ٹیک چھوڑتے ہوئے پوچھا حالانکہ اس دوران میرے بدن سے کئی جگہوں پر نیپس اٹھی تھیں۔

”وہ جو کوئی بھی ہے تم اسے چھوڑو اس وقت اگر وہ اندھیرے میں ہے تو اسے اندھیرے ہی میں رہنے دو۔ حملہ آور بھی اس کی طرف سے تھے اور پولیس بھی اس نے بھیجی تھی۔“

سوہنی نے کہا تو میرے تپ بدن میں آگ لگ گئی۔ ان دیکھا دار کرنے والا دشمن اندھیرے میں تھا اور یہ اسے اب بھی اندھیرے ہی میں رکھنا چاہتی تھی۔ دشمن کا ساتھ دینے والا بھی دشمن ہوتا ہے اور وہ مناقب جو سازش کر کے خود اندھیرے میں رہنے کی کوشش کرے اس کے باپ پر تو ویسے ہی شک ہوتا ہے کیا یہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے آئی ہے؟ میرے دماغ میں غصے کی آگ بھری لہر اٹھی اور میں نے زانے سے ایک پیٹر سوہنی کے چہرے پر ناز دیا۔ وہ الٹ کر بیڈ سے نیپے جا گری۔ لمحوں میں اپنا بٹل نکالا اور اس کا سیٹھی ٹیوٹا ہٹا دیا۔ بھی سوہنی کی آنکھوں میں دہشت پھیل گئی۔ وہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی۔ خوف کے عالم میں اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ زمین پر گری پڑی تھی میں نے بیڈ پر بیٹھ ہوئے ہی ایک پاؤں اس کی گردن پر رکھا اور بٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے

ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

”بولو..... کون ہے وہ..... ملک سجاد ہے؟“

”آں..... آں..... ہاں..... وہ..... یہی ہے.....“

..... میں تجھے بتاتی ہوں نا..... اس نے گھکھکیانے

انداز میں کہا، لیکن میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے اس سے پوری بات معلوم کرنا تھی، لیکن اسی لمحے

اماں اندر داخل ہوئی اور تیزی سے بولیں۔

”جمال..... یہ کیا کر رہے ہو تم..... چھوڑو

اسے..... پاگل ہو گئے ہو۔“

اس حکم کے سامنے میں بے بس تھا، میں نے نال

اور پاؤں ہٹایا اور بیڈ پر سیدھا ہو گیا۔ وہ تیزی سے

اٹھی اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر مرش

لہجے میں بولی۔

”میں تجھے سب کچھ بتا دیتی لیکن ذرا صبر تو

کرتے..... تم.....“

”تم ایک ہی سانس میں سب کچھ بتاؤ، خیریت

اسی میں ہے.....“ میں نے تیزی سے کہا۔

”لیکن تم وعدہ کرو کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں

کرو گے، ورنہ تمہارا غصہ تمہیں بہت نقصان

پہنچا دے گا۔“ اس نے کافی حد تک اعتدال سے کہا تو

مجھے غصہ آ گیا۔

”اب تم گواہ کر دو گی یا نہیں۔“

”میں ساری بات تمہیں بتا دیتی ہوں.....“ یہ کہہ

کر اس نے اماں کی طرف دیکھا اور خجالت بھرے

انداز میں بولی۔ ”اماں..... اس سے وعدہ لو کہ یہ جو

کچھ بھی کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا، وہ لوگ اس کی

سوچ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔“

”سوہنی پتر! جو یہ پوچھتا ہے وہ ساری بات اسے

بتا دے، یہ نہیں میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہ ایسا دیا

کچھ نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا اور پھر مجھ سے ذرا

سا فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ گئی، چند لمحے خاموش رہی پھر

میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ملک سجاد کے بارے میں تم جانتے ہی ہو، جو

وفاقی وزیر ہے۔“

”ہاں..... نام سنا ہے اس کا.....“ میں نے کہا۔

”یہی اماں کا کافی حد تک مطمئن ہو کر باہر چلی گئی۔

”تم نے فقط نام سنا ہے اسے جانتے نہیں ہو

خیر.....! میں جو یہاں آئی ہوں تو صرف اس وجہ سے

کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں۔ اسے بہت بڑی غلط فہمی

ہو گئی تھی۔ میں..... میں تمہیں شروع سے بتاتی

ہوں.....“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ہمتی چلی

گئی۔ ”ملک سجاد، خوشاب کے علاقے کا بہت بڑا

زمیندار ہے، ایم این اے کی سیٹ ان کی خاندانی سیٹ

ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ بڑے بڑے بندہ محاش، مخالف

استبداری اور نجانبانی کیسے کیسے مجرم اپنی پناہ میں رکھتے

ہیں۔ انہی کے ذریعے علاقے پر اپنی دھاک جما کر

رکھتے ہیں لیکن وہ جو بھی میرے میرا عاشق ہے مجھ پر جان

دیتا ہے میری مار نے مجھے اس کے ہاتھ بیچ دیا ہے

لیکن ابھی اس..... میری تھ نہیں کھولی بھاری رقم کے

علاوہ ایک کوٹھی اور ازار مجھے دی ہوئی ہے، پر وہ مجھے ذرا

بھی اچھا نہیں لگتا، میرے پاس ہوتا ہے تو مجھے اگائی

آئی ہے اس سے..... میں اس سے جان چھڑانا چاہتی

ہوں اس لیے اسے فریب نہیں لگنے دیتی ماں سے بھی

کہہ دیا ہے کہ وہ..... یہ سب کچھ واپس کر دے۔“

”تم اس کے قہر دے ہی پڑ جیتی رہو گی بیابا، یہی

بتاؤ گی۔“ میں نے اکتاے ہوئے کہا۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں کہ جب میرے خاندان

کی لڑکیاں یہاں آ کر تاپنے کو تیار ہو رہی ہیں تو میں

نے یہاں آنے کا ارادہ کر لیا..... ملک سجاد کو یہ بات

بہت ناگوار گزری، وہ قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ میں یہاں

آ جاؤں، مگر میں نے ضد کی اور باوجود اس کے روکنے

کے میں آ گئی۔ اس نے میرے پیچھے بندے بھیج

دئے کہ مجھے اٹھا کر لے جائیں اب یقیناً ان کا داؤ

نہیں چلایا پھر ان کی ہمت نہیں بڑی، وہ مجھے اغواء تو نہ

کر سکے، مگر جب پنڈال میں تم لوگوں کی لڑائی ہو گئی،

فائرنگ ہوئی تو ہم وہاں سے نکلیں۔ قدرتی طور پر

انہیں موقع مل گیا، وہ مجھے گھیرے ہوئے ایک طرف

لے گئے، چونکہ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ ملک سجاد کے

بندے ہیں میں تو انہیں متاقی لوگ ہی سمجھ رہی تھی۔

ایک نے مجھے بازو سے پکڑ بھی لیا تھا اور ایک طرف

لے جانے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا، میں نے تو یہی

خیال کیا کہ وہ مجھے مال غنیمت سمجھ کر لے جانا چاہتا

ہے اس لیے میں نے اپنا بازو چھڑایا اندھا دھند

بھاگتے ہوئے فصلوں میں جا چھپی اور پھر تم مجھے مل

گئے اصل غلط فہمی یہیں سے ہوئی۔“

”مطلب..... میں سمجھا نہیں۔“ میں نے تیزی

سے پوچھا۔

”میں سمجھاؤں گی تو تم سمجھو گے۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکا

سا مسکرائی اور پھر بولی۔ ”وہ ساری رات مجھے تلاش

کرتے رہے تھے لیکن میں نہ ملی اور پھر دوپہر تک

انہوں نے کھونج لگا لیا کہ میں کہاں پر ہوں اس میں

انہوں نے پولیس کی مدد بھی لی تھی اور تیرے علاقے

کے کچھ پولیس کے خیر بھی ہیں جو اس معلومات

کا سبب بنے ہیں۔ اصل کام ہے ان کو تلاش کرنا، جو

گھر کے بھیدی ہیں اور تیرے مخالف.....“

”تو اپنی بات مکمل کر سوہنی میں جانتا ہوں مجھے کیا

کرنا ہے۔“ میں نے پھر اکتاے ہوئے کہا۔

”وہ جیب والے لہلہا در ملک سجاد ہی کے تھے۔

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا سامنا

ماہر نشانہ باز سے ہوگا۔ وہ مار کھا گئے، جس پر ملک

نے پولیس کو پوری طرح استعمال کیا اور وہ مجھے پکڑ

کر لے گئے۔ میں جو وہاں لاہور پہنچی ہوں تو مجھے

ساری تفصیلات کا پتا چلا میں اس لیے واپس آئی

ہوں کہ.....“

”بس تیرا کام ختم ہو گیا۔ اب تو ناشتہ واشتہ کر اور

واپس چلی جا.....“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ

میرے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”دیکھ جمال.....! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ یہ سب

میری وجہ سے ہوا۔ ایک بات تو اپنے غصے کو پی جا اور مجھ

پر احسان کرو، بھول جا اس واقعے کو..... میں بہت

شرمندہ ہوں..... میرا تجھ سے وعدہ رہا، میں اس سے

بدلہ ضرور لوں گی اور تجھے ہمارا کرلوں گی بدلہ.....“

”میں پاگل نہیں ہوں کہ اس پر چڑھ دوڑوں گا۔

میں مان لیتا ہوں تیری بات..... لیکن وعدہ کر، میں جو

کچھ بھی کروں گا..... تم میری مدد کرو گی.....“ میں نے

ایک خیال کے تحت اس سے کہا تو وہ خاصی حد تک

مطمئن ہو گئی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد

فری ناشتہ لے کر آ گئی۔ اس نے کافی کچھ میرے

سامنے رکھ دیا۔ میں سوچتے ہوئے ناشتہ کرنے لگا۔

ناشتہ کرنے کے کچھ دیر بعد میں صحن میں گیا تو

مزدور سامان اتار کر صحن میں رکھ رہے تھے۔ مجھے

یوں لگا کہ جیسے وہ میرے خاموش ہو جانے کی قیمت

ادا کر رہی ہے۔ یہی میں نے جا کر سوہنی سے پوچھا۔

”یہ سارا سامان کتنے کا آیا۔ یہ صوفے یہ

فرق..... یہ دوسرا سارا الیکٹرونکس کا سامان.....“

”میں نے جمع نہیں کیا، بس جلدی جلدی میں

لے لیا.....“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی..... اندازہ تو ہوگا.....“ میں نے پوچھا تو

اس نے چھ ہندسوں میں اندازے سے رقم بتائی۔ میں



نے خاموشی سے سنی اور پھر اوپر چھت پر موجود کمرے میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے اتنی رقم نکالی پھر کچھ زائد رقم نکال کر نیچے آ گیا۔ فری اور سوہنی اماں کے پاس ہی صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں، میں نے وہ رقم لے کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”یہ تو رقم..... اور دوسری بات نہیں کرنی، جب سامان اتر جائے تو اپنے ساتھ لائے لوگوں کو لے کر فوراً چلی جانا، میں کچھ دیر بعد واپس آؤں تو تم یہاں پر نہیں ہونا.....“

”جمال..... یم.....“ اس نے تیزی سے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”خاموش..... کہانا دوسری بات نہیں کرنا۔“ یہ کہہ کر میں نے زائد رقم اماں کو تھماتے ہوئے کہا۔

”اس لڑکی کو دے دینا جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ خالی ہاتھ جائے، اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔

باہر والے کمرے میں چھپا کا ایک کمری پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس سے بایک نکال لائے کو کہا، وہ اندر جا کر بایک نکال لایا تو میں نے ڈیرے پر چلنے کو کہا۔ ہم اپنی گلی سے نکل کر ڈیرے کی جانب چل دیے۔ میرا دماغ جب بھی سوہنی اور ملک سجاد کے بارے میں سوچتا گرم ہو جاتا، ایک طوائف کا کیا بھروسہ وہ شاید اس وقت میرے گھر میں بیٹھی ملک سجاد ہی کی وکالت کر رہی ہو، رکھیل اپنے رکھنے والے ہی کی سلاستی چاہے گی، میں یہی سوچتا رہا اور چھپا کا ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں جا کر میں نے اطمینان سے ساری بات اسے بتادی وہ ساری بات سن لینے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

”جمال..... یہ تو ج ہے کہ معاملہ کو ٹھنڈا کر کے ہی دیکھا جائے، لیکن پہلے خبروں کی خبر لیں، باتی بعد

میں دیکھیں گے۔“ اس نے کہا تو میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا۔ میں بھی اسی بج پر سوچ رہا تھا۔

.....

صبح کی طلائی کر میں اپنا آپ زمین پر بچھا کر رہی تھیں۔ جہاں سنگھ کوشی کی چھت پر کھڑا دور تک پھیلے ہوئے تھیوت کو دیکھ رہا تھا۔ اوائل فروری کے دنوں میں گندم کی فصل سے زمین سبز دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں کہیں کوئی دوسری فصل اپنے گہری یا کم گہری رنگت کے باعث الگ الگ نظر آ رہی تھی۔ مشرق میں دور تک کھیت ہی کھیت تھیں جبکہ مغرب کی جانب اوگی گاؤں تھا جو بہت زیادہ پھیلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھل گئی تھی جب سورج نہیں نکلا تھا۔ وہ بہتر میں پڑا نہ رہ سکا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چھت پر چلا آیا۔ اسے پنجاب کی یہ کھلی بوا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ بہت ساری سوچیں اس کے دماغ میں آ رہی تھیں، مگر وہ کچھ وقت کے لیے اس منظر میں کھوجانا چاہتا تھا۔ یہ منظر اس نے صرف فلموں میں یا پھر تصویروں میں دیکھے تھے۔ مگر سوچ پر قابو کون رکھ سکا ہے؟ خیالوں پر گرفت نہیں ہو سکتی، یہی وہ عطیہ ہے جس سے انسان خود کو قوت کے ساتھ آگے ہی آگے دھکیل رہا ہے۔ خیال ہی زندگی میں رنگینیاں پیدا کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان مناظر میں کھویا ہوا تھا مگر لا شعوری طور پر سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بھارت کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی اس کے لیے حیرت ہی کے دروازے کھولے تھے۔ ایک ہی دن میں انکشاف در انکشاف نے اسے پوری جان سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بھارت کی سر زمین پر اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب گولڈن ٹیمپل میں تو وہ ماتھا ٹکے گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جو کچھ اس نے آج تک وہاں کے بارے میں سنا

ہے تصویروں یا فلموں میں دیکھا ہے، وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، لیکن..... اس کے ساتھ ہوا کیا؟ وہاں پر جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا، وہ خود ہی جانتا تھا۔ اس کی وضاحت وہ کسی سے نہیں سکتا تھا۔ اس خیال کے اتے ہی وہ پھر سے اپنی کیفیت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ انہی لمحات میں اس کے اندر سے یہ سوال ابھرا کہ آیا وہ اپنی ان کیفیات کے بارے میں کسی کو بتائے یا نہیں؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہاں مگر وہ یہ ضرور سمجھ رہا تھا کہ اسے ”اشارہ“ ہوا ہے، اس نے یہاں پر کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ایک طرح سے اسے اپنے خیالوں خواہشوں اور امیدوں کی تائید مل گئی تھی۔ اس کے لشعور میں کہیں نہ کہیں یہ تھا کہ جس طرح اس نے اپنا مقصد چھپا کر رکھا ہے اس ”اشارے“ کو بھی اپنے تک رکھے اور اگر واگورڈ نے چاہا تو خود ہی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس میں اس راز کو افشا کرنا ضروری ہوگا۔

اور پھر جیسے ہی وہ گاؤں میں داخل ہوا تو انوجیت کے بارے میں انکشاف ہو گیا۔ وہ اس کے اتنا قریب بھی ہو سکتا ہے جب تک وہ اس گاؤں میں نہیں پہنچا تھا، اسے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے قریبی لوگوں کے ہاں جا رہا ہے۔ اس کی ملاقات ایسی ہستی سے بھی ہو جائے گی جس کے باعث اسے نئی زندگی ملے گی۔ اگر اس رات عجیب کو اپنے گھر سے نکل کر ان کی حویلی کی طرف نہ آئی تب وہ بھی دوسرے سب کے ساتھ آگ میں جل گیا ہوتا۔ اگرچہ زندگی دینے اور لینے والا وہی مالک ہے جس نے پیدا کیا۔ تاہم اس دنیا میں اس رب نے اپنے بندوں ہی کے ذریعے سب کچھ کروانا ہوتا ہے۔ پھوپھو سکھ جیت نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ برست آئے لیکن وہ آ گیا۔ انوجیت کے بارے میں، وہی

سمجھتا رہا تھا کہ اس نے انوجیت کو دست بنا کر رکھا ہوا ہے حالانکہ انہوں نے خود اسے تلاش کر کے اس کے ساتھ نیٹ دوستی رکھی ہوئی تھی۔ اپنے شیر خوارگی کے دور سے لے کر اب تک اگر وہ سوچے تو اس میں سے کیا نکلتا ہے کہ وہ دائرے کا پابند ہے اور پھر سے دیں پر آن کھڑا ہوا ہے جہاں سے وہ اٹھائیں برس پہلے چلا تھا۔ اب اس کے پاس کیا تھا..... آگ کے سوال اس کے من میں کچھ نہیں تھا۔ انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ، لیکن وہ لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے جن سے اس نے بدلہ لینا تھا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہی سوال اس کے لیے سب سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے اسے ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا۔ ان کے بارے میں معلومات ہی سے وہ آگے بڑھ سکتا تھا اس کا آغاز کہاں سے کرے؟ کیا انوجیت اس قدر بھروسے مند ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں اتنا حوصلہ اور جرات ہوئی کہ وہ اس پر اعتماد کر کے سب کچھ بتا دے؟ کیا وہ اس کا بہترین ساتھی ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا وہ.....

”آپ ادھر ہیں میں ادھر کمرے میں دیکھ رہی تھی آپ کو.....؟“ ہر پریت کور کی آواز نے اسے خیالوں سے باہر لا پھینکا۔ کبھی اس نے گھوم کر دیکھا۔ سفید لباس، میک اپ سے بے نیاز چہرہ، کھلی زلفوں کے ساتھ وہ سراپا سوال بنی اس کے سامنے تھی۔ چونکہ وہ میٹھیوں چڑھ کر آئی تھی اس لیے ہلکے ہلکے لرزتے وجود سے وہ اپنی تیز سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہصوم ساجن سیدھا اس کے دل میں اترتا چلا گیا تھا۔ کبھی اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی ہے منظر دیکھنے یہاں چھت پر آ گیا تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، میں پہلی بار یہ نظارے دیکھ



رہا ہوں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ شوخی سے بولی۔  
 ”دیئے میرے لیے بڑی عجیب سی بات ہے کہ ان کھیتوں کے نظارے آپ کو اتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ ظاہر ہے ہم نے تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں دیکھا مگر آپ نے نہیں۔“  
 ”یہ تو فطری سی بات ہے ناہر پریت۔! جس کے پاس جو چیز جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اس کے لیے اتنی ہی بے اہمیت ہوتی ہے۔“ جہاں نے عام سے انداز میں کہا تو پھر وہ اسی شوخی ہی سے بولی۔  
 ”لیکن سب چیزوں کے بارے میں ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً دولت۔۔۔ زیادہ تر لوگ یہی چاہتے ہیں کہ ان کے پاس زیادہ ہو اور اس کی اہمیت بھی بہت ہوتی ہے۔ کسی کا پیار۔۔۔ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اچھا ہے۔“  
 ”ٹم ٹھیک کہتی ہو۔“ اس نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”اچھا آپ ناشتہ کر لیں آ کر۔۔۔ اور اگر آپ کو یہاں بہت اچھا لگ رہا ہے تو میں ناشتہ یہاں لے کر۔۔۔“  
 ”نہیں اتنا سب کچھ یہاں لاؤ گی۔ چلتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔  
 ”چلیں پھر آئیں۔“ یہ کہتے ہی وہ اگلے قدموں پلٹ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اس کے آگے آگے سبز ہیاں اتر رہی تھی وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا اسے وہ ہرنی کے جیسے لگی۔ پتلی سی کمر لچکتی ہوئی بل کھاتی ہوئی وہ پڑھیاں اتر رہی تھی۔ وہ یونہی آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل پر جا پہنچے جہاں طہجیت کو رہنے کے لیے ان کا انتظار کر رہی تھی۔  
 ”آپ۔۔۔ بیٹھنا ناشتہ کر۔“

”او۔۔۔۔۔! یہ تو آپ نے اتنا اہتمام کر لیا۔“ جہاں نے بھری ہوئی میز پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ سب ہر پریت نے کیا ہے۔“ طہجیت کو رہنے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”میں نے سوچا پتا نہیں دیسی ناشتہ پسند کرے کہ نہ کرے۔۔۔ اس لیے دلالتی بھی بنا دیا۔ اب جو دل کرے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو جہاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”پھوپھو۔! ادھر دیکھو وہاں میں پھوپھو سکھ جیت زیادہ تر یہی دیسی ناشتہ کرواتا تھی اور جس دن چھٹی ہوتی تھی تو وہی کھانے ہی کہتے تھے۔“  
 ”ہاں دل کی بڑی اچھی تھی سکھ جیت میرے تو ساری زندگی وہ کام آتی ہے۔ اب یہی دیکھ لو جو ہم اتنے سکون سے رہ رہے ہیں۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہے۔ اس نے۔۔۔“  
 ”پھوپھو! یہ انوجیت کہاں ہے ابھی تک اٹھا نہیں۔“ جہاں نے واضح طور پر طہجیت کو رہی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی۔ سمجھ گئی کہ وہ اس کی یہ بات سننا نہیں چاہتا پھر بولی۔  
 ”اٹھ تو وہ کافی دیر پہلے سے گیا ہے وہ کسرت کرتا ہے ابھی تیار ہو کر آتا ہی ہوگا جا بٹال لاؤ ریکو۔“  
 ”جی بے بے۔۔۔“ ہر پریت نے کہا اور انوجیت کو بلانے چل دی۔  
 ناشتہ بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔ انوجیت کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے چائے ختم کی اور دونوں اٹھ کر باہر لان میں آ گئے۔ ڈھوپ خاصی چڑھ آئی تھی۔ مگر اچھی لگ نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ کرسیاں اٹھا کر پورچ کے ساتھ دالان میں آ بیٹھے۔ اتنے میں ہر پریت بھی ان کے پیچھے ہی

آ گئی۔ وہ بھی کرسی اٹھا کر انہی کے پاس آ بیٹھی۔ تبھی انوجیت نے پوچھا۔  
 ”اچھا یہ بتا جہاں! جتنے تمہارے پاس دن ہیں ان کا بہترین استعمال کرنے کے لیے تو کیا کرنا چاہتا ہے کچھ تو پلان ہوگا تیرے ذہن میں یا پھر۔۔۔“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تب وہ خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ کچھ دیر پہلے وہ چھت پر انوجیت کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے بارے میں مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تو بہت کچھ سوچ رکھا تھا اب وہ سب تو انوجیت کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ ہر پریت بولی۔  
 ”جہاں۔! آپ سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو ہمیں بتاؤ ہم پلان کر لیتے ہیں آپ بولو تو سہی۔“  
 ”جی اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا تو وہ بولا۔  
 ”میرا دل چاہتا ہے کہ میں سب سے پہلے اپنی حویلی کو ٹھیک کروں اسے پہلے کی مانند بالکل نئی بنا دوں۔ لیکن۔۔۔؟“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔  
 ”لیکن یہ میرے دیر، کیا اس حویلی پر میں قانونی طور پر کوئی حق رکھتا ہوں اور اگر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا تو پھر میں کس طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ حویلی اس وقت میری ملکیت ہے۔ میرے پرکھوں کی جائیداد ہے اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ اب تک اس حالت میں کیوں ہے اسے آپ لوگوں۔ ٹھیک کیوں نہیں کروایا یہاں نئی کوٹھی بنانے کی بجائے وہاں کیوں نہیں رہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں کر سوال کر گیا۔ انوجیت بڑے سکون سے سنتا گیا۔ اسی سکون سے بولا۔

”کون کہتا ہے کہ تم قانونی طور پر اس حویلی کے وارث نہیں ہو۔۔۔؟“  
 ”کل جب تھا نے میں بات ہوئی۔۔۔“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ انوجیت اس کی بات کانتے ہوئے بولا۔  
 ”وہ غلط کہتا تھا“ کیونکہ وہ بندہ ہی ٹھیک نہیں تھا اور پھر تمہاری اطلاع کے لیے تبادوں کہ رات کسی نے اسے گولی مار دی ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“  
 ”مطلب مار دیا۔۔۔ قتل ہو گیا وہ۔۔۔“ تجھے کیسے پتا۔۔۔ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔  
 ”ہاں بھائی مار دیا۔۔۔ وہ تھا ہی اس قابل۔۔۔“ انوجیت نے سکون سے کہا۔  
 ”کیوں۔۔۔“ وہ پھر حیرت سے بولا۔  
 ”میں تمہاری اس کیوں کا جواب دوں گا لیکن فی الحال ہم وہ باتیں کر لیں جو تم نے کہی ہیں۔“ وہ بولا۔  
 ”اچھا کہو۔“ جہاں نے کہا۔  
 ”جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہارا اندراج یہاں ہو گیا تھا۔ وہی پرانا انگریزوں والا نظام جو کیدار کے رجسٹر میں تمہارا نام ہے جو تحصیل میں بھی درج ہے۔ تمہاری پھوپھو سکھ جیت کے شوہر یعنی تمہارے پھوپھو نے وہ کاغذ بنوائے تھے جو بعد میں بے بے کو دے دیئے تھے۔ جب تم سے رابطہ ہو گیا تم نے آنے کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر جب تم نے آنے کا بالکل فیصلہ کر لیا تو میں نے اس زمین کے کاغذات کی دوبارہ پڑتال کر دائی جس کے لیے پٹواری کو بہت کھانا پڑا شاید آج کل میں وہ تم سے ملنے کے لیے آئے بھی خیر۔ شجرہ بنا تمہارے دادا کی وراثت ب تمہارے نام بول رہی ہے۔ تحصیل دار کے سامنے صرف تمہیں پیش ہونا ہے میں نے تمام باغذات تیار کر لیے ہیں۔ تحصیل دار کو صرف یہ درخواست گزارنی ہے کہ تم زندہ ہو اپنے دادا کی

وراہت کے حق دار ہو۔ بس یہ ساری جائیداد تمہارے نام ہوگی اگر تم چاہو تو اس کی شروعات آج ہی سے کر دیتے ہیں۔

”تم بہتر سمجھتے ہو انوجیت کہ کیا کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے اب میری ذمہ داری ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے اور اب سنو وہ حویلی ایسے ہی کیوں پڑی رہی۔“

”ہاں.....! وہ بتاؤ مجھے.....“ جیہال نے دلچسپی سے کہا اور انوجیت کی طرف ہمد تن گوش ہو گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر کہنا چلا گیا۔

”جب تک سرخ زندہ رہا، اس نے اس حویلی کو ایسے ہی رہنے دیا۔ بے بے نے ایک بار کوشش کی تھی کہ اس کی صفائی ستھرائی کروا کر رنگ روغن کروادیا جائے لیکن اس نے روک دیا۔ حویلی کو رنگ روغن کروانے کی خواہش تمہاری پھوپھو نے کی تھی۔ انہوں نے دیکھو سے رقم بھی بھیجی تھی لیکن بے بے ان دنوں اس قدر قوت میں نہیں تھی کہ سرخ کا سامنا کر سکے۔ بلکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر بے بے نے پھر ایسا کرنے کی کوشش کی تو اس سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سرخ تو نہیں رہا لیکن اس کے پتر رویندر سنگھ نے یہی بات بے بے کو بھردہرائی تھی۔“

”نہیں انوجیت مجھے یہ بتاؤ وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ اس نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”ان کا کہنا تھا بلکہ کہنا ہے کہ اس حویلی کو عبرت کے نشان کے طور پر اس گاؤں میں ایسا ہی رکھنا ہے تاکہ لوگوں کو یہ یاد رہے کہ سرخوں سے مقابلہ کرنے والے کا انجام کیا ہوتا ہے اور لوگ اس سے سبق لے سکیں۔“

”ہوں تو یہ بات ہے.....“ جیہال نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا پھر چند لمحوں بعد پوچھا۔ ”اچھا“

انوجیت مجھے یہ بتاؤ کہ سرخوں کا خاندان کتنا ہے اور اس وقت وہ کتنے طاقتور ہیں کہ لوگ ان سے سبق لے سکیں۔“

”رویندر سنگھ اس وقت ایم ایل اے ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت یاد دہلی میں گزارتا ہے پھر امرتسر یہاں وہ ابھی کھار آتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے دھڑی رہتے ہیں۔ مطلب بیوی تو دھڑی ہی ہے لیکن اس کے تین بیٹے ہیں ایک چندی گڑھ میں اپنا بزنس کر رہا ہے دوسرا اس کے ساتھ امرتسر ہی میں ہے اور تیسرا یہاں زمینداری کرتا ہے یہاں کی سیاست دیکھتا ہے اور سرخ کی کرتا ہے وہ اکالی دل کا بڑا سرگرم رکن ہے۔“

”مطلب سیاسی طور پر مضبوط ہیں..... اور معاشی طور پر بھی.....“ جیہال نے یونہی پوچھا۔

”یہ تو ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اچھے خاصے جرائم پیشہ بھی ہیں۔ شاید انہیں بھارتی سیاست کے بارے میں اتنا معلوم نہیں ہے۔ یہاں جو جتنا بڑا غنڈہ ہوگا اتنا زیادہ ہی وہ مضبوط ہوگا۔ اس کا اتنا زیادہ ہی سیاست میں عمل دخل ہوگا۔“

”ہوں.....“ جیہال نے ہنکارا بھرا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جسے انوجیت وہی کچھ کہہ رہا ہے جو اس کی اپنی سوچ تھی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ ”اگر ہم بلکہ میں اپنی حویلی کو دوبارہ سے رہائش کے لیے درست کرنا چاہوں تو میری مخالفت کریں گے.....؟“

”بالکل کریں گے..... رویندر سنگھ کا تیسرا پتر..... بلجیت ثروا سے شاید معلوم بھی ہو چکا ہوگا کہ تم یہاں پر آ گئے۔ اور ممکن حد تک تیری مخالفت شروع بھی ہوگئی ہوگی۔ یہ تو تجھے اس وقت معلوم ہوگا جب تم یہ ساری زمین رویندر کے نام کرواؤ گے۔“

انوجیت نے کانٹا نہ غصے میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔ اب ساری زندگی انہی کی ٹونٹیں چلنی۔“ جیہال نے زہر خند لہجے میں کہا تو ہر پریت کو نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”جیہال، یہ ٹھیک ہے کہ لڑنے سے پہلے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لیا جائے لیکن لڑائی صرف طاقت سے نہیں جیتی جاسکتی اس کے لیے حوصلہ بھی چاہیے ہوتا ہے اگر ان سے مخالفت لینی ہے تو یہ جان لو کہ تم میں اتنا حوصلہ ہے۔“ اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ آپ سے تم پر اترا آئی تھی۔ جسے جیہال نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔ اس لیے اس نے ہر پریت کے چہرے پر دیکھا جہاں اس کے چہرے پر تھی۔ وہاں غصہ بھی چمک رہا تھا۔ شاید اس میں کسی قدر نفرت کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ سچ طرح سے اندازہ نہ لگا سکا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر وہی ہی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہر پریت میں کوئی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر بھارت کی زمین نے میرا خون پینا ہے تو پی لے..... مگر میں جو سوچ لے کر آیا ہوں اس سے ایک انچ نیچے نہیں ہوں گا۔ تم دونوں یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں کیا مقصد لے کر آیا ہوں۔“

”تو میرے خیال میں تم دونوں بے نیچے نہیں ہو۔“

”سمجھ گئی تم کیا چاہتے ہو لیکن..... کیا تم اکیلے یہ مہم سر کر سکتے ہو۔ طاقت کا توازن.....“

”میں نہیں جانتا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ میں تو خود پر بھروسہ کر کے آیا ہوں۔ اپنی جائیداد اپنی زمین کا حصول میرے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

دیکھو وہ اس سے بھی زیادہ میرے پاس جائیداد ہے۔ میں یہاں صرف انوجیت کو جانتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ کسی مشکل میں نہ پڑے۔ اس نے لیے مجھے الگ رہنا ہے اور اپنے طور پر.....“

”تم غلط سمجھ رہے ہو جیہال“ ہر پریت نے تیزی سے کہا۔ ”تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے تم تو ان لوگوں کو بھی نہیں جانتے ہو بلجیت سنگھ کون ہے یا رویندر سنگھ کون.....؟“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ دھیرے سے بولا۔

”تمہیں مدد چاہیے ہوگی تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے ہو۔“ ہر پریت بولی۔

”ٹھیک.....! میں نے مان لیا لیکن میں کم از کم تم لوگوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ تم لوگ بڑے سکون کی زندگی گزار رہے ہو۔ تم گزارو..... میں یہ سب دیکھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے جیہال، تم ہماری زندگی کا خیال کرو لیکن ہم تمہارے لیے ہر طرح سے حاضر ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ..... وہ پولیس آفیسر..... جس نے کل تھانے میں تم سے بدتمیزی کی تھی..... اسے رات کسی نے گولی ماری ہے اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔..... کیوں، ایسا کیوں ہوا؟“ ہر پریت نے کہا۔

”کیوں، کس نے کیا یہ سب.....؟“ جیہال نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”صرف تمہیں بتانے کے لیے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور شاید تیرے انتظار میں..... تم خود کو اکیلا مت سمجھنا.....“ ہر پریت نے کہا تو جیہال نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس نے اپنی بات بھی کہہ دی تھی اور یہ بھی نہیں بتایا کہ پولیس آفیسر کیسے قتل ہو گیا۔ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”ہر پریت.....! اب میں یہ قطعاً نہیں پوچھوں گا کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا لیکن اتنا ضرور پوچھوں گا کہ صرف میرے انتظار میں..... اس سے پہلے کیوں نہیں.....؟“

”نہیں.....؟“

”اس سے پہلے بھی بہت کچھ ہے اور بعد میں بھی ہوتا رہے گا یہ تو فقط ہوا تمہارے ساتھ کرا کر گزری ہے کہ تجھے احساس ہو جائے باقی وقت خود بتادے گا کہ سندہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ پرسکون لہجے میں بولی تو جہاں نے انوجیت کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے انوجیت..... چلو آج ہی تحصیل دار کے عرضی گزار دیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ مخالفت کے لیے کون سامنے آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو ہر پریت کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ انوجیت کے ساتھ وہ بھی اٹھ گئی۔ اوکی پنڈ کی فضاؤں میں ایک نیا فیصلہ ہو چکا تھا۔



میں اور چھاکا دو پہر کے بعد تک ڈیرے ہی پر رہے۔ ہم نے اپنے طور پر پورے گاؤں کے لوگ کھٹکال مارے کہ ان میں خبر کون ہو سکتے ہیں؟ ساری زندگی اسی گاؤں میں گزر گئی تھی لیکن کبھی کسی کے بارے میں شک تک نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کا منبر بھی ہو سکتا ہے۔ اب شاید بات ہم تک پہنچی تھی یا ہم خود اس معاملے سے گزر رہے تھے تو ہمیں اس کا انکشاف ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا یا انکشاف بہر حال خطرناک تھا۔ شاید پولیس تم تک نہ پہنچ پائی اگر اس خبر نے ہمارے بارے میں اطلاع دی ہوئی۔ ہمارا ہونا بھی پھر کیا ہونا اگر ہم شام سے پہلے اس ناویدہ منبر کو تلاش نہیں کر لیتے۔

”چل یار اٹھ گاؤں چلتے ہیں۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو اس منبر کو تلاش نہیں کیا جاسکتا۔“ چھاکے نے ایک دم سے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ بھی جھیدے نے کہا۔

”جاؤ جاؤ..... میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ تم جاؤ۔“

شاید اس نے ادھر ادھر پھرتے ہوئے ہماری

باتیں سن لی تھیں اس لیے ہمیں ڈھیل دی تھی کہ ہم جا کر یہ کام کریں۔

”لے پھر جھیرے جارہے ہیں ہم۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو چھاکا بھی اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے سے نکل کر گاؤں جانے والے راستے میں تھے۔ ہم دونوں اپنے اپنے تئیں خاموش سوچ رہے تھے کہ اچانک چھاکے نے میرے پیچھے بیٹھے ہوئے چونک جانے والے انداز میں کہا۔

”اُوئے..... اچھے یہ بتا شاہ زیب اور پیر زادے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ تو تھانے میں ہے اور وہ فوراً وہاں پہنچ گئے؟“

”بات تو تیری ٹھیک ہے یار چلو شاہ زیب کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ گاؤں کے کسی بندے نے اطلاع دی ہوگی لیکن پیر زادہ تو.....“

”بندہ انہی دونوں کے درمیان ہے جمال..... وہ بندہ محض پولیس کا منبر نہیں ہے۔ ان سب کی ملی بھگت لگتی ہے۔ تو مان جا.....“

”مان گیا پر اس بندے تک تو پہنچ.....“ میں نے تیزی سے کہا۔

”سمجھو پہنچ گیا۔ اچھو کر پانے والا..... سارے گاؤں کی خبر اس کے پاس ہوئی ہے۔ اتنی تیزی سے رابطہ صرف اور صرف فون پر ہو سکتا ہے ورنہ نورنگر سے پیر زادے کے گاؤں تک کوئی بندہ جائے اسے بتائے تو پھر تھانے تک جائے جبکہ شاہ زیب کو اس سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ دونوں کا ایک ہی وقت پہنچ جانے کا مطلب ہے کہ دونوں کو اطلاع ایک ہی وقت میں ملی اور آگے پہنچ تقریباً ایک ساتھ وہاں پہنچ گئے۔“ چھاکے نے پیچھے بیٹھے ہوئے تفصیل سے کہا تو میں چونک گیا۔

”بات تیری ہی ہے۔ ہے چھاکے چل اس سے

پچھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بایک کی رفتار مزید بڑھا دی۔

سہ پہر ہو چکی تھی جب ہم اچھو کر پانے والے کی دکان پر پہنچے۔ وہ دکان کے اندر کھڑا گاؤں کو نشانہار ہاتھ۔ جبکہ دکان کے باہر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بایک ایک طرف لگائی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے سلام دعا کرنے لگے۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ دکان پر موجود گاؤں کو سودا وغیرہ دے لے تو پھر اسے دکان سے باہر بلانا اس تھا۔ چند منٹ بعد ایسا ہی ہوا۔ گاؤں کو چلے گئے لیکن وہ دکان کے اندر ہی رہا۔ ابھی میں نے اسے بلایا تو وہ باہر آ گیا۔ جب تک وہ میرے پاس آیا تب تک میں نے اپنا مسئلہ نیچے میں سے نکال لیا تھا۔ میرے اس عمل سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تب ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔

”دیکھ اچھو..... تو مجھے یچین سے جانتا ہے۔ میں تجھے ماروں گا نہیں لیکن زندگی بھر کے لیے اپنا بچ نرو کر دوں گا۔ سچ بتادے تو میرے بارے میں کب سے اور کسے اطلاع دیتا رہا ہے۔“ میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کھکھکھائے ہوئے انداز میں بولا۔

”مجھے معاف کر دے جمال.....! یقین جانو مجھے بتائی نہیں چلا کہ یہ سب کیا ہوا ہے میں تمہیں ساری بات بتا دیتا ہوں..... آگے فیصلہ تم کر لیں..... میں صرف حرف سچ کہوں گا۔“

”تو بولو..... روکا کس نے ہے۔“ چھاکے نے اجنبائی غصے میں کہا۔

”جس وقت تم فون کر کے گئے تھے اس سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ایک بندے نے آ کر مجھ سے

گریٹ لیے اور یوپی باتوں ہی باتوں میں میلے کی بات کرنے لگا۔ پھر اس نے سوڈے کی بوتل کھولی اور

وہی میلے کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اصل میں مجھ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ فائرنگ کرنے والا بندہ کون ہے اور اس کے ساتھ لڑکی تو نہیں آئی۔“

”تم بے وقوف تھے کہ وہ تم سے پوچھ رہا تھا اور تم بتا رہے تھے۔“ چھاکے نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے اب پتا چل رہا ہے نا..... ورنہ اس وقت تو وہ فائرنگ کرنے والے کی بڑی تعریف کر رہا تھا اب میں نے اکیلے تھوڑی جہاں کو دیکھا تھا اس لڑکی کے ساتھ رات بہت سارے لوگ اس چوک میں تھے۔ ان سب نے دیکھا تھا۔ یہاں ایسے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ بھی بتانے لگے جب اس بندے کو پکی تصدیق ہو گئی کہ لڑکی جمال کے پاس ہے اور اس کا گھر قریب ہی ہے تو وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور آ کر فون کیا کوئی اتنی لمبی چوڑی بات نہیں کی جس پر میں نے دھیان بھی نہیں دیا۔ کافی دیر بعد تم آئے.....“

”تو مجھے بتاتے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”میں ڈر گیا تھا کیونکہ اس وقت تک وہ جیپ پر سوار تھا اور پہلے اس گلی میں چلے گئے تھے میں نے سوچا خاموشی ہی بہتر ہے..... سو..... بات اس کے منہ ہی میں رہ گئی اور چھاکے نے ایک زوردار پھیر اس کے مار دیا۔ وہ زمین پر جا گرا۔ بھی وہ لرز گیا کیونکہ چھاکے نے بڑے غصے سے اسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”پھر پیر زادے اور شاہ زیب کو فون کیوں کیا؟ جب اسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔“

”میرے تو خیال میں بھی نہیں تھا کہ پولیس آئے گی اور جمال کو پکڑ کر لے جانے کی میرے پاس



جمال کو پہچانے کا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ شاہ زیب کو تو بتانا ہی تھا لیکن میں نے پیر زادے کو اس لیے بتا دیا کہ یہ جمال اس سے بھی باتیں کر کے گیا تھا۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ وہ بھی اس کا دوست ہے اور پھر ہوا بھی یہی..... ”اچھو نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتا دی۔

”کون.....؟“ دوسری طرف سے بیماری آواز بھری۔

”میں جمال بات کر رہا ہوں۔ نورنگر کا جمال..... تم کون ہو؟“

اب انتظار کریں تجھے خود ڈھونڈ کر تیری اس سب سے عزتی بھی جو ادیس اور خود یہاں بیٹھی ہے۔ ”انہوں نے بے کامرہ دیتا ہوں۔“ پروائی سے کہا۔

لوکی ہے۔ ایک طوائف ہے جس کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ ملک سجاد کے کہنے پر ہی یہاں موجود ہو؟“ چھاکے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”سوال یہ ہے کہ وہ اس کے کہنے پر اب یہاں کیوں ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”یاد تم نے اس کے بندوں کو زخمی کیا ہے اور پھر تھانے میں صرف افضل رند ہادا کی ہی بے عزتی نہیں ہوئی بلکہ ملک سجاد کی بھی تو ہوئی ہے تاکہ اس کا حکم پورا نہیں ہو سکا۔“ چھاکے نے اپنے طور پر دلیل دی۔

”میں نہیں سمجھتا چھاکے کہ اب وہ اتنی ہی بات پر کوئی انتقامی معاملہ کرے گا۔ ہاں جو کچھ ہم اب اس کے ساتھ کر کے آئے ہیں تو اس پر اس کا ہم سے دودو ہاتھ کرنا بنتا ہے۔ کل صبح یا رات کسی وقت یہ سوہنی یہاں پہنچتی ہے، تو اس پر شک کیا جاسکتا تھا۔“ میں نے اپنا خیال پیش کیا تو چھاکے چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”یار.....! کچھ لوگوں کی فطرت میں کمینہ پن ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں جو کسینے ہیں انہیں کیا ہم نے نہیں دیکھا۔ سال ہا سال تک دل میں کدورت رکھتے ہیں اور وقت ملتے ہی ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتے۔ ملک سجاد جس عورت کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے وہ ایک طوائف ہے جس کا قدر گھٹیا معیار رکھتا ہو اس سے کچھ بھی بعید نہیں اور دوسری بات..... کیا تم شاہ زیب اور بیروزادے کو بالکل پاک و صاف کر دو گے؟“ میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کے مراسم نہ ہوں۔“

”ہو سکتا ہے ہوں، لیکن میں اتنا بتاؤں.....“ اس سے پہلے میں کچھ کہتا باہر والے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور سوہنی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جیسے وہ اپنے غصے کو دبائے کی بھرپور کوشش کر رہی ہو۔ وہ خاموشی سے میرے

سامنے والی کرسی پر آن بیٹھی۔ ہم بھی خاموش تھے اور یہ خاموشی کچھ لمحے ہمارے درمیان ٹھہری رہی میں سوہنی کی طرف دیکھتا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ بات کرے جبکہ وہ یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر ایک دم اس نے سر اٹھایا اور بولی۔

”جمال.....! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں معافی مانگتی ہوں کہ میں نے تمہاری باتیں اس دروازے کی اوٹ سے سنیں۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے خود پر افسوس آ رہا ہے کہ میں تم پر ایک فیصد کا بھی اعتبار نہیں بنا سکی۔ میں جانتی ہوں کہ میں طوائف ہوں، معاشرے کی نگاہ میں گھٹیا ترین مخلوق ہوں، لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ آج تک میرا جسم کسی مرد کے زیر تسلط نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ملک سجاد جیسے شخص کے بھی نہیں۔ میں.....“

”تم اس سے ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”یہ کہ میں نہ تو اس کی رکھیل ہوں نہ ہی اس کی پابند۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور میں یہاں آ کر جو ٹھہری ہوں تو اپنی مرضی سے..... تمہارے ساتھ..... اماں کے ساتھ کچھ دن رہنے کے لیے لیکن تم دونوں کی باتیں سن کر مجھے لگا کہ جہاں اعتبار ہی نہیں وہاں خلوص کبھی نہیں آ سکتا۔“ اس نے آرزو سے لہجے میں کہا۔

”سوہنی.....! یہ خلوص بیار اور محبت کی باتیں ہیں نا میری سمجھ میں نہیں آتیں اور نہ ہی میں انہیں سمجھنا چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ ملک سجاد سے کہا ہے اگر اس میں رتی بھر غیرت بھی ہوئی تو اس کا بدلہ لینے ضرور آئے گا اور میں بھی اس کا منتظر ہوں۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ یہ سارا فساد تمہاری وجہ سے پیدا ہوا ہے تو شک بھی تم پر نہ کیا

جائے کیسی باتیں کرتی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

”اس میں غیرت نہیں ہے اس لیے تو میں یہاں آؤں۔ تم کچھ نہ بھی کرتے تو بھی اس نے یہاں چڑھ دوڑنا تھا تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اسی لیے تو میں یہاں ہوں۔“ اس نے لمبے لمبے میں کہا۔

”میری زندگی کو خطرہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم.....؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، مجھ پر یقین کرو.....“ وہ روہاسی ہوتے ہوئے بولی تو میں نے چھاکے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

.....☆☆☆.....

چھاکے کا چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتا رہا پھر مغزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہم کیوں اعتماد کر لیں تم پر کیوں یقین کریں تیرا؟“

”اس لیے کہ جو میں جانتی ہوں وہ تم لوگ نہیں جانتے۔“ وہ تیزی سے بولی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ تم کیا جانتی ہو، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم خواہ مخواہ ہم پر مسلط ہو رہی ہو اور نبھانے کیوں ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ماں نے کہا ہے کہ تو صبح چلی جائے گی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ورنہ تجھے ابھی جانا پڑتا۔ ابھی تو میرے بارے میں جانتی ہی کیا ہے؟“

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم بہادر ہو، ڈر ہو، اور غیرت مند ہو لیکن گاؤں کے سیدھے سادے بچے تو جوان ہو جو دنیا کے چلتروں کے بارے میں نہیں جانتا۔ یہاں بڑے سے بڑا بے غیرت پڑا ہے

دھوکا، فریب، پیٹھ پر چھرا گھونپنے والے.....“

”دیکھ جہاں تک دھوکے کی بات ہے ایک کتا بھی دھوکے سے کاٹ سکتا ہے مگر میں کتے سے بھی بدتر لوگوں کو جانتا ہوں کہ جو برس ہا برس ایک چوکھٹ سے کھاتے رہتے ہیں پھر وہیں منافقت کرتے ہیں۔ اس میں ان کا نہیں ان کی ولدیت کا قصور ہوتا ہے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ منافقت کا کھیل کھیلنے والے کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، قانون فطرت ہے۔ منافق اعتماد کا خون کرتا ہے ان باتوں کو چھوڑ۔“ میں یہ جانتا ہوں۔ تم بولو تم یہاں پر کیوں ہو؟“

”میں جو بھی کہوں گی تم اسے جھوٹ ہی سمجھو گے، میں جا رہی ہوں، لیکن خدا کے لیے محتاط رہنا اعتماد نہ کرنا کسی پر۔“ سوہنی نے کہا اور اٹھ گئی۔

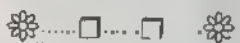
تو میں نے کہا۔

”کہو تو تمہیں شہر چھوڑ دوں.....؟“

”نہیں، کچھ ہی دیر میں گاڑی آ کر مجھے لے جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگی پھر پلٹ کر بولی۔

”جمال، تم نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے میں اس احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ کبھی میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، تیری آواز پر سوہنی دوڑی چلی آئے گی۔“ اس نے کہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرے اور چھاکے کے درمیان کتنی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ اٹھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں چند لمحے اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر سر جھٹک دیا۔



جسپال اور انہوں نے سارا دن کورڈ تحصیل کورٹ میں پھرتے رہے۔ وہ بہت سارے لوگوں سے ملے۔ یہ ملاقاتیں قدرتی تھیں جو دوپہر کے بعد تک جاری تھیں۔ دوپہر کے بعد وہ





سنگھ کا بیٹا..... تمہارا پہلا امتحان یہی ہے کہ تم اپنا ہوتا ثابت کر دو یہ ثابت کرو کہ تم کلوندر سنگھ کے پتر ہو جس دن تم انصاف اور قانون کے تحت یہ ثابت کر لو تو میرے پاس آ جانا۔ میں نہ صرف تمہارا مقدمہ لڑوں گا بلکہ تمام اخراجات خود برداشت کروں گا۔“

”آپ قانون اور انصاف سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟ اور پھر میری راہ میری شناخت اتنی مشکل کیوں ہے؟“ گل صاحب..... ”جہاں نے کافی حد تک غصے میں کہا۔ تو گل نے انوجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے یوں سمجھ نہیں آئے گی۔ چند دن بعد یہ خود کہے گا خیر آؤ کھانا کھاتے ہیں میرا خیال ہے لگ گیا ہوگا۔“ گل نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بھی اٹھ گئے۔

لنچ پر وہ تینوں ہی تھے۔ گل کا پرہیز شاید پہلے لنچ کر چکا تھا، گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ بھی ہلکی پھلکی باتوں اور ادھر ادھر کے واقعات بتاتے ہوئے لنچ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ میر ہو گئے وہ دوبارہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سبھی انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔

”دیکھو پتر! میری باتوں کا برا مت ماننا اور نہ ہی میں تمہیں مایوس کر رہا ہوں۔ میں تمہارا سارا معاملہ ہی نہیں مسئلہ بھی سمجھتا ہوں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ رب تجھے تیری مراد دے۔ میں ایک دودن میں اوگی آؤں گا پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔“ گل نے کہا اور انہیں ہاتھ جوڑ کر نسکار کرتے ہوئے لنچ بکائی۔ وہ اس سے اجازت لے کر جب اوگی کی جانب پلٹے تو شام ہونے کو تھی۔

اوگی پینچنے تک شام دھل چکی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ راستے میں جہاں نے انوجیت سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے گل کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن نہ جانے

کیوں اسے وہ بندھ ٹھیک لگا تھا۔ پوریج میں گاڑی رکھ کر اس نے دیکھا ہر پریت کو ران میں بیٹھی ہے اس نے سفید شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور باریک آنکھیں کرسی کی پشت پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ کوئی میگزین دیکھ رہی تھی جس سے توجہ بدل کر ان کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے تو ہر پریت بھی ان کے قریب آ گئی۔

”آپ دونوں فریش ہو کر آ جا میں میں آپ کے.....“

”نہ ہر پریت اس جہاں سے کہہ دے جو کہنا ہے میں تو جا رہا ہوں شاید رات دیر سے آؤں.....“ انوجیت نے کہا اور اندر کی طرف چلا گیا۔

”پھوپھو کہاں ہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ اندر ہی ہیں آپ فریش ہو جائیں پھر باتیں کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چل دی تو وہ دونوں بھی اس کے پیچھے لپکے۔

جہاں چھت پر کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈا سے اچھی لگ رہی تھی۔ سامنے اوگی کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو وہاں کسی آبادی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس گاؤں میں اس کی حویلی ہے جو اس کے خاندان کا مقتل بنی تھی۔ اسے یہاں آ کر بوجا عجیب سا لگتا تھا۔ اسے کتنی ہی دیر ہو گئی تھی یہاں کھڑے ہوئے وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا کئی سوال اس کے ذہن میں تھے لیکن کسی ایک پر بھی وہ اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پاتا تھا۔ ایڈووکیٹ گل کے ساتھ ہوئی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں لیکن ایک سوال اس کے ذہن میں اچانک ابھرا تھا۔ نہ جانے اسے کیوں لگتا تھا۔ ایڈووکیٹ گل اور اس سوال کا کہیں گہرا تعلق ہے۔ سبھی اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ نہ لڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو توقع کے مطابق وہاں۔۔۔ پریت کھڑی اس کی

طرف سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ چند لمحے پوہی دیکھتی رہی پھر بولی۔

”لگتا ہے آپ کو یہ جگہ بہت پسند ہے۔ آپ یہاں آ کر کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟“

”ہر پریت..... میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ شاید میں اس گاؤں کی فضاؤں سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں یا شاید اپنے اندر کے شور کو سننے کے لیے اس پر سکون جگہ پر آ جاتا ہوں۔“

”بھئی جی میں جوہوں باتیں کرنے کے لیے مجھ سے باتیں کیا کریں نا۔“ وہ ہنسنے سے بولی۔

”ہاں تم بھی ٹھیک کہتی ہو خیر!۔۔۔ میری ایڈووکیٹ گل کے ساتھ بات ہوئی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور.....“ یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اختصار سے باتیں بتانے لگا۔ ساری بات سن کر ہر پریت ذرا سا مسکرائی اور بولی۔

”وہ ٹھیک کہتا ہے لیکن اس کی سمجھا بھی نہیں نہیں آئے گی۔“

”کیوں.....؟“ وہ تیزی سے بولا تو وہ عام سے لہجے میں بولی۔

”تم ابھی اس ماحول کو نہیں جانتے جب ماحول کو سمجھو گے تو ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ آج صبح تم نے اس پولیس آفیسر کے بارے میں بتایا تھا وہ کیا کہانی ہے؟“

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہی بات کرو گے.....“ وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”وہ بہت بے غیرت قسم کا پولیس آفیسر تھا اور اسے خاص طور پر یہاں لایا گیا تھا بہت دنوں سے لوگ اس کی تاک میں تھے بات وہ قابو لگ گیا۔“

”لیکن تم تو کہہ رہی تھی کہ یہ میرے لیے پیغام تھا؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”میں گیانا پیغام بن گیا اور یہ جو تم نے سوچا ہے کہ ایڈووکیٹ گل کی بات اور اس قتل میں کہیں تعلق ہے تو وہ ہے..... میں نہیں مزید نہیں لکھنا چاہتی جی میں صاف لفظوں میں تمہیں بہت کچھ بتا دینا چاہتی ہوں آؤ..... نیچے چل کر تمہارے کمرے میں سکون سے بیٹھتے ہیں۔ وہیں باتیں کرتے ہیں۔“

”چلو.....“ اس نے کہا تو دونوں آگے پیچھے نیچے کی طرف سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر جہاں بیڈ پر بیٹھا تو ہر پریت نے ایک کرسی کھینچی اور بیڈ کے قریب بیٹھ گئی۔ پھر بڑے سکون سے بولی۔

”میں جالندھر میں پڑھتی تھی خالصہ کالج جالندھر وہیں ہاسٹل میں رہتی تھی۔ میں اکیلی ہی وہاں پرائیسی نہیں تھی کسی کا باپ اس کے پیدا ہونے سے پہلے قتل ہو گیا۔ کسی کا باپ کسی کا چھائی ہر ایک ایسی تھیں جس کے گھر سے کوئی نہ کوئی قتل نہ ہوا ہو۔ سکھوں کے لیے سن چورای قیامت کا سال تھا۔ میرے اندر انتقام تو تھا ہی وہاں جا کر شعور ملا کہ ہمیں کرنا کیا ہے وہیں ہماری ایک لیڈر تھی جس کے باپ کو اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ جلادیا گیا تھا اس کی کہانی بڑی دردناک تھی سو ہم شعوری اور لاشعوری طور پر سکھ حریت پسند تحریک کے ساتھ جڑ گئے۔ ہم نے بہت کام کیا خالصہ پنٹھ کے لیے جس میں قوت ہمارے اندر پلنے والے انتقام سے تھی۔ یہ تحریک بہت مضبوط ہے سمجھ لو کہ گھاس نے اندر ہی اندر ایک دریا بہہ رہا ہے جو کسی بھی دن شہر سرلہروں کے ساتھ نمودار ہو جائے گا۔“ وہ کسی نہ کسی بنی حریث پسند کی طرح کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”حکومت کو پتہ ہے.....“ جہاں نے پوچھا۔

”پتہ ہے ہماری..... جنگ جاری ہے اور یہ

پولیس آفیسر ہم نے ہی مارا ہے۔“ ہر پریت نے نفرت آمیز لہجے میں کہا تو ہسپال نے گہرا سانس لے کر ہنکارا بھرا۔  
”ہوں.....“

”سوال یہ جیسی جب تک تم اپنے بارے میں اپنے مقصد کے بارے میں نہیں بتاؤ گے ہم تمہاری مدد کیسے کر پائیں گے اگر تم صرف اپنی جانیداد.....“  
”نہیں مجھے جانیداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس سے کہیں زیادہ میرے پاس وینیکور میں ہے یہ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ میں سکون اور عیاشی کی زندگی وہاں گزار سکتا ہوں۔ میں یہاں پر کیوں آیا ہوں؟ صرف ان لوگوں کو جو کسی نہ کسی حوالے سے میرے خاندان کے قتل میں ماوث ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے فوے دار ہیں میں نے انہیں نہیں چھوڑنا۔ بس یہی میرا مقصد ہے۔“ اس نے ہر پریت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر وہ تو رویندر سنگھ خاندان ہے جس کے بارے میں نے تمہیں بتایا تھا۔ وہ تیزی سے بولی۔  
”ہاں قتیٰ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ مجھے یہاں کے ماحول کے بارے میں نہیں معلوم اور نہ ان لوگوں کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوں۔ مجھے یہاں کے لوگوں کی مدد درکار ہوگی۔ لیکن میں محتاط اس لیے ہوں ہر پریت کے میں اپنا کام ختم ہونے سے پہلے نہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ کام اچھورا چھوڑنا چاہتا ہوں کہ کسی کے ہاتھ چڑھ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جائوں۔“  
”تم چاہو تو میں تمہیں اپنی تحریک کے لیڈروں سے ملوا سکتی ہوں وہ تمہاری مدد.....“ اس نے کہا چاہا تو ہسپال نے ٹوکے ہوئے کہا۔

(باقی آئندہ)

## آتش انتقام

محترم عمران احمد  
السلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گی۔ اس ماہ کورٹ کہانی کے بجائے کرائم ریویئر کی ڈائری پیش خدمت ہے۔ اس واقعہ کے چیدہ چیدہ نکات میں نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھے تھے بعد ازاں میں ڈائری کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ گزشتہ دنوں یہ ڈائری اچانک میرے ہاتھ لگی تو یہ نکات کہانی کی صورت میں میرے ذہن میں آگئے سو کہانی حاضر خدمت ہے۔

یہ کہانی ایک ایسے درندہ صفت انسان کی ہے جو نصیحت کرنے والوں کو بھی اپنا دشمن قرار دے بیٹھا تھا۔ امید ہے قارئین کو یہ کہانی ضرور متاثر کرے گی۔

والسلام

خلیل جبار

پنجرہ پول، حیدر آباد

سولہ سال لڑکے کی خودکشی کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا حالانکہ ہم پولیس والے بڑے سخت دل ہوتے ہیں ہمارا دل سخت ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ہم آئے دن قتل غارت گری کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہم قتل جیسے واقعات کو بھی معمول کی کارروائی سمجھ کر اہمیت دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ سولہ سال لڑکے سرور کی خودکشی کا یہ واقعہ ہمارے تھانے کی حدود میں ہوا تھا اس لیے تفتیشی افسر کی حیثیت سے قانونی کارروائی کے لیے مجھے ہی وہاں جانا پڑا اس کی شکل و صورت معمولی نہیں تھی وہ بہت ہی خوب صورت لڑکا تھا۔ اس لیے اس کی الم ناک موت پر میرا دل لرز گیا تھا کہ اس معصوم نے اپنی زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو اسے بہت کچھ دیکھنا تھا لیکن اس نے اتنی جلدی ہمت ہار کر موت کو گلے لگا لیا۔ ایسا کیا غم تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکا ویسے تو یہ عمر بولی ہی جذباتی ہے جو دل میں آجائے اسے کرنے کی ٹھان لیا جاتا ہے۔  
کاغذی کارروائی کر کے میں نے لاش پوسٹ

مارٹم کے لیے بھیج دی تھانے پہنچ کر سرور کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا کس قدر خوب صورت لڑکا تھا۔

ان دنوں موبائل کے استعمال نے لڑکے اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں کھاتے ہیں مگر والدین مجبور ہوتے ہیں وہ کیسے کسی اجنبی شخص پر اعتبار کر کے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں اسی طرح لڑکے کے والدین کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کسی ایسے خاندان میں کریں جن کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہوں تاکہ شادی کے بعد کوئی مسائل پیدا نہ ہوں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لڑکا اور لڑکی کورٹ میرج کر لیتے ہیں اس میں اکثریت مرد، شادی شدہ یا جرائم پیشہ نکلتے ہیں اور لڑکیوں کو بدکار پر مجبور کرتے ہیں بعض مرد شادی کا جھانسہ دے کر لڑکی کی عزت سے کھیلتے ہیں اور جی بھر جائے۔ چھوڑ دیتے ہیں یا کسی پیشہ ور عورت کے ہاتھ لے کر فروخت کر دیتے ہیں۔

اکثر لڑکیاں حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں یا خود کشی کر کے اس ظالم دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہیں، پسند کی شادیاں زیادہ ناکام اس لیے بھی ہوتی ہیں کہ مرد ایسی بیویوں پر بہت زیادہ شک کرتے ہیں اور یہ شک جب انہما کو پہنچتا ہے تو شوہر اپنی بیوی کو جان سے مارنے میں دیر نہیں لگاتا۔

سرور کی عمر کے لڑکے بہت ہی جذباتی ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ ماں باپ شادی کے لیے نہیں مان رہے وہ خود کشی کا سہارا لے لیتے ہیں یہ سوچ کر کہ اس جہاں میں نہیں تو دوسرے جہاں میں ہم ایک ہو جائیں گے یہ سوچے بنا کہ خود کشی کوئی اچھا عمل نہیں یہ تو سراسر گھائے کا سودا ہے، حرام موت مرنے والے دوسرے جہاں میں کس طرح ایک ہو سکیں گے، حرام موت مرنے والوں کے لیے جنت نہیں دوزخ ٹھکانہ ہوتی ہے۔

سرور کو بھی کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہوتی اور اس نے گھر والوں سے شادی کی بات کی ہوگی اور انکار کی صورت میں اس نے موت کو گلے لگالیا ہوگا۔ ابتدائی رپورٹ سے ہمیں سروس کے بارے میں یہی معلومات ملی تھیں کہ وہ ہالا کا رہنے والا تھا اور کام کے سلسلے میں حیدر آباد آیا تھا۔ قاسم نامی شخص کے پاس کام کرتے ہوئے سرور کو چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ خود کشی کا واقعہ پیش آ گیا۔

قاسم نامی شخص گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا اس نے دو شادیاں کی تھیں لیکن دونوں شادیاں ناکام رہیں۔ دونوں بیویوں نے قاسم سے طلاق لے لی تھی وہ بیچاس بیچپن کے لپٹے میں ہوگا ایک سال قبل بھی مجھے اس کے گھر پر جانا پڑا تھا۔ ہواؤں کہ اس کے گھر میں چوری ہو گئی تھی چور اس کی تجوری سے دو لاکھ روپے لے اڑا تھا۔ جب میں نے اس

سے پوچھا کہ اسے کسی پر شک ہے تو قاسم نے تصور نامی خواجہ سرا کا نام بتایا تھا۔ خواجہ سرا نے گرفتار ہونے پر چوری سے انکار کیا تھا لیکن پھر پٹائی کرنے پر اس نے اپنا جرم قبول کر لیا۔ رقم بھی دے دی مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ قاسم کا شک درست نکلا اور رقم بھی اس سے براہ مہربانی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے قاسم سے پوچھ لی۔

”تمہیں کیسے یقین تھا کہ رقم تصور خواجہ کے پاس ہی ہے اور وہی چور ہے۔“ میری بات پر قاسم ہنس کر ادا اور نظریں پتچی کرتے ہوئے بولا۔

”زمانہ اچھا نہیں رہا کسی سے ہمدردی کرنی ہی نہیں چاہیے میں وقتاً فوقتاً تصور خواجہ کو غریب سمجھ کر مدد کرتا رہتا ہوں چوری سے ایک دن پہلے تصور خواجہ میرے پاس آیا تھا اور جب میں نے اسے کچھ رقم دے دی اس وقت وہ میری تجمدی میں رکھی دولت کو بڑی لپٹائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ میری رقم کو بری نظر سے تو نہیں دیکھ رہا پھر خود میں نے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا کہ یہ کیوں چوری کرے گا؟ میں اس کی مدد کرتا رہتا ہوں یہ ہرگز چوری جیسا جرم نہیں کرے گا۔ دوسرے دن چوری نے میرے خیال کو مضبوط کر دیا کہ وہ میں اس وقت سوچ رہا تھا وہ درست تھا۔“

سرور کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے پر میں اسی طرح چونکا جیسے اس کے خود کشی کرنے کی خبر پر چونکا تھا اس کی موت خود کشی سے نہیں بلکہ زہر سے ہوئی تھی اس کا مطلب ہے کسی نے سرور کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا اور قتل کو خود کشی کا رنگ دینے کے لیے سرور کے گلے میں رسی ڈال کر پیچھے سے

لٹکا دیا تھا۔ مجھے نئے سرے سے تفتیش کرنی تھی قاسم کے بارے میں معلومات کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ وہ اس محلے میں چند سال قبل ہی آیا تھا اور محلے کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا تھا۔ محلے کے لوگوں سے اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ اس کے گھر پر اکثر رات میں خواجہ سراؤں کی آمد و رفت رہتی تھی یہی بات مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ یہ کیسا شخص ہے مردوں کے بجائے خواجہ سراؤں سے دوستی رکھتا ہے اور ان کی مالی مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ مالی مدد کرنا کوئی برا کام نہیں ہے اور جب انسان کسی کی مدد کرتا ہے ان افراد کا ملاقات کے لیے آنا جانا لگا ہی رہتا ہے جب بھی ضرورت پڑے انہیں وہی شخص یاد آتا ہے جو ان کی مدد کر کے انہیں پریشانی سے نکال دے۔

ہم پولیس والوں کو مقدمے سے متعلق جب کوئی سراغ نہ ملے پھر ہم شک کا سہارا لیتے ہیں یہ مقدمہ بھی ایسا ہی تھا اس میں شک کیے بغیر گزارا نہیں تھا۔ پولیس کانسٹیبل بھیج کر میں نے قاسم کو تھانے طلب کیا میرے بلانے پر وہ دوڑا دوڑا چلا آیا وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”قاسم! تمہیں معلوم ہے سرور نے خود کشی نہیں کی اس کی موت زہر دینے سے ہوئی ہے۔“ میں نے قاسم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”کیا..... زہر سے ہوئی ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ قاسم نے مجھ سے نظریں چرا لیں۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ بتا رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے قاسم نے زہر کھا کر گلے میں پھندا ڈال لیا ہو۔“ قاسم نے کہا۔

”جس شخص کو مرنا ہو وہ گلے میں پھندا ڈال کر

مرتا ہے لیکن جسے مارا جاتا ہے اسے زہر دیا جاتا ہے۔ زہر پینے سے پر انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اسے اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ وہ رسی ڈھونڈ کر گلے میں ڈال کر سیکھے سے لٹکے اور وہ کس طرح سیکھے سے لٹک گیا۔ سیکھے کے نیچے ایسی کوئی چیز بھی نہیں ملی جس پر چڑھ کر وہ سیکھے سے لٹکا اور پھر جس پر چڑھا اسے ٹھوکر مار کر اپنے پیروں سے دور کیا۔ تمہارے گھر میں تمہارے علاوہ کوئی اور بھی نہیں رہتا جس پر شک کیا جائے تم نے سرور کو قتل کر کے واقعہ کو خود کشی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے لہذا میں تمہیں سرور کے قتل کے شبہ میں گرفتار کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پولیس کانسٹیبل کو اشارہ کیا پولیس کانسٹیبل نے قاسم کو پکڑ کر لاک اپ کر دیا۔ وہ چننا ہوا کہ ”وہ بے قصور ہے اس نے سرور کو قتل نہیں کیا ہے مجھے چھوڑ دو۔“ وہ چیخ رہا تھا لیکن میں بہرہ بن چکا تھا۔ قاسم کو عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے ضروری کاغذات تیار کر رہا تھا۔

دوسرے دن عدالت سے قاسم کا تین دن کا ریمانڈ بھی مل گیا۔ اب ہمیں پولیس کے روایتی حربے استعمال کرنے کا موقع مل گیا تھا بظاہر سخت جان حوصلہ رکھنے والا قاسم معمولی پٹائی پر کمزور پڑ گیا اور فرفر بولنے لگا میں نے فوری طور پر کاغذ اور قلم سنبھال کر کھانا شروع کر دیا۔

”مجھے بیچپن ہی سے پڑھنے کی بجائے کام کرنے کا شوق تھا میں بڑی ہی سی کھاڑیے کے کام سے منسلک ہو گیا تھا۔ کام کرنے سے پیسہ ہر وقت میری جیب میں رہتا تھا۔ جس چیز کے کھانے پینے کی طلب ہو۔ کھا لیتا اس وقت ہی سی آرام نہیں ہوا تھا مرنے سے ہر آدمی کی



دسترس میں نہیں تھا زیادہ لوگ کرائے پر دی سی آر پر فلمیں دیکھتے تھے۔ میرے دوست رفاقت نے بھی کیسٹ کرائے پر دینے کی دکان کھولی اور چاروی سی آر بھی رکھ لیے تھے۔ ہفتے میں ایک دن ایسا بھی ہوتا تھا جب دی سی آر کرائے پر نہیں جاتا تھا۔ اس دن میں اور رفاقت کے دوسرے دوست دی سی آر لے جاتے اور پوری رات فلمیں دیکھتے۔ رفاقت ہم سے کرائے کی مد میں بہت ہی کم پیسے لیتا تھا۔ زیادہ منافع کمانے کے لالچ میں رفاقت نے فحش فلمیں بھی رکھنا شروع کر دیں، ایسی فلمیں لوگوں کو لے جاتا دیکھ کر ہمیں بھی شوق ہوا۔ بحیثیت دوست ہم دوستوں کو سمجھاتے ہوئے رفاقت نے کہا۔

”تم یہ فلم بھول کر بھی نہ دیکھنا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی یہ فلمیں بہت خراب ہوتی ہیں انسان کا ذہن خراب کر دیتی ہیں دماغ میں ہر وقت اٹلے سیدھے خیال آتے رہتے ہیں ہر عورت کو دیکھ کر دماغ میں اس سے متعلق غلط سوچ ابھرتی ہے۔ انسان ہر عورت کو پھانس کر اپنی ہوس مٹانا چاہتا ہے اس چکر میں اکثر انسان عورتوں سے سہراہ جوتے بھی کھاتا ہے اس کی عزت بھی دو کوڑی کی ہو جاتی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس عورت کے متعلق وہ جو سوچ رہا ہوتا ہے وہ ایسی ہی مل بھی جاتی ہے اس طرح کی عورتیں مل جانے سے انسان غیر اخلاقی حرکات میں مبتلا ہو کر حلال و حرام کی تیز کھوبیٹھتا ہے وہ اپنی بیوی سے بھی وہ خواہش رکھنے لگتا ہے جیسا کام بازاری عورتیں کرتی ہیں اور۔“

”بس بس بھئی اپنا یہ وعظ پھر کسی دن کے لیے

رکھ چھوڑو۔“ کمال نے کہا۔

”رفاقت ہم تمہیں بہت شریف سمجھتے تھے لیکن تم بڑے چھپے رستم نکلے تمہاری باتوں سے لگتا ہے تم نے بھی تجربے کیے ہیں جیسا یہ باتیں تم پر آشکار ہوئی ہیں۔“ میں نے طنز کیا۔ میری بات پر سب دوستوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور رفاقت نزدیک سا ہو گیا۔

”میں نے یہ باتیں تمہیں سمجھانے کے لیے کی ہیں۔“

”بس رہنے دو اپنی نصیحت ساری دنیا کو فلمیں دکھا کر انہیں غیر اخلاقی برائیوں میں مبتلا کر رہے ہو اور ہمیں نصیحت کر رہے ہو چند روزہ زندگی ہے اسے کچھ انجوائے کر کے گزار لینے دو۔“ میں نے کہا۔ رفاقت جانتا تھا ہم لوگوں سے اس کا جیتنا ممکن نہیں ہے اس لیے خاموش ہو گیا۔

دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی فحش فلمیں دیکھنے لگے یہ چکا بہت ہی خطرناک ثابت ہوا۔ یہ ایسا چکا تھا کہ بجائے ختم ہونے کے دن بدن پودھتا جا رہا تھا۔ رفاقت نے ہم سے جو باتیں کی تھیں اور جنہیں ہم نے ہوا میں اڑا دیا تھا وہ سچ ثابت ہونے لگی تھیں۔ میں اور میرے دوستوں کا ذہن واقعی ویسا ہو گیا تھا ہم ہر عورت کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھنے اور اسے اپنی جانب مائل کرنے کی جستجو میں رہنے لگے تھے۔ محلے میں میرا کردار مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ گلی میں سے ہر لڑکی عورت کے گزرنے پر بے اختیار میرے منہ سے کوئی نہ کوئی فقرہ نکل جاتا اکثر میں راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا تھا صبح ہونے پر گھر جا کر سو جاتا اور دن جڑھے اٹھ کر ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل جاتا۔ گھر والے بھی میرے

اس عمل سے پریشان رہنے لگے تھے اور مجھے راہ راست پر لانے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنے لگے تھے کیونکہ انہیں شک ہو گیا تھا کہ میں راتوں کو گھر سے باہر کیوں رہتا ہوں۔ اس لیے انہوں نے میرے پاؤں میں زنجیر باندھنے کو شادی کی تیاریاں بھرپور طریقے سے شروع کر دی تھیں۔ میں دل ہی دل میں گھر والوں کی بے وقوفی پر ہنستا رہتا لیکن ان پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ میں انہیں کس طرح سمجھاتا کہ انسان کو جب بازاری کھانوں کی چاٹ لگ جائے پھر گھر کی مرثی بھی دال برابر لگتی ہے۔ بازاری عورتوں کی دلہا داد میں ہی ہوتی ہیں جو شریف انسان کو بھی بھٹکا دیتی ہیں۔

میری شادی جس لڑکی سے ہوئی وہ انتہائی خوب صورت تھی شادی کی رات میں نے جب اپنی بیوی کنول کو دیکھا میں دنگ رہ گیا وہ میری توقع سے بڑھ کر خوب صورت نکلی تھی پھر چند ماہ میں واقعی گھر سے نکلنا بھول گیا تھا صبح کام پر جاتا اور شام کو گھر پر واپس گھر والے بھی خوش تھے کہ میں راہ راست پر آ گیا ہوں ان کی خوش فہمی تھی آہستہ آہستہ میرے قدم پھر گھر سے باہر نکلنے لگے میں جس قسم کی غیر فطری عادتوں میں مبتلا ہو گیا تھا یہ عادت شریف گھرانے کی بیویاں پسند نہیں کرتیں۔ میں نے اپنی بیوی سے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا وہ مجھ پر برہم ہو گئی۔

”میں تمہاری بیوی ہوں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں آئندہ مجھ سے اس قسم کی خواہش کا اظہار نہ کرنا۔“

”تم میری بیوی ہو تمہیں میرا ہر حکم بجالانا ہوگا۔“ میں نے غصے سے کہا۔

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ  
ملکت منظر دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشاق احمد قریشی کی زیادت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری  
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

اسلام اہل ایمان کے لیے ہر وقت ہدایت کا منار ہے۔  
اسے دیکھ کر ہر مسلمان ہر نفس میں ہے۔  
اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس میں ہر شے کا غور ہے۔  
اس پر عمل کر کے ہی ہم آخرت میں فردِ کامل کر سکتے ہیں۔  
نیک کی مشکلات کو غور کر کے ہی اسلام میں کچھ ایسے ملے ضرور کے  
ہیں جن سے عام لوگوں کو دینی مسائل سے عملاً ملنے والے ہو سکیں۔

دنیا کے تمام مسالک متعلق  
علماء کرام کی گزارشات اور آراء پر مشتمل

ہر مسلمان کے لیے ہر وقت ہدایت کا منار ہے

پتا: کمرہ نمبر 7، قریب سید عبداللہ ہارون روڈ کراچی  
فون: 3526077/1/2 فکس: 35260773  
alislamkhi@gmail.com

”بیوی ہوں زر خرید غلام نہیں جو آقا کا ہر حکم بجالائے مجھ پر زیادہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے کروت سے آگاہ کر دوں گی۔“

مجھے اپنی بیوی کی زبان درازی پسند نہ آئی اور میں نے اس کی پٹائی کر دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ خوف زدہ ہو کر میرے اشاروں پر چلے گی اس کے برعکس النار دگل ہوا اس نے خوب شور مچانا شروع کر دیا، شور سن کر گھر والوں نے دروازہ پیشا شروع کر دیا، میں نے گھر اگر دروازہ کھولا اور باہر بھاگ گیا۔ رات گئے تک گھر نہیں لوٹا فجر سے کچھ وقت پہلے گھر لوٹا تو گھر والے سو رہے تھے کنول جاگ رہی تھی اس نے ہی دروازہ کھولا تھا میں خاموشی سے جا کر بستر پر سو گیا صبح بیدار ہونے پر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ کنول نے میری والدہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس لیے وہ مجھ پر سخت خفا تھیں والد صاحب نے بھی دبے دبے نظروں میں مجھے سمجھایا تھا کہ آئندہ ایسی بات پھر نہیں ہونی چاہیے میں بظاہر ہاں ہوں کر کے رہ گیا تھا لیکن میرے دل میں کنول کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس سے انتقام لینے کے لیے منصوبہ سوچنے لگا تھا۔ میں اسے ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ پھر میرے والدین کے سامنے منہ کھولنے کی جسارت نہ کر سکے چند دن خاموشی میں گزر گئے پھر میں نے مختلف بہانوں سے کنول پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ کبھی ناشتہ دیر سے دینے، کبھی کپڑے وقت پر نہ دینے، غرض میں کوئی بھی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا آئے دن تشدد سے پریشان ہو کر وہ میکے جا بیٹھی۔ میرے اور گھر والوں کے جانے پر بھی وہ سسرال آئے کو تیار نہ ہوئی مجبوراً مجھے کنول

کو اس کی خواہش پر طلاق دینا پڑ گئی۔

بیوی کو طلاق دینے کے بعد پھر میرے وہی دھندے شروع ہو گئے خاندان اور رشتے دار میرے کروت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ میں کس ذہنیت کا آدمی ہوں پھر بھی جن لڑکیوں کے رشتے گھر نہ آئیں ان کے والدین یہ سوچ کر دوسری بیوی کا خیال رکھے گا پہلی بیوی کے جانے سے نصیحت ہو گئی ہوگی اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا کہ دوسری بیوی کو طلاق دینی پڑ جائے۔ میری دوسری بیوی نسرین واجبی صورت کی مالک تھی کنول جیسی خوب صورت نہیں تھی میں نے شکر ادا کیا اگر اس سے بھی بڑی صورت کی بیوی ملتی تو میں کیا کر لیتا۔ چند ماہ تک میں نے ایسی کوئی بات بیوی سے نہیں کی جس سے وہ ناراض ہو جائے لیکن جسے جوت پڑ جائے وہ آسانی سے نہیں چھوڑتی۔ میں نے اپنی بیوی سے اپنی ناجائز خواہش کا اظہار کر ہی دیا وہ مجھے دیکھ کر بڑی طرح چوکی۔ ”آپ کو شرم آنی چاہیے مجھ سے اس قسم کی بات کرتے ہوئے کیا پہلی بیوی کے جانے پر بھی ہوش ٹھکانے نہیں آئے جو مجھ سے اس قسم کی بات کر رہے ہو۔“

”کیا بکواس ہے یہی ہو تم میں تمہارا شوہر ہوں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”شوہر بن کر، آوارہ مت بنو۔“ اس نے غصے سے گھورتے ہوئے دیکھا۔

بے اختیار غصے سے میرا ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔ میرے ہاتھ کو اس نے پنے پر پڑنے سے پہلے ہی پکڑ لیا۔

”میں کنول نہیں، ہر رے ظلم و ستم خاموشی سے سہہ لوں گی میں، ہر طرف بڑھے ہاتھ توڑنا

بھی خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا اتنی بہادر عورت میں نے اپنے زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ میں اسے نرم و نازک ددیشیز سمجھ رہا تھا میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بظاہر میں خاموش تھا لیکن دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی مجھے کسی صورت اپنی بے عزتی گوارا نہیں تھی میرا دماغ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ کس طرح سے لیا جائے اور پھر میرے شیطانی ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا پھر میں مطمئن ہو گیا۔

ایک ہفتہ گزرنے پر میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے نسرین کو بتایا کہ آج شام میرے دوست ناصر نے ہماری شادی کی خوشی میں دعوت رکھی ہے اور وہ تیار رہے۔ شام کو گھر لوٹنے پر نسرین مجھے تیار ملی میں اسے اپنے دوست ناصر کے گھر لے گیا اس کا گھر شہر کی آبادی سے دور تھا۔ اس علاقے میں گھر ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ نسرین اپنے انجام سے بے خبر تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے ناصر نے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا اس کے گھر والے کسی دوسرے شہر شادی میں گئے ہوئے تھے کھانا کھلا کر ناصر بہانے سے چلا گیا اب اس گھر میں نسرین اور میں ہی موجود تھے خاصی رات ہو جانے پر نسرین نے میری طرف دیکھا۔

”کیا گھر چلنے کا پرگرام نہیں ہے اور تمہارے دوست کا بھی کچھ پتا نہیں ہے وہ کہاں چلا گیا؟“

”وہ اب نہیں آئے گا میں نے ہی اسے یہاں سے بھیجا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”وہ کیوں؟“ وہ چوکی۔

”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کتنی بہادر ہے اسے اپنی طرف بڑھے ہاتھ تو خوب توڑنا آتے ہیں اس لیے ان ہاتھوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔“ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے دھوکے سے لائے ہو؟“ اس نے کہا۔

”میں تمہیں کہہ کر لاتا تو تم آتی یہاں۔“

”مجھے گھر لے چلو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہاں سے تم اس وقت ہی جاؤ گی جب میں اپنی بے عزتی کا بدلہ نہ لے لوں۔“ میں نے معنی خیز مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

وہ سمجھ چکی تھی کہ میں اسے کس ارادے سے لایا ہوں اس لیے وہ بے اختیار تڑپ اٹھی۔ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن میرے بچھائے جال میں بڑی طرح پھنس چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے لاک تھا اور وہ اب میرے رحم و کرم پر تھی۔

اس نے بڑی مزاحمت کی لیکن میرے آگے بے بس پھچکی کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔ اسے غیر فطری جنسی تشدد کا نشانہ بنائے جانے کا بہت دکھ تھا اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ مجھے خاندان برادری میں بدنام کر کے رہے گی۔ چاہے میں اسے طلاق ہی کیوں نہ دے دل اس کے دھمکی دینے پر مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے اس کا گلہ گھونٹ دیا وہ تڑپا اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔ اسے مرنا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے دروازہ بجایا دروازہ بجانے پر ناصر نے دروازہ کھول دیا اسے جب میں نے ساری صورت لال بتائی وہ بھی خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے درخت کی کار منگوائی اور اس میں پھیل سیٹ پر نسرین بٹھایا اور آگے کی سیٹ پر

مجھے بیٹھا کر سمجھایا کہ تم گھر پر کہہ دینا کہ اچانک  
نسرین کی طبیعت خراب ہوئی اور انتقال کر گئی۔ اس  
نے اپنے سر سے بلاناں دی تھی میری کچھ مجھ میں  
نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں گھر پہنچتے پہنچتے میری  
یہی سمجھ میں آیا جو ناصر نے کہا ہے وہی کروں۔  
گھر والے بھی نسرین کے اچانک انتقال پر  
حیرت زدہ تھے۔ میں نے نسرین کا گلہ محض اسے  
ڈرانے اور سمجھانے کی غرض سے دیا تھا کہ  
میرے خلاف کسی کے اگلے زہر نہ اُگلے اور آئندہ  
بھی میری خواہش کے آگے سر جھکا کر رہے مجھے کیا  
خبر تھی کہ وہ مرجائے گی۔ ابھی ہم لوگ نسرین کے  
مرنے کی خبر رشتہ داروں کو دینے کی سوچ رہے تھے  
کہ نسرین اچانک سے اٹھ بیٹھی اور مجھ پر نظر پڑتے  
ہی وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اسے زندہ دیکھ کر  
ایک بار پھر میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ میں  
تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا شرمندگی اور  
خوف کے مارے میں تین دن تک گھر نہیں گیا  
دوستوں کی زبانی ہی علم ہوا کہ نسرین نے خود پریتی  
سب گھر والوں کو بتادی تھی اور نیکی چلی گئی تھی پھر  
کبھی واپس گھر نہ آنے کے لیے میرے والدین  
نے بھی دوستوں کے ذریعے مجھے پیغام بھیج دیا تھا  
کہ گھر آنے کی زحمت نہ کروں۔ میں نے جو ان  
کی رشتہ داروں میں عزت افزائی کی تھی اس کا یہی  
انجام ہونا تھا۔ میں بھی جوانی کے جوش میں پھر بھی  
لوٹ کر نہیں گیا ظاہر ہے کس منہ سے جاتا نسرین  
کے زندہ نہ ہونے پر میرا بھرم قائم رہتا۔ جوانی کے  
جوش میں والدین سے اپنے کیے کی معافی مانگنا مجھ  
سے نہیں ہو سکتا تھا میرے والدین اتنے سخت دل  
نہیں تھے جو میں ان کے پاؤں پر کر معافی مانگوں  
اور وہ معاف نہ کریں وہ ضرور معاف کر دیتے۔

کیاڑے کے کام میں میری اچھی آمدنی  
ہو جاتی تھی اس لیے کرائے کے گھر میں رہنے لگا۔  
والدہ صاحب عزت دار آدمی تھے اپنی اور اپنے گھر  
کی طرف سے رشتہ داروں کی انگلیاں سختی  
برداشت نہ کر سکے اور یہ صدمہ دل میں لیے چل  
بے۔ ان کی وفات کو چند ماہ گزرے تھے والدہ بھی  
اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں دونوں کی میت میں  
شامل ضرور ہوا لیکن اجنبی لوگوں کی طرح سے  
بھائی بہنوں نے مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔  
میں اس قابل تھا میرے کردار کے باعث ان سب  
کی بہت بدنامی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے  
جنازے میں شرکت کر کے چلا آیا تھا۔ مجھے رہ رہ  
کر نسرین پر غصہ آ رہا تھا اگر وہ اپنی زبان بند کر لیتی  
تو یہ نوبت نہ آتی۔ کورٹ کے ذریعے اس نے مجھ  
سے طلاق لے لی تھی وہ بھی جانتی تھی کہ میں اتنی  
آسانی سے اسے طلاق نہیں دوں گا اس لیے  
عدالت سے رجوع کیا تھا۔  
”میں تم سے الف لیلیٰ کی داستان سننے نہیں  
بیٹھا تم نے ماضی میں کیا کیا ہے مجھے اس سے کوئی  
سرور کا نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے نوکر کو  
کیوں قتل کیا ہے کیا وجہ تھی؟“ میں نے اپنا قلم  
روک کر غصے سے استہ دیکھا۔  
”میں وہی بتا رہا ہوں۔“ وہ مجھے غصے میں دیکھ  
کر ڈر گیا۔  
”تمہارے ماضی سے سرور کا کیا تعلق ہے؟“  
میں نے کہا۔  
”ہاں بہت بہت تعلق ہے میں یہی بتانا چاہ  
رہا ہوں۔“ قاسم نے کہا۔  
”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے ذرا مختصر کر کے  
بتاؤ۔“ میں نے بے زاری سے کہا۔ اس کی گفتگو

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بلا وجہ لفاظی کر کے  
برائیتی وقت ضائع کر رہا ہے۔  
”میرا اپنے گھر سے ناتہ بالکل ختم ہو کر رہ گیا  
ہاں اس کا مجھے بہت دکھ ہے میں مختلف کرائے کے  
مکانات میں رہا جب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ  
اپنا ذاتی مکان خرید لوں تو میں نے موجودہ مکان  
خرید لیا۔ میں اپنے کردار سے بدنام ہو گیا تھا اس  
لیے کوئی بھی اپنی بیٹی مجھے دینے کو تیار نہ تھا اس  
لیے میری زندگی تنہا ہی گزر رہی تھی ایک خواجہ سرا  
سے کیا دوستی ہوئی مجھے ایسا لگا جس کی میں تمنا لیے  
ہوئے تھا وہ آرزو پوری ہو گئی ہے مجھے خواجہ سرا کی  
دوستی کا ایسا چرکا پڑا میں آئے دن نئے نئے خواجہ  
سراؤں سے دوستیاں کرنے لگا۔ اپنے شوق کی  
خاطر انہیں ہر ماہ اچھی خاصی رقم بھی دینی پڑتی تھی  
وہ بھی مجھ سے خوش تھے۔ تصور خواجہ سرا لاپی تھا  
اس نے میری تجوری میں جھانک لیا تھا اس میں  
اکتھی رقم ہوتی ہے واقعہ دانی رات اس نے مجھے  
چائے میں نشا آور شے پلا کر بے ہوش کر دیا اور  
ساری رقم نکال کر لے گیا۔ میں نے آپ کو اصل  
حقیقت نہیں بتائی تھی صرف اتنا بتایا تھا کہ اس  
خواجہ سرا نے چوری کی ہے اور میں ان کی مالی مدد  
کرنا ہوں حالانکہ یہ جھوٹ تھا آپ نے ابے  
گرفتار کیا اور رقم بھی اس نے دے دی میرے  
پاس گھر کے کام کاج کے لیے بچے کی ضرورت  
ہوتی تھی اس لیے وہ قافو قفا میرے پاس مختلف بچے  
کام کے لیے آتے رہے تھے ان دنوں مجھے گھر  
کے کام کاج کے لیے کسی لڑکے کی ضرورت تھی  
سرور میرے دوست کلیم کی معرفت آیا تھا۔ اسے  
دیکھتے ہی میں خوش ہو گیا اور بغیر کسی شرط کے ملازم  
رکھ لیا۔ میرا اس پر دل آ گیا تھا وہ تھا بھی بہت

خوب صورت جو دیکھے پسند آئے سرور کام میں  
اچھا تھا برتن وغیرہ صاف کرنے کے ساتھ اچھا  
باورچی بھی تھا۔ وہ بہت ہی شاندار کھانے پکاتا تھا  
ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ میرا اس کے بغیر دل  
ہی نہیں لگتا تھا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے کا  
منصوبہ تیار کرنے لگا کہ اس کام کے لیے اسے کس  
طرح آمادہ کروں یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔  
ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے  
میں بیٹھا ہوا کسی تصویر کو غور سے دیکھ رہا ہے میں  
چپکے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔  
”کیا بات ہے بھئی بڑے غور سے تصویر دیکھی  
جار ہی ہے کس کی تصویر ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”یہ..... یہ..... میری والدہ کی تصویر ہے۔“  
سرور نے تصویر دکھائی۔  
تصویر دیکھ کر مجھے جھکا لگا اس خاتون کو دقت  
نے بوڑھا ضرور کر دیا تھا لیکن میں اسے اب بھی  
ہزاروں میں پہچان سکتا تھا یہ کوئی اور نہیں نسرین  
تھی۔ وہی نسرین جس نے مجھے اپنے گھر سے بے  
گھر کر دیا تھا آج میں جو زندگی جی رہا تھا یہ میرا  
مستقبل نہ تھی۔  
”تم نسرین کے بیٹے ہو؟“ میں نے سرور کو غور  
سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”تم میری ماں کو کیسے جانتے ہو؟“ اس نے  
پوچھا۔  
”میں تم سے بہت پوچھ رہا ہوں وہ جواب دو کیا  
تم نسرین کے بیٹے ہو؟“ میں نے اسے گھور کر  
دیکھتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔“ سرور نے مختصر جواب دیا۔  
”تم نے کیا کیا تھا کہ گاؤں میں رہتے  
رکھ لیا۔ میرا اس پر دل آ گیا تھا وہ تھا بھی بہت



”ہاں ہم گاؤں میں رہتے ہیں میری ماں کی شادی فیروز سے گاؤں میں ہوئی تھی اس لیے وہ گاؤں میں رہتی ہیں۔“ سرور نے کہا۔

اس کے انکشاف پر میرے دماغ میں ہلچل سی چمک گئی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سرور کے کمرے سے باہر آ کر بھی میں بے چینی اور شدید غصے کی حالت میں تھا۔ میرے پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے میرے ذہن پر یہی بات سوار تھی۔

”انتقام..... انتقام..... انتقام.....“

میں اپنے کمرے میں آ کر بے چینی سے ٹہل رہا تھا مجھے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ میری دشمن نسرین کا بیٹا میرے ہی گھر میں ملازم کے روپ میں آ گیا تھا اور مجھے خبر ہی نہیں تھی۔ میں دوبارہ سرور کے کمرے میں گیا وہ سو رہا تھا اچانک میرے ذہن میں آیا کہ اسے مار دوں مگر اس کا گلہ گھونٹ کر مار دینے سے میں خود بھی قتل کے مقدمے میں پھنس سکتا ہوں لہذا اسے زہر دے کر ہلاک کر دینا چاہیے اور اس کی لاش بچکھے میں لٹکا کر خودکشی کا ڈرامہ کرنا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں مطمئن ہو گیا اور سوچنے لگا کہ جب سرور کی لاش نسرین کے پاس جائے گی اس کا کیا حال ہوگا وہ اپنے بیٹے کی موت پر ماتم کرے گی اور میں اپنے گھر پر اس کے ماتم پر جشن مناؤں گا۔ اس طرح میرا انتقام پورا ہو سکتا ہے قدرت نے خود بخود مجھے انتقام کا بھرپور موقع فراہم کر دیا تھا اور مجھے اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا تھا۔

دوسرے دن میں نے زہر خریدا اور سرور کو چائے میں ملا کر دے دیا زہر کے اثر سے وہ چند منٹوں میں ہی ہلاک ہو گیا تھا پھر میں نے اس کے

گلے میں پھندا ڈال کر پچھلے سے لٹکا دیا تاکہ یہ خودکشی کا کیش بن جائے۔ میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ لاش کے نیچے کرسی یا میز گرا دوں جب مجھے خودکشی کا رنگ دینا تھا تو اسے زہر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے گا گھونٹ کر بھی بچکھے پر لٹکایا جاسکتا تھا ان دو باتوں کے سبب ہی میں قتل کے مقدمے میں پھنس گیا۔“ تاسم نے کہا۔

میرے ذہن پر جوا بھنسنے لگی وہ سب کچھ گئی تھی اس لیے میں مطمئن ہو گیا تھا صبح کورٹ میں قاسم کو پیش کرنے کی کاغذی تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی۔ سرور کے متعلق یہ رپورٹ اخبارات میں بھی بہت نمایاں کریں گے جن لوگوں نے اخبارات میں سرور کی خودکشی سے متعلق خبر پڑھی تھی وہ نئی خبر پڑھ کر چونکے بنا نہیں رہ سکیں گے اکثر قتل کے مقدمات خودکشی کے مقدمات کی پہلی خبر کچھ ہوتی ہے لیکن جب تفتیش ہوتی ہے تو پہلی خبر غلط ثابت ہوتی ہے دوسری خبر سچ ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو ہم پولیس والے ملزمان کا کریمانہ حاصل کر کے تفتیش ہی نہ کریں اور پہلی بات کو بنیاد بنا کر مقدمے کی کارروائی عدالت میں چلتی رہے۔

مجھے اس خبیث انسان سے نفرت ہو رہی تھی جس نے انتقام کی خاطر ایک بے گناہ معصوم بچے کی جان لے لی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے ایسی عبرت ناک موت دوں کہ موت کو بھی پسینے آ جائیں مگر میں قانون ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا میں قانون کا رکھوالا تھا قانون شکن نہیں۔

✽

## ضابطہ

### جویریہ سلیم

غریب کا تعلق حالات بھوک بھنے پرانے کھنڈوں ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں سے نہیں بلکہ غریب کا تعلق سوچ سے ہے۔ غریب ایک احساس کا نام ہے جو صاحب جائیداد اور سرمایہ داروں میں بھی بے نار ہو سکتا ہے۔ ایک فاقہ زدہ بچے کا احوال وہ روز گزما کھود کر پانی پیتا تھا۔ مگر غریب اور فقیر کہلاتے پر حیا نہیں تھا۔

ہمارے شاعر ہنس سانس لینے والے ایک عظیم کردار کی کئی کہانی

ابا جان نے جب شہری آبادی سے کچھ ہٹ کر زمین خرید کر مکان بنایا تو ابا جان نے خوب دانو کیا کہ اس اکیلے مکان میں ہم کیسے رہیں گے۔ نائی بازار نزدیک ہے تاہی سڑک ہے کوئی رکشہ اور ٹیکسی بھی وہاں نہ آتی تھی مگر ابا جان نے ہر ایک کا اعتراض نظر انداز کر دیا ان کا کہنا تھا کہ یہاں مجھے زمین سستی ملی ہے ہمارا مکان بنا ہے تو آہستہ آہستہ اور لوگ بھی مکان بنا لیں گے اور پھر اس زمین کی قیمت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ مگر ابا جان پھر بھی مطمئن نہ تھے وہ تنہائی سے بہت خوف زدہ ہوتی تھیں۔ جب واپڈا والے بجلی کا میٹر لگانے آئے تو درخواست فارم میں ایڈریس لکھتے ہوئے والد صاحب کے نام کی مناسبت سے محلہ نام ”محلہ قریشیاں“ لکھ دیا۔ ابا جان کا کہا سچ ثابت ہوا اور آہستہ آہستہ وہاں آبادی ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کئی گھر اور کوٹھیاں بن گئیں۔ مگر زیادہ تر وہاں غریب لوگ ہی رہتے تھے۔ اس علاقہ کا نام ”محلہ قریشیاں“ ہی مشہور ہو گیا۔ ہمارا گھر بڑی سڑک پر آ گیا۔ مارکیٹیں بھی بن گئیں اور خوب چہل پہل اور رونق ہو گئی۔ ارد گرد کے دیہاتی یہاں ہی خریداری کرنے آتے تھے۔

☆.....●.....☆

سروپوں میں صبح ابھی دھند چھٹنے بھی نہ پانی کے گلی اور سڑک میں ہنگامے شروع ہو جاتے۔ ہمیں سے وقتی قتل چلانے کی آواز آتی تو کہیں سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ پرندوں کے پروں کی

یہ آواز مسلسل کئی ماہ سے میرا تقاب کر رہی تھی۔  
گلی میں گونجنے والی اس بکی آواز سے ہمیشہ میری آنکھ کھل جاتی۔ ایسا معلوم نہ ہوتا تھا کہ پالا ہند کبڑ ٹھہرتی ہوائیں۔ یہ سب اس کے لیے بے سود عوامل تھے۔ جیسے اس کا انسانی خول موسموں کے تغیر و تبدل سے اثر انداز نہ ہوتا ہو۔ جانے کس آب و گل کا بنا تھا وہ؟ کمرے سے برآمدے تک صرف پندرہ سینکڑا راستا تھا یہ پندرہ سینکڑا سردی کے عالم میں مجھے پندرہ سال معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس غضب کی سردی میں بھی وہ آواز اپنے مقررہ وقت پر ہی ہوا کے دوش پر بلند ہو کر گٹما میوں کے ویران صحراؤں میں کھو جاتی۔ پھر کہیں سے لڑتی لہرائی آتی دھند کی طرح چادر چھا کر میری سماعت سے نگرانی اور مر جاتی۔

☆.....☆

وہ بڑا فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ سب بچوں کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ اسکول میں چھٹیاں نہ تھیں مگر گویا اسکول تفریح گاہ بنے ہوئے تھے۔ ہم سب اسکول جاتے اور گپ شپ لگا کر واپس آ جاتے کیونکہ ہمیں نیچے کا انتظار تھا۔ سب بچے اس روز معمول سے زیادہ خوش تھے کیونکہ گزشتہ رات کھانے پر اعلان کر چکی تھیں کہ کل دوپہر بیسی رونی اور ام ہوں گے اور وہ بھی حصہ رسدی کے بغیر۔ حصہ رسدی کرنے سے اموں کا مزا کر کرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک آفت بجی ہوئی تھی۔ سنب مل کر خوب دھما چوڑی جارہے تھے اور چیخ چیخ کر تمام محلے کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مگر میں معمول کے مطابق ان پر گر جیتے برسنے کے بجائے چپ چاپ لحاف میں دبی پڑی تھی۔ اداس اداس آج میں نے ان کو ڈانٹا بھی نہیں نہ جھڑکا نہ منع کیا یہاں تک کہ وہ اعلان جنگ کرتے ہوئے میرے کمرے میں شیٹون مارنے لگے۔ میری قرینے سے سچی ہوئی چیزوں کو انہوں نے نہیں نہیں کر کے رکھ دیا کپڑے اور میز پوش گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ کتابیں کریبوں پر اور جوتے میزوں پر بچا دیے مگر میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میں نے لحاف کے اندر جنبش بھی نہ دکھائی۔ اچانک شور مچ گیا سچ سم کر رہ گئے اور میرے کانوں میں ہلکی ہلکی آواز آنے لگی جیسے کوئی کھسی آواز قطرہ قطرہ پھاڑی۔ سے گر رہی ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ دادا میاں بیچ لیے میرے سر ہانے کھڑے ہیں اور دادی اماں سینہ کوئی کے سے انداز میں گھبرائی

☆.....☆

اس آواز کی حقیقت اس سوز کا راز اور اس راز کا مفہوم جاننے کے لیے میرا دل اس زور سے بے چین تھا جب ایک روز اچانک مجھے احساس ہوا کہ صبح کی نیلگیوں اور سرما کی کپڑا لودھند میں ایک نیا سوز جاگا ہے۔ ایک نئی جلن نے آنکھ کھولی ہے۔ میرے دل میں ایک ننھا سا درد اٹھا اور اگلے ہی لمحے لحاف ایک طرف پھینک کر میں جلدی سے برآمدے میں آ گئی لیکن جس جادو بھری آواز نے مجھے یہاں لاکھڑا کیا تھا وہ اب دور جا چکی تھی اور بہت دور سے آرہی تھی یوں جیسے رخصت بہار کے ساتھ ساتھ آنسو بہانی بلبل دور تک گاتی چلی گئی ہو اور اس کا آخری نغمہ اس کی روح کا نیچوڑ بن کر اس کے شکستہ و افروزہ جذبات کی بازگشت بن کر اک آخری ہچکی کے ساتھ کئی کی انتہائی بلند یوں پہ چھوٹا ہوا دل میں چھید کر کے کہیں نکل گیا ہو۔

میری طبیعت اداس ہو گئی۔ برندوں کی چچھابند اور بہن بھائیوں کی چٹلی شرارتیں بھی اس روز میرا دل نہ بانٹ سکیں۔ یوں لگتا تھا کہ میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی تھی اور پھر کھو گئی۔ کوئی اصول سوئی اپنی پوری آب و تاب

گھبرائی میرے بستر پر بیٹھی ہیں۔ مگر احساسات پر تو گویا کسی نے پتھر کی بھاری سٹیں رکھ دی تھیں۔ بچوں کے ٹھنڈے منہ باتھ مجھے نرم نرم روئی کے گالے محسوس ہو رہے تھے۔

”جی کیسا ہے میری جان۔“ دادی جان نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

وہ گداز اور پیار بھرا لہجہ میرے لیے اتنی راحت کا باعث بنا کہ میں نے آنکھیں کھول کر تشکر کے ساتھ دادی جان کو دیکھا اور پھر گویا ان کی ساری برداشت قابو سے باہر ہو گئی۔

”اے ہزار بار ہی تو کہا ہوگا کہ میری بچی یوں نہ پھرا کر۔ اللہ رکھے گھر میں سب کچھ موجود ہے مگر محال ہے جو صبح سے چلنا شروع کرتی ہوں کہ یہ جھکو کہ شام ہو جاتی ہے مگر میری سنے کون؟“ انہوں نے لحاف میرے چاروں طرف دباتے ہوئے رو باہی ہو کر کہا۔ ”میں تو کل ہی سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت کبھی کبھی ہے میرا تو اسی وقت ہاتھ لٹکا تھا یا اللہ خیر کسی کی نظر نہ لگ گئی ہو۔ اری اوتھین لا نیو ذرا ڈنڈی والی سات مرجیں اور جی تم کیا کھڑے بیچ کھمارہے ہو جاؤ کسی کو دوڑاؤ ڈاکٹر کی طرف۔“

تھمی نے اپنی نمی سی بچس آواز میں گرون گھما کر بڑے بھولپن سے پوچھا۔

”داناں کا ہوا بچیا کو جی کھلاب سے کا؟“

مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی اور میں لحاف اتار کر پھینک کر باہر نکل آئی۔ مگر مجھے فوراً ہی پھر بستر میں دبایا گیا۔

”ہے دماغ پھرا ہے کیا گرمائی سے ایک دم نکل کر چل دیں۔ میں ناشتا نہیں منگوا رہی ہیں۔“ اسی نے مجھے ڈپٹے ہوئے کہا۔

ممتا بھری یہ مائیں اور دادیاں زندگی کا کتنا اٹول خزانہ ہوتی ہیں۔ بات بات میں تجسس و ہمہ تشویش کنٹی پیاری حقیقتیں ہیں یہ جن میں ان کی شخصیت

گھری رہتی ہے یوں جیسے پھول میں چٹائیں آواز کے سحر سے نکل کر پھر ہستی کھلتی اس دنیا میں لوٹ آتی۔

اگلے روز پھر اسی وقت اسی آواز نے اسی انداز اور اسی لے میں ابھر کر مجھے جگا دیا اور میں بے اختیار کچھ بولی برآمدے میں آ گئی۔ جہاں تک میری نظر جاسکی۔

وہ کمر کا سینہ چرخی ہوئی تھی۔ مگر وہاں تو صرف پالا تھا۔

اس کے بعد کئی ماہ تک یہ آنکھ پھولی ہوئی رہی اور مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ اس آواز کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو چاندنی رات میں چننے والی کوئی ایسی پیکوری ہے جو کسی ویرانے میں درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھی چاند پر نظریں گاڑے سینہ پھیلا پھیلا کر نوحہ خوانی کر رہی ہو۔ منہ کا جالا جس کے نغموں کا گلا گھونٹ دیتا ہو اس آواز کا تقاب سے بود تھا۔ میری پوری سعی کے باوجود یہ کھوج نہ لگا تھا کہ یہ کس کے گلے سے نکلتا ہے اور یوں کسی کو جگائے بغیر خود بخود خاموشی سے ڈوب جاتا ہے۔ یا کسی کنگی میں کھونسنے والی یا ڈاکٹر کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جو یوں صبح صبح ہاتھوں میں ٹوکر کی اٹھائے قدم قدم پر آواز لگاتا پھرتا ہے۔ یہ کس کے کیچے کی ٹھنڈک ہے؟ جو جسم کو ٹھنڈا دینے والی سردی میں چند روپوں کی خاطر اپنے احساسات سے بے گناہ گھر گھر گلی گلی صدا لگاتی ہے۔

”دیکھی گرم انڈے۔“

جیسے یقین تھا کہ اس ٹوکر میں گندے انڈے ہیں۔ ”مگر گرم؟“ کہہ کر نہ معلوم وہ خود کو دھوکہ دینا چاہتا تھا یا لوگوں کو کیا ثبوت تھا کہ وہ انڈے دیکھ نہیں سکتے۔ اور پھر اتنے سویرے بھلا کون لینا ہوگا؟ میں نے یہاں تک دن اس سے دیکھی گرم انڈے لے کر تو نہ سوچ کر میں ایک دن اس کے آنے سے پہلے اپنے باغ میں بھی ندی تھی نیچے جا کر گئی ہیں۔ وہی اور جوں ہی اس آواز نے اندھیرے کا جگر میں گرم چادر کو جسم سے چپکائی ہوئی تیزی سے جگمگایا اور چند ہی لمحوں میں وہ میرے مقابل نہیں



بلکہ میں اس کے مقابل کھڑی تھی۔

میل پکلی، پچھی ہوئی ہلکی سی دری نما بڑی میں مراد گردن کو لپیٹنے بیروں میں ربر کے گھسے ہوئے جوتے پہنے ہوئے اور چیتھروں کے ڈھیر میں چھپا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا۔ انسانیت کی تنگی داستان مصور کی ادھوری تصویر کی طرح وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”اُڑاؤ دیکھو میں ہی وہ آواز ہوں جو تمہارے دل میں اتر سکتی ہے۔ مگر جس کے بولوں پر کوئی غور نہیں کرتا۔ اس نامکمل تصویر کی طرح جسے مکمل کرنے سے پہلے مصور کے ہاتھ مفلوج ہو گئے ہوں۔ جس میں رنگ آمیزی سے نقل فنکار کی آنکھیں دھندلائی گئی ہوں۔“ اس نے مجھے دیکھا اور دھکتا ہی رہ گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف اور حیرانی کے سائے مٹڈلا رہے تھے۔ نیلے نیلے ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے چٹختے کو تیار شگونہ ایک ہاتھ سے ٹوکرے تھے۔ دوسرے سے جیب وہ ایک مجرم کی طرح میرے سامنے تھا۔ جسے میں نے چوری کرتے ہوئے جیسے پکڑ لیا ہوا اور وہ پوچھ رہا ہو۔

”ہنا تو میری حقیقت تک کیوں پہنچ گئی۔ حقیقت تو بڑی عریاں ہوئی ہے کیا تم میری اس عریانی کا مذاق اڑانے آئی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے ایک روپے کا بھی مال نہیں خریدے گی مگر..... مگر.....!“

”آواز کی حقیقت آواز سے زیادہ حسین نہ ہو اس سے زیادہ دل سے زوروری ہوئی ہے۔“ میں بڑبڑاتی تو وہ تیزی سے مڑا اس ننھا سا ناخن اور ناتراشیدہ ذہن بھلا میری بات کو کیا سمجھتا تھا میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ارے سنو تو مجھے انڈے چاہئیں۔ رات کچھ مہمان آگئے ہیں۔ میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ یہ سارے انڈے کتنے کے ہوں گے۔“

”سارے۔“ حیرت سے اس کی آنکھیں پٹ

لگیں۔

”ہاں ہاں سارے اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ مہمان بھی تو بہت سے ہیں نا۔“ میں نے اسے پچھارتے ہوئے کہا۔ ”کتنے پیسے لو گے سب کے؟“

”تیس روپے۔“ تیس روپے میرے اور دس روپے نفع کے۔“ اس نے جلدی سے سارا حساب مجھے سمجھا دیا۔

”میں نے پچاس روپے کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھا اور ٹوکرے پکڑ لی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ ”بھئی یہ تو بہت بھاری ہے میں نہیں اٹھا پاؤں گی تم تو بڑے بہادر بن گئے ہو؟ راؤ پر تک تو لے چلو نا۔“

وہ فوراً تیار ہو گیا اور ٹوکرے میرے ہاتھوں سے لے کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”جب تم سامان بیچ لیتے ہو تو گھر جا کر کھانا کرتے ہو؟ میں بتاؤں تم سو جاتے ہو گے اور پھر اٹھ کر کھلی میں گھلی ڈنڈا کچے اور کبڈی کھیلتے ہو گے اور.....!“ اس نے میری بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔

”جی نہیں، میں سودا بیچ کر اسکول چلا جاتا ہوں۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوں جانے سے پہلے ماں کو دوپہر کے لیے نا ڈال لاکھ دیتا ہوں۔ میری ماں کہتی ہے بیٹا جلدی سے پڑھ لے پھر ہم غریب نہیں رہیں گے۔“

اب میں اسے کہنے سمجھتی کہ یہاں تو پڑھ لکھے لوگ بھی غریب رہ جاتے ہیں۔ بات کو جاری رکھنے کے خیال سے میں نے کہا۔

”تم جب بازار..... سودا خریدتے ہو تو دکاندار تو تمہیں خوب لوٹتے ہوں گے۔ اتنے چھوٹے سے تو ہو تم۔“

وہ تیر کی طرح میری طرف مڑا اور بولا۔ ”کیوں لوٹ لیتے ہوں گے میں کوئی بے وقوف ہوں جو لوٹ جاؤں۔ میں بھی تو دکاندار ہوں آخر اس اتنا

فرق ہے کہ میں اپنی دکان کدھے پر لیے پھرتا ہوں اور وہ بیٹھ کر دکان چلاتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا کاش اس نے کوئی بھولی سی بات کہہ دی ہوتی تو وہ ایک دم بچی عمر کے مردوں کی طرح بولنے لگتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ایسی باتیں تمہیں کون سکھاتا ہے۔“

کہنے لگا۔ ”سکھاتا کون چار سال سے انڈے بیچ رہا ہوں۔ کیا اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں سیکھ سکتا۔“

میں چپ ہو گئی اس سے بحث بے کار تھی۔ اس کی گفتگو اس کی آواز کی طرح بے ساختہ نہ تھی۔ اس میں تجربے کا بخور تھا۔ جو مجھے اچھا نہ لگا۔ انڈوں کی ٹوکرے پہنچا کر وہ واپس چلا گیا اور میں خواہش کے باوجود اسے چائے کی ایک پیالی بھی نہ پلا سکی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی میں اسے کمرے میں لا کر اس کی پیاری پیاری باتیں سنوں گی۔ مگر میری تمام خواہشوں پر اس پڑ گئی۔ خوشی کی امید کئی پرکشش ہوئی ہے مگر حاصل ہو کر وہ کتنی ناہو جانی ہے بالکل مراب کی طرح۔ میں نے بے دلی سے انڈے اٹھا کر میز پر رکھ دیے کہ بعد میں کچن میں رکھ دوں گی اور میں لحاف میں گھسنے ہی والی تھی کہ اس کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔

وہ شرمایا شرمایا۔ سا جھینپی سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ میں نے اسے اندر بلایا تو اس نے جھجکتے ہوئے تیس روپے میرے تکیے پر رکھ دیے۔

”معاف کر دینا جی میں واپس کرنا بھول گیا تھا۔“ اس نے ایک اچھٹی ہوئی نظر اپنے کماٹے ہوئے سرمائے پر ڈالی اور پوچھا۔

”کیا مہمان ابھی تک سو رہے ہیں جی؟ ایک دفعہ ہمارے ہاں مہمان آئے تھے۔ سویرے سویرے اٹھ کر میرے سارے انڈے کھا گئے تھے اور میں کھڑکی کے نیچے کھس کر رونے لگا تھا اور خوب رو دیا تھا اس پر میری ماں نے کہا تھا۔

”اے پتر جیرے مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں یہ رو دنا دھونا کیسا۔ چل باہر نکل اللہ کا شکر ادا کر تیرے گھر رحمت کی سواری اترتی ہے۔“

وہ زور زور سے ہنسنے لگا یوں گویا اسے دنیا کا کوئی غم لاحق نہ ہو۔ جیسے وہ روزگار کا بار کوئی خونچافرہ نہ ہو بلکہ بارغ میں چھپانے والی کوئی بلبل ہو۔ ناز و نعم میں پلا ہوا کوئی شہزادہ ہو میرے دل میں اس کے لیے ڈھیر سارا پیارا لٹا آیا۔ میں اسے کتنا غلط سمجھتی تھی۔ وہ تو بالکل بچی سی تھا۔ بے وقوف۔ مائیں نے اسے کھینچ کر بستر پر بٹھالیا اور بوا سے کہہ کر چائے منگوائی۔ تو وہ بڑی بدتمیزی سے بالکل بچوں کی طرح چائے پینے لگا۔ مجھے اس میں اور اپنے بھائی میں صرف اتنا فرق نظر آیا کہ اگر میرا بھائی بدتمیزی سے چائے پیتا تو ای اسے بار بار توکتی تھیں۔ اسے بدتمیزی ہونے کا مژدہ سناتیں۔ محفل کے آداب سے بے گانہ شیرا تیں اور بار بار جھنجھٹا تیں مگر اس پر یہ باتیں اثر کرتی تھیں۔

چائے پی کر اس نے اپنی کالٹی سے منہ پونچھا۔ زبان سے پتھارے کی آواز نکالی اور کھڑا ہو گیا اس کی آنکھیں ایک دم بیروں کی طرح چمکنے لگیں۔ نیلے نیلے ہونٹوں پر ایک دم گلابی رنگ بکھر گیا معصومیت کی اک تازی سی ہراس کے چہرے پر پھیل گئی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چائے کی ایک حقیر سی پیالی کے لیے وہ کس قدر ممنونیت کا اظہار کر رہا تھا میں کھینچی سی ہو گئی۔ ایک لحنت اس نے پلیٹ کر اپنی نیچی ہوئی کائنات کی طرف دیکھا بالکل یوں جیسے کسان اپنی بری بھری تیار فصل کی طرف دیکھتا ہے اور اس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ پھر کچھ سوچتے کچھ جھجکتے ہوئے اس نے جیب سے تیس روپے نکالے اور پھر لرزئی ہوئی آواز میں بولا۔

”میرے انڈے واپس کریں جی۔ یہ میں اپنے پیسے میں ابھی اتنے پیسے دوبارہ بنا لوں گا جی۔“ اس نے اداسی سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔



محترم عمران بھائی  
السلام علیکم

جلاد مسیحا کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ ایک بالکل سچی اور سبق آموز کہانی ہے۔ آپ نے قرآنی آیات کے پس منظر میں کہانی لکھتے کو کہا تھا یہ کہانی سورہ النور کی تین آیات پر مبنی تھی۔ میں تمام بیہوشی سے گزارش کروں گی کہ وہ سورہ النور کو ضرور اور بغور پڑھیں امید ہے فلاح پائیں گی۔

آپ کی راجی کی مصلحت  
شمسی ارشد  
کراچی

ضرور کرے گی۔ شہزاد کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔  
کہتے ہیں عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے، ان دونوں کا مسلسل ایک دوسرے سے ملنا، گھر والوں کو بہت کچھ سمجھا گیا، وہ رشتہ دار جو شاید کبھی ان کے گھر نہیں آیا تھا۔ اب بار بار آنے لگا، غیر اس کے آنے سے کھل جاتی، اسے ٹائم دیتی، کبھی خود بھی ان کے گھر جانے لگی۔

ایک دن بھابی نے امی کے کہنے پر غیر سے سب کچھ پوچھ لیا۔ تیر پہلے تو بچکانی بھرا فرار کر لیا کہ وہ اور شہزاد ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔  
بھابی نے جھٹ سا راجہ جہزہ ای کو سنایا اور امی نے ابا کو امی اور ابا سمیت بھابی اور بھابی کو بھی اس رشتے پر اعتراض تھا اور اس کی وجہ بالکل صاف اور واضح تھی کہ شہزاد ایک بہت ہی غریب اور بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس کے سر پر چھ بیہوش کی شادی کی ذمہ داری کا بوجھ بھی تھا۔

امی نے خود غیر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ شہزاد جیسے مفکوک الحال

وہ جگت تیر آپا تھیں، چھوٹا بڑا بوڑھا جوان ہر کوئی انہیں تیر آپا کہہ کر مخاطب کرتا تھا اس عمر میں بھی وہ بے حد حسین تھیں، انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے عہد جولانی میں بھی کمال کا حسن رکھتی ہوں گی۔  
کالج کے زمانے میں ہی ڈھیروں لڑکے ان کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لیے اپنا دل ہتھیلی میں لیے پھرتے تھے لیکن وہ کسی کو گھاس ہی نہیں ذاتی تھی شاید اس نے اپنے دل و دماغ میں اپنی زندگی کے ساتھی کا کوئی خاکہ بنایا ہوا تھا۔

خاندان کے بھی کئی لڑکے اور ان کی بائیں انہیں اپنے گھر کی زینت بنانے کی خواہش مند تھیں۔ اس کے والدین کو بھی اپنی بیٹی کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا اسی لیے وہ بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھے۔  
پھر ایک دن انہیں اپنا آئیڈیل مل گیا، وہ ان کے دور پر رشتہ داروں میں سے تھا۔ ایک شادی کی تقریب میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، نگاہوں نے پیغام و سلام قبول کیا اور باہم الفت میں گرفتار ہو گئے۔

تیر ان دنوں لاء کالج میں تھی اس کا ارادہ تھا کہ وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ پریکٹس

ابالے بغیر نہیں اسے استعمال نہیں کروں گی۔ میں خود کو بڑی ترقی پسند سمجھتی ہوں۔ مساوات کی قائل بنی پھرتی۔  
ہوں۔ غریبوں سے ہمدردیاں جتاتی ہوں۔ شاید میں خود پرستی کی شکار ہوں۔ صرف اپنی ستائش کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے عریاں جسم پر ہمدردیوں کے جو دبیز خول چڑھا رکھے ہیں ان کے اندر میری شخصیت ہر وقت نکلتی رہتی ہے اور آج اس عریانی کو اس حقیر سے لڑکے نے بے نقاب کر دیا تھا اچانک نفرت کا ایک ابال سامیرے دل میں اٹھ آیا۔ آخر کیوں میں اس نامعلوم لڑکے کے لیے اس قدر جذباتی ہو گئی تھی۔  
ہمدردیوں کے یہ سوتے کیوں اچانک میرے دل سے بہنے لگے تھے۔ میں نے کیوں رنج کی دکھش نہیں اس کی آواز پر بچھاور کر دی تھیں۔ اس کے زندہ وجود کا قرب حاصل کرنے کے لیے میں کیوں اسے اس طرح پکڑ لاتی تھی اور اب جبکہ وہ اپنی تمام حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑا ہو رہا تھا اسے اپنا بیٹا ہوا مال صرف اس لیے لے جانا چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ انڈے بیچتے ہوئے اس نے محنت کی پیش اور عظمت کو اپنے دل میں محسوس نہیں کیا۔ اپنے مال کی بے حرمتی اسے فروخت کے بعد بھی گوارا نہیں پھر آخر کیوں میں اس کی بے بسی کا مذاق اڑانے پر مبنی ہوتی ہوں۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک محسوس اور مضبوط ضابطہ بنا رکھا ہے۔ ایسی لائسنس اور بے سر دیابا تیں سوچنے کے لیے نہ اس کے پاس فائو وقت ہے اور نہ ضرورت۔ وہ اپنی حیثیت اور اپنے ننھے سے وجود میں ہی خوش ہے۔ وہ امید و بیم کے بھروسے لاعلم ہے۔ وہ غریب کے یہاں پیدا ہوا ہے اور ساری عمر غریب ہی رہے گا۔ وہ سدا غریب ہی رہے گا تو اچھا ہے۔ مجھے اس پر احساسات کا بار گراں لادنے کا کوئی حق نہیں، کوئی ذمہ نہیں۔!!

”تم جو ملی کی رہنے والی اتنے بڑے آفیسر کی پوتی پورے فیصلے کی مالک۔ تم بھلا یہ سارے انڈے کیسے کھاؤ گی۔ رہے تمہارے مہمان تو مجھے معلوم ہے تمہارے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا ہے۔ ویسے بھی ضرورت کے تحت لی گئی چیز کو کوئی یوں ٹھوڑا ہی میز پر پھینکا کرتا ہے۔ تم میری غریبی کا مذاق اڑانا چاہتی تھیں سوا اڑا لیا، ہمیں اب خصوصی ہدایت کے تحت اس پیالی کو دھلوانا پڑے گا جس میں میں نے چائے پی ہے کیونکہ اس کے کناروں سے میری غربت اور گندگی کے جراثیم چپے ہوئے ہیں۔ یفرش جس پر میں نے بد تیزی سے چائے گرا دی ہے تم بار بار فینائل سے دھلواؤں گی لاؤ اب میرے انڈے واپس کر دو۔ تم کیا جانو میں یہ رات کو بہت دور سے لاتا ہوں اور یہ ایک ایک انڈا بیچتے ہوئے میں محنت کی پیش اور عظمت کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ جانتی ہو جب کوئی پالنے کا مارا بچہ بچہ کوئی کھانسی سے بے حال بوڑھا کوئی دکھاری نجف بڑھیا۔ کوئی مریض یا کوئی چھوٹا آدمی انڈا ذیل روٹی خریدتا ہے تو اس کے چہرے پر ایسی جگمگاہٹ ہوتی ہے کبھی تم نے بھوکے شخص کو انڈے ذیل روٹی خریدتے دیکھا ہے؟ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا ہے؟ اس چہرے پر دنیا کی تمام قیمتی اور استعارے سچ ہیں اور میں اس وقت خود کو بڑا آدمی تصور کرتا ہوں۔ جتنا تم جو ملی کی دیواروں پر چراغاں کر کے بھی محسوس نہ کرنی ہوگی۔ میں مناسب فتح لیتا ہوں نا اس لیے میرا مال جلدی بک جاتا ہے۔ پھر اب تو مجھے واقعی دیر ہونے لگی ہے مجھے اسکول بھی تو جانا ہے آخر۔“

”بی بی جی! اٹھو نا اپنا مال۔“ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں جھرجھری لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے نا معلوم کیوں مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل میں ایک چور سا چھپا بیٹھا تھا۔ جسے اس گنوار لڑکے نے پکڑ لیا ہے۔ یہ بھیک کہتا ہے کہ میرے گھر میں کوئی مہمان نہیں آئے۔ چائے کی پیالی کو

لڑکے سے شادی کے خواب دیکھنا بند کر دے وہ کسی قیمت پر بھی اس کی شادی شہزاد سے نہیں کریں گی۔

غیر نے بہت دہائی دی، بھوک ہڑتال کی، رونا پیٹنا چھایا، لیکن اب ابا کا دل نہ پیچھا، ان کا کہنا تھا کہ جب پیٹ کاٹ کاٹ کر چھ چھ مندوں کا جہیز اکٹھا کرنا پڑے گا تو عشق کا بھوت اترنے میں لحد نہیں لگائے گا اور پھر تمام عمر غربت کی چکی میں پستے ہوئے پچھتاتے ہوئے گرجائے گی۔

اور پھر غیر کو پتا بھی نہ چلا کہ کب ریاض کے گھر والے آگئے اور اس کا رشتہ پکا کر کے چلے گئے۔ اسے پتا اس روز چلا جب اس کے ہاتھ میں ریاض کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔

ریاض کویت میں ملازمت کرتے تھے، سیلری بہت شاندار تھی، کراچی میں گلشن اقبال میں بہت بڑا بنگلہ تھا سوائے ایک بڑی بہن کے اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ بہن کی بھی شادی ہو چکی تھی، گھر میں تنہا غیر عیش ہی عیش کرتی۔

منٹنی کے بعد وہ آخری بار شہزاد سے ملنے کے لیے گئی اور اسے بتا دیا کہ اب اس کے ہاتھ سے سب کچھ نکل گیا ہے اس کا نام کسی اور کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے، ہماری عزت اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں۔

اور پھر چند مہینوں کے بعد غیر کے تمام جملہ حقوق ریاض کے نام ہو گئے۔ ریاض غیر کو اپنے والدین کی خوشی سے اپنے ساتھ کویت لے گئے۔ انہوں نے ٹوٹ کر غیر سے محبت کی اسے ہر وہ خوشی دینے کی کوشش کی جو ان کے اختیار میں تھی لیکن انہیں یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ غیر ہستی تو ہے لیکن اس کی آنکھیں کیوں بھیجی بھیجی رہتی ہیں۔ اس کے بارے میں تو یہ سنا تھا کہ وہ بہت باتونی اور ہر وقت کھلکھلانے والی

لڑکی ہے لیکن ان کے گھر کے درد و یار کیوں اس کی ہنسی کو ترستے رہتے ہیں۔

وہ بہت پیار سے اس سے اس اداسی کا سبب پوچھتے تو وہ کہتی۔

”ابنا ملک اپنا گھر اور ای بایا داتے ہیں۔ بھائی کا ننھا منسا شیپو داتا ہے۔“

”تم فکر کیوں کرتی ہو ہمارے گھر میں بھی بہت جلد اللہ تعالیٰ ایسا ہی پیار سا شیپو بھیج دے گا پھر تمہیں کسی کو بھی یاد کرنے کی فرصت نہیں ملے گی۔ وہ تمہیں اتنا زیادہ مصروف رکھے گا۔“ وہ بہت پیار سے اس گدگد کو کہتے تو وہ دھیرے سے ہنس دیتی۔

گھر سے بھی ای ابا کے فون آتے بھی وہ کہ لیتی،

”بھئی ساس سرسر کے فون آتے سب اسے ڈھیروں دعا میں دیتے۔ ای اور بھائی تو ہمیشہ ڈھیر ساری نصیحتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتیں۔ اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ بھائی سے شہزاد کا پوچھے لیکن بھی زبان نے ساتھ ہی نہ دیا اور وہ بھی پوچھ بھی نہ پائی۔ بس کبھی کبھار رات کو سو تو سوتے اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی تو شہزاد کا خیال آ جاتا اور پھر نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ جاتی۔ ایسے میں اگر ریاض کی آنکھ کھل جاتی تو اس کی روحی نیند کو مٹانے کے لیے ہزار جتن کرتے، کبھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے تو بھی اپنی

بانہوں میں لے کر اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کرتے اور اس طرح ڈسٹرب ہونے پر غیر مزید جھنجھلا جاتی۔

اور پھر ایک دن جب اسے زور کا چکر آیا اور ساتھ میں جی بھی متلانے لگا تو ریاض فکر مندی سے اسے اسپتال لے کر بھاگے تب ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کا مشورہ دیا اور لیڈی ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد انہیں ایک خوش خبری سنا دی۔ ڈھیر ساری

دواؤں کے ساتھ ریاض کو غیر کا بے حد خیال رکھنے کا مشورہ بھی دیا۔

اور ریاض نے دن رات غیر کا خیال رکھا۔ وہ اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتے تھے۔ غیر کے چہرے پر بھی ریاض کو پہلی مرتبہ مسکراہٹ کی جھلکی دکھائی دی اور انہوں نے سوچا کہ غیر کی اداسی کا سبب تنہائی اور اپنوں سے دوری ہی تھی۔

ای بھائی اور اس کی ساس اس خبر کو سن کر بے حد خوش ہوئیں اور اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کی۔

اللہ اللہ کر کے وقت پورا ہوا تب اللہ نے اسے بالکل شیپو جیسے حسین اور خوب صورت سے بیٹے کی ماں بنادیا۔

اور واقعی جیسا ریاض کہتے تھے ویسا ہی ہوا، غیر کو زائد سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی پہلے اس کی نیند شہزاد کی یادوں نے چار لگی تھی۔ اب زائد رات رات بھر سونے نہیں دیتا تھا وہ تھوڑی سی بھی نیند کو ترستی رہتی تھی۔

زائد تین ماہ کا ہو گیا تو غیر اور ریاض پاکستان آ گئے۔ وہ ڈیڑھ سال کے بعد اور شادی کے بعد پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس لیے سب ہی خوش تھے ای ابا کو اسے دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ وہ خوش ہے، ماں بننے کے بعد اس پر پہلے سے زیادہ روپ چڑھ آیا تھا۔

وہ یہاں آ کر کچھ اتنی مصروف ہوئی کہ اسے شہزاد کا خیال ہی نہیں آیا ویسے بھی وہ زیادہ تر اپنے سرسرا میں رہی تھی۔

ایک مہینہ ملک جھپکتے گزر گیا، ریاض کو ایک ماہ کی ہی چھٹی مل سکی تھی اس لیے انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس کی امی جن کا پوتے اور بہو سے ابھی دل نہیں بھرا تھا۔ ریاض سے کہہ دیا کہ تم تنہا چلے جاؤ میرے بہو اور پوتا ابھی کچھ دن میرے پاس ہی رہیں گے۔ یوں ریاض کو بادل ناخواستہ تنہا ہی جانا پڑا۔

غیر سرسرا میں ہی تھی ایک دن ساس سرسرا نے لے کر پوتے کے لیے شاپنگ کرانے کے لیے بازار گئے وہاں اس نے شہزاد کو دیکھا۔ وہ بھی اپنی بہن اور

ماں کے ہمراہ کپڑوں کی خریداری کر رہے تھے غیر نے شہزاد کو دیکھا لیکن شہزاد نے غیر کو نہیں دیکھا اس لیے وہ فوراً اس جگہ سے ہٹ گئی۔

شہزاد پہلے سے کافی کمزور اور بڑھ مردہ دکھائی دے رہا تھا اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی وہ اس کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی تب ہی زائد کے زور زور سے رونے کی آواز اسے پہنچ کر حال میں واپس لے آئی۔ اس کے ساس سرسرا نے جو یوں پوتے کو روتے ہوئے دیکھا تو گھر واپس چلنے کے لیے کہا۔

ریاض کے جانے کے بعد وہ مزید دو مہینے پاکستان میں رہی اور پھر کویت واپس چلی گئی زائد کے بعد اللہ تعالیٰ نے شاید کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ تب ہی پاکستان سے ریاض کے والد کی علالت کی خبر ملی وہ اسپتال میں داخل تھے ریاض غیر کو لے کر پاکستان چلے آئے ریاض کے آنے کے ایک ہفتے کے بعد ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔

اس مرتبہ ریاض نے دو ماہ پاکستان میں قیام کیا پھر اپنی امی کی تنہائی کے سبب وہ غیر اور بچوں کو چھوڑ کر تنہا کویت چلا گیا۔

شوہر کے انتقال کے بعد ریاض کی والدہ بھی بیمار رہنے لگیں اور صرف چھ ماہ کے بعد شوہر سے جا ملیں۔ اس مرتبہ بھی ریاض پاکستان آئے اور گھر کا خاطر خواہ انتظام کرنے کے بعد غیر کو اپنے ساتھ کویت لے گئے۔

پھر غیر کی زندگی میں ایک بیٹی بھی آ گئی۔ سمیرا کی پیدائش کے بعد ریاض نے کہا کہ ان کی فیملی مکمل



ہوگئی ہے اور انہیں مزید اذیت کی ضرورت نہیں ہے۔  
غیر اب مکمل طور پر اب گرجاؤں اور ماں کے طور پر  
دن رات مصروف رہنے لگی تھی پھر بچے اسکول جانے  
کے قابل ہو گئے بچے اسکول جانے لگے تو نیر کی  
مصروفیات میں مزید اضافہ ہو گیا۔  
وقت گزرتا رہا بچوں کے اسکول کی چھٹیاں  
ہوئیں تو نیر پاکستان آئی بعض اوقات دو تین سال  
کے بعد آتا ہوتا۔

میٹرک کے بعد جب زاہد کالج میں ایڈمیشن  
لینے کا وقت آیا تو ریاض اور نیر نے مل کر فیصلہ کیا کہ  
نیر کو اب بچوں کے ہمراہ پاکستان شفٹ ہونا پڑے  
گا۔ بچوں کے مستقبل کا سوال تھا یوں نیر بچوں کے  
ہمراہ پاکستان آگئی۔

بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا نیر بھی نوجوانی کی  
منزل سے گزر کر ادھیڑ عمری میں داخل ہو گئی تھی۔ بچے  
مصروف ہو گئے تو ایک بار پھر نیر گھر میں تنہا رہنے لگی وہ  
کام کی عادی ہو گئی تھی فارغ وقت اس سے گزرتا نہیں  
تھا اس لیے اسے اپنی سہیلیاں یاد آئیں اس نے سب  
سے رابطہ کیا اور ملاقات کی۔ اس کی بیسٹ فرینڈ نامہ  
ایک کامیاب وکیل تھی اس کا اپنا آفس تھا۔ نیر نے کہا  
کہ اس کی بھی یہی خواہش تھی لیکن شادی کی وجہ سے وہ  
وکالت کی ڈگری نہ لے سکی ورنہ وہ اس وقت اپنا فارغ  
وقت بہترین طریقے سے گزار سکتی تھی۔

نامہ نے کہا اسے آفس میں ایک اسٹنٹ کی  
ضرورت ہے تم نے وکالت کی تعلیم تو حاصل کی ہے  
ایکزام دینا باقی رہ گیا تھا اگر تم مناسب سمجھو تو میرا  
آفس جوآن کرلو۔ نیر کو اور کیا چاہیے تھا اس نے  
ریاض سے فون پر بات کی اور جواب کرنے کی  
اجازت مانگی جو ریاض نے نیر کی خوشی کو مد نظر رکھتے  
ہوئے دے دی۔

نامہ فیملی کورٹ میں تھی ایک دن ایک شخص اپنی  
بہن کا مقدمہ لے کر آیا اس کی بہن کے سرال والوں  
سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور انہوں نے اسے مار پیٹ  
کر گھر سے نکالنے کے بعد اس پر الزام لگایا تھا کہ  
اس کی بہن خود گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور جاتے جاتے  
سارے گھر کا زیور اپنے ساتھ لے گئی ہے دونوں فیملیز  
نے ایک دوسرے پر مقدمے قائم کروئے تھے۔

اس روز وہ شخص جب نامہ کے دفتر میں آیا تو نامہ  
نے اپنی مصروفیات کے سبب نیر سے کہا کہ وہ جا کر  
اس شخص سے مل لے اور ساری باتوں کی مکمل  
معلومات لے کر فائل تیار کر لے۔ نیر جب  
ملاقاتیوں کے روم میں اس شخص سے ملی تو اسے حیرت  
کا شدید جھٹکا لگا وہ کوئی اور نہیں شہزاد تھا۔

وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھا دکھائی دے رہا  
تھا اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے دونوں نے ایک  
دوسرے کو پہچان لیا اور اپنی اپنی داستان سنائی۔ شہزاد  
نے نیر کو بتایا کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے  
یہ سن کر نیر کو ایک اور جھٹکا لگا۔  
”آخر کیوں شہزاد؟“ نیر نے حیرت سے  
پوچھا۔

”بس! ذمہ داریوں نے اجازت ہی نہیں دی“  
ایک کے بعد ایک بہن کا نمبر آتا گیا اور میں انہیں  
بیٹا ہوتا گیا۔ بہنوں کے جہیز کی فکر اور تیاری پھرائی کی  
بیٹاری گھر کے اخراجات ان سب باتوں نے مجھ  
سے میری جوانی اور جوانی کی ہر خوشی چھین لی پھرائی کا  
انتقال ہو گیا۔ یہ سب سے چھوٹی اور آخری بہن ہے  
جس کے ساتھ یہ معاملات پیش آئے ہیں۔“

”تمہارا بچہ ہو؟ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“ نیر  
نے ایک تیز سسکی لے کر اپنی آنکھوں میں آنے  
والے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کرتے

ہوئے پوچھا۔  
”ہاں تمہارا بتا ہوں۔“ شہزاد نے ایک گہری اور  
شعبدی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بعد  
میرے دل سے ہر امنگ ہر خوشی جیسے مر گئی تھی۔ میں  
نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند  
کر لیے تھے کہ اس دل کا کلین بے شک مجھے چھوڑ گیا  
ہے لیکن آج بھی میرے دل کی خالی دیواروں سے  
اسی کے وجود کی خوشبو آتی ہے اس میں اب کوئی اور  
بیسرا نہیں کر سکتا۔“

”تم نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا ہے شہزاد! تمہیں  
شادی کر لینی چاہیے تھی میں نے بھی تو کر لی تھی پھر  
میں اپنے بچوں اور گھر میں مصروف ہو گئی۔ تم بھی  
بمصروف ہو جاتے یوں تنہا تو نہ رہنا پڑتا۔“ نیر نے  
باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔

”ظلم کی ابتداء تو میرے ساتھ تم نے کی تھی میں  
نے انتہا کر دی۔ کیا فرق پڑتا ہے مجھے اپنی تنہائی سے  
پیارے اور پھر کس نے کہا میں تنہا ہوں تمہاری یادیں  
تو ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔“ ریاض نے ایک  
پھٹکی اور بے جان مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور نیر کے  
چہرے کو آنکھوں میں برسوں کی پیاس لگی اور آج وہ  
جی بھر کے اس کی دید کی پیاس بجھانا چاہ رہا تھا۔

”کیا واقعی تمہارے دل میں آج بھی میری  
محبت قائم ہے؟“ نیر نے کپکپاتے ہوئے لبوں سے  
سوال کیا۔

”تمہیں کوئی شک ہے؟ یقین نہ آنے کی  
وجہ؟“ شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”نہیں! میں تو بس ایسے ہی.....“ نیر نے کہا پھر  
جلدی سے خود کو سنبھال کر بولی۔ ”تم کہو تو تمہارے  
لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھوں۔“

”لیکن وہ نیر نہیں ہوگی۔ اس لیے..... نہیں!“

شہزاد نے کہا تو نیر خاموش ہو گئی پھر کتنی ہی دیر دونوں  
چپ چاپ خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو  
دیکھتے رہے پھر اس خاموشی کو شہزاد نے توڑا اور اس  
نے نیر سے اس کے بارے میں پوچھا تو نیر نے اسے  
اپنی ساری کہانی سنائی۔

”تو گویا تم مستقل طور پر پاکستان آ گئی ہو؟“  
شہزاد نے کہا۔

”ہاں! اب تو کافی سال ہو گئے اتفاق سے کہ تم  
سے ملاقات ہی نہ ہو سکتی مجھے کی مرتبہ تمہارا خیال بھی  
آیا پھر یہ سوچ کر تمہاری کہونج نہیں کی کہ تم نے بھی  
شادی کر لی ہوگی اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ  
مگن ہو گئے۔“

یہ سن کر شہزاد کے لب تلخی سے مسکرانے لگے پھر وہ  
استہزائیہ انداز میں کس بولا۔

”بہنہ بیوی بچے..... اب عمر ہوئی تمام ہم تو  
چراغ سحری ہو گئے ہیں کسی بھی وقت مجھ جا میں  
گئے۔“

نیر نے بے ساختہ اپنا ہاتھ شہزاد کے لبوں پر رکھ دیا  
اور انتہائی میز لہجے میں بولی۔

”اللہ کے واسطے ایسی باتیں مت کر ڈتم زندہ رہو  
گے! اپنی بہنوں کے لیے میرے لیے۔“ شہزاد نے نیر  
کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی آنکھوں  
میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح  
کبھی کبھار مل لیا کریں؟“

”ہاں ہاں بالکل.....“ نیر نے کہا اور اس وقت  
نامہ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے جو نیر کا ہاتھ اپنے  
کلائٹ کے ہاتھوں میں دیکھا تو ٹھنک گئی۔ پھر  
دونوں گڑبڑا کر سنبھل گئے۔

”بات مکمل ہو گئی؟“ نامہ نے پوچھا۔



”ہاں! نہیں..... ابھی نہیں۔“ نیر نے تیزی سے کہا۔

”نیر! آپ میرے روم میں آئیں پلیز.....“

نامہ نے کہا اور تیزی سے پلٹ گئی۔

پھر نامہ کے استفسار پر نیر نے اسے سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ شہزادی بہن کے کیس پر خصوصی توجہ دے گا اسے یہ کیس ہر حال میں جیتنا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا نامہ نے اس کیس پر بھرپور توجہ دی۔ اس نے شہزادی بہن کے دیور پر بے حد گھٹیا الزام لگائے کہ اس کی میت بھائی پر شروع سے خراب تھی اور اس نے کئی مرتبہ اسے تنہا پا کر اس پر دست درازی بھی کی۔ دوسری بات یہ کہ وہ لوگ بہت ہی بُرے قماش کے لوگ ہیں ان کے گھر بہت ہی غلط قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ اس کی ساس اور نندیں خوب بن سنور کے ان کے سامنے آتی ہیں اور اسے بھی مجبور کرتی ہیں انہوں نے اس پر بھائی کے گھر جانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ ایک دن موقع دیکھ کر وہ چپکے سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی وہ جن حالات میں وہاں سے نکلتی تھی ایسی حالت میں زیور وغیرہ کس طرح اپنے ساتھ لاسکتی تھی۔

اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر نامہ نے چند آدمیوں کو بھی عدالت میں پیش کر دیا جنہوں نے گواہی دی کہ وہ شہزادی بہن کلثوم کے سسرال آتے جاتے رہے ہیں۔ کلثوم کے سسرال والے اتنی شدید بے عزتی برداشت نہ کر سکتے اور کلثوم کو طلاق دے دی۔ ساتھ ہی مہر کی رقم اور جہیز کا سارا سامان بھی کورٹ کے ذریعے آ گیا۔

نیر نے اس کیس کی ساری باریکیوں کو دیکھا اور حیران رہ گئی اس نے نامہ سے کہا۔

”میں تو حیران ہوں! تم نے کتنی عقل مندی اور

ذہانت کے ساتھ کیس جیتا ہے غالباً کہ میں ساری حقیقتوں سے واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ کلثوم بھی بے قصہ ہو نہیں سکتی وہ گھر کے کام کاج سے جی چرائی تھی اور اسی وجہ سے ساس نندوں سے جھگڑا شروع ہوا اور طول پکڑنا چلا گیا لیکن تم نے تو اس سارے معاملے کو کوئی اور ہی رنگ دے دیا۔“

”بھئی! اگر ایک کامیاب وکیل بننا ہے اور کیس جیتنا ہے تو جتنے جھوٹ بول سکتے ہو بول دو جتنے گھٹیا سے گھٹیا الزامات دوسرے فریق پر لگا سکتے ہو لگا دو اور شہادتیں بھی آج کل بکتی ہیں ہر طرح کی گواہی دینے والے گواہ بھی مل جاتے ہیں۔ عدالت میں اندھا قانون چلتا ہے شہادتیں اور گواہوں کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں اور گواہ جنوٹے ہیں یا سچے عدالت اس کی تلاش میں نہیں پھرتی وہ تو گواہی پر آتے تھیں بند کر کے یقین کرتی ہے اور فیصلہ کر دیتی ہے۔“ نامہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور نیر نے ایک بار پھر تحسین آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس دن کے بعد سے شہزادہ قافو قافیر سے ملنے لگا۔ دونوں ابھی کبھار باہر ایک ساتھ لُچ کرنے کے لیے بھی چلے جاتے۔

نیر کے بڑے بیٹے نے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لی تو اسے ایک سی بی گورنمنٹ ادارے میں جاب بھی مل گئی۔ ان ہی دنوں ریاض کا پاکستان آنا ہوا اس کا کہنا تھا کہ ہم زہد کی شادی کر دیتے ہیں اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی سمیرا کے رشتے کی بات بھی نیر سے کی۔

نیر نے اس بات پر رضا مندی ظاہر کر دی اور ریاض سے کہا کہ وہ اپنے دوست کی فیملی کو کھانے پر مدعو کرے۔

تعارف کر دیا کہ وہ ریاض کے دوست کی بیگم ہیں۔ نیر نے انہیں دیکھا تو وہ بڑی طرح چوک پڑی کیوں کہ وہ خاتون کوئی اور نہیں شہزادی بہن تھیں اور انہوں نے حیرانی سے کہا۔

”اچھا تو نیر تمہاری شادی ریاض بھائی سے ہوئی تھی بہت اچھا کیا کہ تم نے ان سے شادی کا فیصلہ کیا کیونکہ شہزاد بھائی کے پاس تو آج تک کچھ بھی جمع نہیں ہوا۔ تم آج ایک اچھی اور پرسکون زندگی تو گزار رہی ہو۔ اگر صرف اپنی پسند اور محبت کا منہ دیکھتی تو نہ جانے کن حالات میں زندہ ہوتیں۔“

ریاض نے خاموشی سے یہ ساری باتیں سنیں لیکن اس وقت کوئی بھی بات نہیں کی بعد میں وہ تنہا ہی اپنے دوست کے گھر گئے اور باتوں باتوں میں نیر اور شہزاد کے بارے میں ان سے پوچھا انہوں نے بھی بتا دیا کہ شادی سے پہلے میرے بھائی شہزاد اور نیر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے لیکن نیر نے یہ شادی نہیں کی انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ نیر اور شہزاد اب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

بیٹی سمیرا کا رشتہ تو انہوں نے پکا کر دیا نیر تیزی سے بہو تلاش کر رہی تھی تاکہ دونوں شادیاں ایک ساتھ کر سکے۔ اس روز جب نیر نامہ کے کُف میں بیٹھی تھی تب اس نے کہا کہ آج اسے جلدی گھر جانا ہے۔

”کیوں خیریت ہے سب؟“ نامہ نے پوچھا۔

”ہاں سب خیریت ہے دراصل ریاض یہ چاہتے ہیں کہ ہم زہد اور سمیرا کی شادی ایک ساتھ کر دیں سمیرا کا رشتہ طے ہو گیا ہے میں زہد کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہی ہوں۔“

”ارے تمہیں لڑکی چاہیے تھی مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ نامہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بتایا تو ہے۔ بے کوئی لکھی اور بیاری لڑکی تمہاری نگاہ میں تم نے زہد کو تو دیکھا ہی ہوا ہے کتنا خوب صورت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسی ہی لڑکی ملے تاکہ دونوں کی جوڑی خوب سجے۔“ نیر نے کہا۔

”تو پھر اس کے لیے نہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے شام کو میری طرف چلی آؤ۔“ نامہ نے کہا تو نیر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہاری بھی بیٹی جو ان ہے میں جانتی ہوں کہ اچھا ہے دو پرانی فریڈ زاب سمجھ بن جائیں گی۔“

اور پھر ای رات نیر نامہ کے گھر پہنچ گئی لیکن نامہ کی بیٹی کو دیکھ کر اسے خاصی مایوسی ہوئی کیوں کہ صائمہ بہت معمولی نقوش کی گہرے سانولے رنگت کی حامل تھی۔

نیر کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات نامہ سے چھپے نہ رہ سکے اور وہ بناء کوئی جواب دیے گھر لوٹ آئی کیوں صاف منع کرنا اسے مناسب نہیں لگا وہ سوچنے لگی کہ نامہ خود سمجھ جائے گی کہ مجھے اس کی بیٹی پسند نہیں آئی ہے۔

وہ گھر آئی تو رات کو ریاض نے اس بارے میں پوچھا جواب میں نیر نے کہا دیا کہ اس کا اور میرے بیٹے کا کوئی جوڑ نہیں ہے اس لیے خاموشی سے لوٹ آئی۔

”تم شاید اس کی سانولی رنگت کی وجہ سے کہہ رہی ہو میرے خیال میں رنگ وغیرہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ضروری تو یہ ہے کہ لڑکی کا دل کورا کا غد ہونا چاہیے کہ اس پر صرف شوہر کا نام ہی لکھا جائے وہ لڑکیاں ناقابل اعتبار ہوتی ہیں جو محبت تو کر لیتی ہیں لیکن صرف غربت کی وجہ سے اپنے محبوب کو چھوڑ کر کسی امیر آدمی سے شادی کر لیتی ہیں.....“ ریاض

نے تیر کے چہرے پر اپنی تیز نگاہیں گاڑ کر طعنے لہجے میں کہا: تیر کو ریاض کی نگاہیں برجیوں کی مانند اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئیں اور بہ مشکل بول پائی۔

”کک..... کیا..... مطلب؟“

”زیادہ معصوم بننے کی کوشش مت کرو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ ریاض نے تیز لہجے میں کہا۔

”نہیں! قسم ہے میں بالکل نہیں سمجھی آپ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے۔“ تیر نے کہا۔

”تم صاف صاف سنا چاہتی ہو تو سنو تم نے آج تک محبت کے نام پر مجھے دھوکا دیا ہے۔ شادی سے پہلے تم راحیلہ بھائی کے بھائی شہزاد سے محبت کرتی تھیں لیکن تم نے اس سے شادی صرف اس کی غربت کی وجہ سے نہیں کی اور میرا ساتھ تم نے محبت نہیں کی ایک پریشانی زندگی گزارنے کے لیے قبول کیا تھا۔ دل ہی دل میں تم اسے چاہتی تھیں لیکن تم نے محبت کے نام پر قربانی نہیں دی تم کتنی خود غرض ہو تیر! صرف اپنے بارے میں سوچتی رہیں! مجھے آج بھی شادی کے وہ شروع کے دن یاد ہیں جب تم شہزاد کی یادوں میں ڈوبی! اس دن بھی میں اور میں آحق بننا یہ سمجھتا رہا کہ واقعی تمہیں اپنے گھر والے یاد آتے ہیں۔“ ریاض کے لہجے میں شدید غم و غصہ تھا۔

”یہ آپ کی باتیں کر رہے ہیں ریاض! خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ شاید راحیلہ بھائی کی اس دن کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شہزاد اور اس کے گھر والے مجھے اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتے تھے ان کے ہاں سے رشتہ بھی آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ابا نے ان کی غربت اور شہزاد کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کو بہت بُری لگی تھی اور اب شاید

راحیلہ بھائی نے مجھ سے اس بات کا اشتقاق لیا ہے اور اب اس بات کے بعد میں اپنی سیرا کا رشتہ ان کے بنے کو نہیں دوں گی آپ انکار کر دیں۔“ تیر نے بُری طرح روتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو سیرا کی متنی ہو چکی ہے ہم اب انکار کیسے کر سکتے ہیں تم پسند کرو یا نہ کرو میں تو یہ رشتہ ہرگز نہیں توڑ دوں گا۔“ ریاض نے غصے سے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔

تیر غصے سے بیچ و تاب کھاتی رہی اسے راحیلہ پر بے حد غصہ آ رہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے شہزاد کو فون کر کے ساری بات بتادی شہزاد نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ راحیلہ سے بات کرے گا اور وہ ریاض کی غلط فہمی دور کر دے گی تم فکر نہ کرو۔

دوسرے دن تیر جب نامہ کے آفس پہنچی تو نامہ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا کہ اس نے اپنے بیٹے زاہد اور صائمہ کے رشتے کے بارے میں کیا سوچا۔ تیر کی پریشانی کو البتہ بھانپ لیا اور اس کا سبب پوچھا تب نامہ کے لبوں پر ایک گہری معنی خیز مسکراہٹ ابھرائی اور وہ بولی۔

”ہاں یہ مناسب رہے گا کہ اگر راحیلہ خود ہی اس بات کو ریاض کے دل سے منادے ورنہ تم سوچو اگر میں بھی ریاض بھائی کو یہ بتا دوں کہ تم آج بھی اپنی پرانی محبت کو نہیں بھولی ہو اور آج بھی ریاض بھائی کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس سے ملتی ہو، صرف ملتی ہو بلکہ تم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھام کر پھر سے تجدید عہد وفا کر رہے ہو تو کیا ہوگا۔ وہ اس عمر میں تمہیں طلاق دے دیں گے زمانے میں تمہاری کتنی رسوائی ہوگی اور خاص طور پر تمہاری اولاد کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کو بہت بُری لگی تھی اور اب شاید

ماں باپ کو کس لیے طلاق دی ہے۔“

”یہ..... تم..... کک..... کیا کہہ رہی ہو.....“

نامہ..... تم..... تو..... میری بیسٹ فرینڈ..... ہو..... نامہ کی باتیں سن کر تیر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اس نے ہلکا تے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ ہم بیسٹ فرینڈ ہیں میں جب تک تمہاری بیسٹ فرینڈ رہوں گی جب تم میرے ساتھ دوستی نبھادو گی تم کیسی دوست ہو کہ میری بیٹی کو دیکھ کر منہ بنا کر چلی آئیں۔ میں تمہیں اپنی دوست سمجھتی تھی اسی لیے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمارے بچوں کے رشتے ہو جائیں اور ہماری یہ دوستی رشتہ داری میں تبدیل ہو جائے۔“ نامہ نے کہا اور تیر کو نامہ اس وقت کورٹ میں کھڑی وہ وکیل لگی جو مقدمہ جیتنے کے لیے ہر طرح کے دلائل لاسکتی تھی۔

”نہیں نہیں نامہ! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں نے اس رشتے سے کب انکار کیا ہے وہ تو میں ریاض سے مشورہ کرنا چاہتی تھی بات ہی ایسی ہو گئی کہ میں بات تم سے کرنا بھول گئی۔“ تیر نے اپنی عرق آلود پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر کب آرہی ہو صائمہ کا منہ میٹھا کرنے۔“ نامہ نے ایک دم چلا بدل کر کہا۔

”ان شاء اللہ ایک دو دن میں۔“ تیر نے جواب دیا۔

”گلد۔“ نامہ نے چپک کر کہا پھر بولی۔ ”صائمہ کی شادی ہو جائے پھر میں تمہاری اور شہزاد کی ویڈیو ڈیلیٹ کر دوں گی۔“

”کون سی ویڈیو؟“ تیر نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

”ارے وہ اس دن والی..... جب پہلی مرتبہ شہزاد اپنی بہن کے مقدمے کے لیے میرے پاس آیا تھا اور

میں نے تمہیں اس سے بات کرتے کے لیے دوسرے کمرے میں بھیجا تھا تمہیں یاد ہے اتنے عرصے کے بعد جب تم دونوں ملے تھے تو خاصے جذباتی ہو گئے تھے بس میں نے اتفاق سے وہ مناظر اپنے موبائل میں قید کر لیے تھے دیکھا جا ہوگی ویسے وہ میں نے الگ سے سیو کر لیے ہیں لیکن میرے موبائل میں وہ ویڈیو اب بھی موجود ہے۔“ نامہ نے ایک فائل پر نگاہ جماتے ہوئے بظاہر بے پروا لہجے میں کہا۔

”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ تیر نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

”شاید اسی دن کے لیے..... بھی کیا کروں مجھے زاہد بیٹا بہت پسند ہے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ تم میری صائمہ کو قطعی پسند نہیں کرو گی تم بھول رہی ہو کہ میں ایک وکیل ہوں۔ دوسروں کے لیے مقدمے لڑتی ہوں اور جیت بھی جاتی ہوں پھر اپنے مقدمے کو کمزور کیسے رسنے دیتی۔“ نامہ نے تیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو تیر نے نگاہیں جھکا لیں۔

اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا راحیلہ نے ریاض سے معذرت کرنے کے بعد اس کی غلط فہمی دور کر دی اور تیر نے ریاض کے ساتھ آ کر صائمہ اور زاہد کا رشتہ پکا کر دیا اور پھر جلد ہی شادی کی تاریخ طے کر دی۔

تیر اور نامہ سب باتیں بھلا کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں جیسا نامہ نے چاہا تیر نے ویسا ہی کیا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے نامہ سے اختلاف کیا تو اس کو ذلت کے گہرے گڑھے میں گرانے میں لمحہ بھی نہیں لگائے گی۔ وہ اس دن کو کوئی بھی جب اس نے نامہ سے ساتھ ملازمت کی حاضری بھری تھی نہ وہ وہاں ہوتی اور نہ شہزاد سے ملاقات ہوتی۔



شادی میں شہزاد نے بھی شرکت کی وہ کیوں نہ تھا آخر وہ لہا کا کلونا ماموں جو تھا لیکن میرا اس سے دور دور رہی۔ وہ اللہ کا لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ ریاض کے دل سے غلط فہمی دور ہو گئی تھی اور انہوں نے میرے بھی اپنی باتوں کی معذرت کرنی تھی لیکن میرے نے ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ نہ تو شہزاد سے ملے گی اور نہ ہی نانہہ کے ہاں اپنی ملازمت جاری رکھے گی۔

شادی کے بعد ریاض کو بیت واپس چلے گئے ایک سال کے بعد شاہد کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تو ریاض نے شاہد کو اپنے پاس کویت بلا لیا اور وہاں ملازمت دلوا دی۔

گھر کے سارے معاملات صائمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اس نے یہ کہہ کر غیر کو کوٹنے سے لگا دیا کہ اب آپ بوڑھی ہو چکی ہیں صرف آرام کریں میں ہوں ناں گھر کے سیاہ و سفید کی اب صائمہ ہی مالک تھی۔ سارے خاندان والوں میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ میری بہو بہت اچھی ہے وہ دن رات میری خدمت کرتی رہتی ہے ریاض سے فون پر بات کرتی تو کہتی۔

”پاپا! آپ ای کی فکر نہ کیا کریں میں انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ وہ تو صرف آرام کرتی ہیں۔“ اور جب ریاض میرے یہ کہتے کہ دیکھ لو تم سے صرف اس کے سانولے رنگ کی وجہ سے رنجش کر رہی تھیں وہی تمہاری بہن نہیں بلکہ بیٹی بن کر خدمت کر رہی ہے۔ صائمہ نے گھر کے کاموں کے لیے ملازم رکھ لیے تھے۔ ریاض جو رقم بھیجتے تھے وہ بھی صائمہ اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور غیر کچھ بھی نہ کرتی۔

دن اسی طرح گزرتے رہے سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا اس دوران صائمہ بھی ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ بچہ بے حد خوب صورت اور ہو ہوا زہد کی

کالی تھا۔

ایک دن ریاض نے کہا کہ تم شاہد کے لیے لڑکی تلاش کرو اس مرتبہ جب ہم چچیوں پر آئیں گے تو شاہد کی شادی کر دیں گے۔

دن رات اندر ہی اندر گھٹتے ہوئے میرے دل کی مریض ہو گئی۔ اسے بار بار انجانا کا ایک ہوتا تھا اس نے اپنے ملنے والوں سے شاہد کے لیے لڑکی کا کہا۔ میری ایک محلے دار دوست کی ایک بھانجی بھی لڑکی کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا ایک بھائی اور والد تھے اور مالی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی لیکن لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ صائمہ نے جب اس رشتے کے بارے میں سنا تو چھٹ اس رشتے کی حامی بھر لی۔

اس مرتبہ بھی میرے بلاچوں و چروا صائمہ کا کہا مان لیا اور رشتے کی بات ڈال دی تھوڑی بہت چھان بین کے بعد وہاں سے ہاں میں جواب آ گیا۔

ریاض اور شاہد پاکستان آئے تو یہ شادی انجام پذیر ہوئی۔ نانا اپنی بیوی کو پا کہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس نے ایک سعادت مند بیٹے کی مانند ماں کی پسند پر ہائی تو بھری تھی لیکن وہ دل ہی دل میں ضرور راتا تھا کہ کہیں اسی نے ایسی لڑکی نہ پسند کر لی ہو جیسی اس کی بھانجی ہیں لیکن نیلو فر بہت خوب صورت تھی۔

خاندان بھر میں یہ باتیں ہونے لگیں کہ میری دوسری بہو تو لاکھوں میں ایک ہے میرے بچے اپنی جیسی بہو بیاہ کر لائی ہے۔ نیلو فر کی اتنی تعریفیں سن سن کر صائمہ جلن و حسد کا شکار ہو گئی اور ایک دن روتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

”امی میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتی کہ سب لوگ نیلو فر کے حسن اور اس کے اخلاق کے اتنے قہیدے پڑھیں مجھے یہ سب بہت برا لگتا ہے۔“

”تو طلاق دلا دو۔“ نانہہ نے اس طرح کہا

جیسے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

”کیا.....؟“ وہ میری طرح چونک پڑی پھر خواب جیسی کیفیت میں بولی ”کیسے؟“

”وہ میں تمہیں بتاؤں گی۔“ نانہہ نے پراسرار انداز میں صائمہ کی جانب جھکتے ہوئے کہا پھر وہ بہت دھیمے لہجے میں صائمہ سے دیر تک باتیں کرتی رہی۔

شاہد شادی کے بعد صرف ایک ماہ ساتھ رہا چند دنوں کے لیے وہ بنی مومن پر بھی پاکستان ٹور پر گئے جب وہ دونوں گھر لوٹے تو بہت خوش تھے دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کو خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔ صائمہ بڑی چالاکی کے ساتھ نیلو فر اور شاہد کے آگے بچھی بچھی جاتی۔ نیلو فر کو روزانہ اپنے ہاتھوں سے سجاتی، سنواری، پار باراس کی نظر اتارتی اور کہتی۔

”یہ تو میری چھوٹی بہن ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی بہن بھائی تو دیا نہیں اس لیے نیلو فر میری چھوٹی بہن کی طرح ہے تم بالکل بھی فکر نہ کرنا شاہد! تمہارے جانے کے بعد بھی میں اس کا اسی طرح سے خیال رکھوں گی اور اس کو کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔“

صائمہ ہر آنے جانے والے کے سامنے بھی نیلو فر کے ساتھ یہی رویہ اپنائے رکھتی۔ اب لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ کیا ہوا جو صائمہ شکل و صورت میں نیلو فر سے کم ہے لیکن وہ اس گھر کی بڑی بہو ہے اور اس نے یہ کر کے دکھایا ہے۔

میرا خاموش نگاہوں سے صائمہ کو یہ سب کرتے دئے دیکھتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ اب صائمہ دلی ہی چال چلنے والی ہے لیکن وہ اپنے اس خدشے کا ظہار کسی کے بھی سامنے نہیں کر سکتی۔ ریاض شادی کے فوراً بعد کویت چلے گئے لیکن شاہد نے مزید ایک دو روز اور اس دوران وہ اور نیلو فر ایک دوسرے کی

محبت میں پور پور ڈوب چکے تھے۔ آخر شاہد کی واپسی کا دن بھی قریب آ گیا شاہد نے جاتے ہوئے روتی ہوئی نیلو فر سے یہ وعدہ کیا وہ بہت جلد نیلو فر کو اپنے پاس کویت بلا لے گا کیوں وہ خود بھی اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔

میر کی طبیعت ان دنوں زیادہ خراب رہنے لگی تھی دن رات ایک نامعلوم خوف اور خدشے نے اسے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ بھی بنا دیا تھا۔ وہ نیلو فر کی جانب سے بہت مطمئن تھی وہ ایک نیک اور صاف ستھری طبیعت کی مالک تھی۔ شاہد کا فون روزانہ آتا تھا وہ اور نیلو فر دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں صائمہ نے نیلو فر سے شکایت کی کہ شاہد کی جب تک شادی نہیں ہوئی تھی وہ ماں اور بھائی کو خوب فون کیا کرتا تھا لیکن جب سے شادی ہوئی ہے تو اسے سوائے بیوی کے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا کب سے اس نے ہم دونوں سے بات نہیں کی ہے۔

”نہیں! ایسا تو نہیں ہے مجھے تو وہ کبھی کبھار فون کر ہی لیتا ہے۔“ میر نے فوراً بیٹی کی حمایت کی۔

”ای!“ صائمہ نے تیز لگا ہوں سے اسے گھورا پھر لگاوت بھرے لہجے میں بولی۔ ”اس کو کوئی بات کرنا کہتے ہیں یوں ہی مبینے میں ایک آدھ بار ماں کو سلام کر لیا۔“ میر گڑبڑا کر خاموش ہو گئی پھر شاہد نیلو فر نے شاہد سے صائمہ کی بات کا ذکر کیا تو اس نے الگ الگ صائمہ اور میر سے بھی بات کی۔

اور پھر اس کے بعد ایسا ہوتا کہ نیلو فر ان کے درمیان بیٹھی ہوتی اور کوئی فون کال آتی تو وہ یہ کہتی ہوتی ان کے درمیان سے اٹھ جاتی کہ اس کی دوست کا فون ہے کبھی کہتی بھائی کا فون ہے۔ ایک دن صائمہ نے میر سے کہا۔



”ای میں ایک بات نوٹ کر رہی ہوں کہ آج کل شاہد کے فون آنے بند ہو گئے ہیں اور نیلوفر کی کسی دوست کے فون روزانہ آرہے ہیں، کبھی کہتی ہیں بھائی کی کال ہے اور فون آتے ہی وہ چھٹ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلی جاتی ہے اور خوب غصہ غصہ ہنس کر کہتی ہیں۔“

”ارے تو کیا ہوا ہے کرنے دو بات۔ شاہد بھی تو یہاں نہیں ہے اچھا ہے اپنی دوستوں سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا دیتی ہے۔“ تیر نے کہا۔

”واہ ای واہ! یہ دل بہلانے والی بات بھی آپ نے خوب کہی واقعی وہ اپنا دل ہی بہلا رہی ہے۔ پہلے تو مجھے اس بات کا کچھ کچھ شک تھا لیکن ایک دن جب چھپ کر میں نے اس کی باتیں سنیں تو اللہ میری توبہ! استغفر اللہ..... وہ کس قسم کی باتیں کر رہی تھی۔“

صائمہ نے توبہ توبہ کرتے ہوئے اپنے گالوں کو پیٹا اور کالوں کو ہاتھ لگائے۔

”وہ کس قسم کی باتیں کر رہی تھی؟“ تیر نے حیرانی سے پوچھا۔

”بالکل ایسی جیسے ایک محبوبہ اپنے محبوب سے باتیں کرتی ہے اور وہ ان راتوں اور لمحات کی یادیں شراشرما کرتا زہر کرتی ہے جیسے یہ راتیں اس نے اپنے جانے والے کے ساتھ گزاری ہوں۔“ صائمہ نے آنکھیں پھیلایا کر کہا۔

”تم کیسی باتیں کر رہی ہو صائمہ! ہو سکتا ہے کہ جو باتیں تم نے سنیں وہ باتیں وہ شاہد سے کر رہی ہو۔“ تیر نے کہا۔

”شاہد! اب کہاں اسے فون کرتا ہے اس دن جب میں نے نیلوفر کی باتیں سنی تھیں تب پہلا خیال مجھے یہی آیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ شاہد سے بات کر رہی ہو اور اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے میں نے

ذرا دیر بعد انہوں نے خاموشی سے نیلوفر کو موہاں ہاتھ میں لے کر چھت پر جاتے ہوئے دیکھا تب صائمہ نے تیر سے کہا۔

”ای آ میں اب آپ خود چل کر نیلوفر کی باتیں سن لیں۔“

اس نے تیر کا ہاتھ پکڑا اور چپلیں سیڑھیوں کے قریب اتار کر دوڑوں دے پاؤں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ گئیں۔ نیلوفر چھت پر کچھ چار پانی پر بیٹھی تھی اور فون کان سے لگا ہوا تھا۔ زینے کی جانب اس کی پیچھے تھی دو فون خاموشی اور توجہ سے اس کی ایک جانب سے کی جانے والی باتیں سننے لگیں۔ انہوں نے سنا وہ دھیرے سے ہنسی اور شرارتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بڑے بے شرم ہیں آپ! فون پر بھی ایسی باتوں سے نہیں چوکتے صبر کریں ملاقات تو ہونے دیں پھر اپنے ارمان جی بھر کر پورے کر لیجیے گا۔ پھر شوخ لہجے میں بولی۔

”صبر کریں صبر..... ان شاء اللہ جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی آپ کو نہیں پتا میں کتنی بے چین اور بے قرار ہوں۔ میرا ایک لمحے کے لیے بھی دل نہیں لگتا رات کی تنہائی کا سٹے کو دوڑتی ہے بس آپ کا پیار اور والہانہ پن یاد آتا ہے..... اوں ہوں..... نہیں ناں بھئی..... فون پر باز نہیں آئیں گے آپ..... اچھا یہ لیں..... پھر اس کے چوسنے کی آواز آئی۔

صائمہ نے تیر کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے اسے نیچے اتار کر لے آئی اور کمرے میں آکر کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”اب تو یقین آ گیا آپ کو اپنے کانوں سے سن کر آپ نے ساری باتیں۔“

”ہو سکتا ہے وہ شاہد سے بات کر رہی ہو۔“ تیر نے سر دھک لہجے میں کہا۔

”اگر شاہد سے بات کر رہی ہوتی تو اسے چھت پر

جانے کی کیا ضرورت تھی۔“ صائمہ نے تیزی سے کہا۔

تو تیر اس کی قائل ہو گئی۔

پھر صائمہ نے شاہد کو فون کر کے صاف صاف کہہ دیا کہ نیلوفر تمہاری غیر موجودگی میں کیا حرکتیں کر رہی ہے۔ اس نے کئی لمحوں سے فون پر دوستی کر رکھی ہے اور وہ چھت پر جا کر ان سے رات رات بھر باتیں کرتی ہے۔ اس کی وہ فحش باتیں میں نے اور ای نے بھی خود اپنے کانوں سے سنی ہیں۔

شاہد نے تیر کو فون کیا اور اس الزام کی تصدیق چاہی تو صائمہ نے تیر کے کان میں سرگوشی۔ ”ای! وہ ای کے پاس جو دیکھو یوہ کہیں وہ سب کو نہ دکھائی پڑ جائے۔“

یہ جملہ سن کر تیر کے ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے اور اس نے کہا۔ ”ہاں صائمہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے میں نے بھی وہ ساری باتیں سنی تھیں۔ نیلوفر کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔“

پھر شاہد اور نیلوفر کے درمیان فون پر کافنی جھگڑا ہوا نیلوفر روتے ہوئے صرف ایک ہی بات مسلسل کہے جا رہی تھی کہ ”میں نے کبھی کسی غیر لڑکے سے بات نہیں کی یہ مجھ پر الزام ہے۔“

شاہد نے کہ ”اگر صرف صائمہ بھائی کہتیں تو میں یقین نہ کرتا لیکن ای نے بھی یہی بات کہی ہے اب تم کیا کہو گی۔“ اس پر نیلوفر بالکل خاموش ہو گئی اور شاہد نے غصے میں فون بند کر دیا۔

اس رات تیر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسے چند روز کے لیے ایڈمٹ کر لیا۔ اسپتال میں رات کو تیر کے پاس کسی کو رونا ہی تھا زائد تو ان تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ نیلوفر سے بولا کہ تم ای کے ساتھ اسپتال میں رک جاؤ صائمہ کے ساتھ تو چھوٹا بچہ ہے نیلوفر

خاموشی سے تیر کے ساتھ رک گئی۔ تیر کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہونے تھے نیلوفر ساری رات جاگتی رہی اگلے دن صبح ہی صبح صائمہ اسپتال پہنچ گئی تو نیلوفر گھر آ گئی۔ دوسری رات کو تیر نے نیلوفر سے کہا کہ وہ کسی دوسرے خالی بیڈ پر جا کر آرام کرے اس کی طبیعت اب بہتر ہے کل ہم گھر چلیں گے۔ تم ساری رات ایک کرسی پر بیٹھ کر کیسے گزار دو گی۔ تیر کے مجبور کرنے پر نیلوفر خالی بیڈ ڈھونڈنے چلی گئی پھر آ کر تیر کو بتایا کہ اسے خالی بیڈ مل گیا ہے وہ سونے جا رہی ہے۔

صبح جب وہ سو کے اٹھی تو اسپتال میں صائمہ تیر کے پاس موجود تھی۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”بھائی آپ..... اس وقت.....“

”ہاں بھئی کیا کرتی مجبوری تھی تم جو ای کو چھوڑ کر اپنے پار کے ساتھ رات گزارنے کے لیے چلی گئی تھیں۔“ صائمہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

”آپ فضول باتیں نہ کریں بھائی! مجھے تو ای نے خود بھیجا تھا آپ خود وان ہی سے پوچھ لیں۔“ نیلوفر نے زردھی ہوئی آواز میں کہا لیکن اس وقت نیلوفر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں جب تیر نے کہا۔

”لیکن تو..... میں نے تو تمہیں نہیں بھیجا تھا بلکہ ایک جوان سا ڈاکٹر تمہیں اشارہ کر کے بلا کر لے گیا تھا اور تم مجھے سونے کی ہدایت کر کے اس کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ اب صائمہ نے جب تمہیں تلاش کیا تو تم اس ڈاکٹر ساتھ نازیا حالت میں تھیں شاید یہ وہی شخص ہے جس کے ساتھ تم رات رات بھر باتیں کرتی تھیں۔“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں ای! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے سچ بولیں۔ کیوں مجھ پر اتنا گھٹیا بہتان لگا رہی ہیں۔“ نیلوفر نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

”اب زیادہ ہمارے سامنے نیک پروین بننے کی

”ای! آپ نیلوفر کو واپس بلا لیں، یکھیے سارے خاندان والے اور محلے والے عجیب عجیب باتیں بنا رہے ہیں۔“

تیر تو جیسا صائمہ کہہ رہی تھی ویسا ہی کر رہی تھی۔ صائمہ تیر کو بلیک میل جو مسلسل کر رہی تھی۔ تیر نے نیلوفر کے والد سے کہا کہ وہ نیلوفر کو گھر بھیج دیں یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے ہم خود سمجھا لیں گے۔ نیلوفر کے والد نے سوچا کہ شاید ان کی غلط فہمی دور ہوگئی ہے اب ان کی بیٹی کا گھر اجڑنے سے بچ جائے گا وہ نیلوفر کو تیر کے گھر واپس چھوڑ گئے۔

نیلوفر بمشکل ایک ہفتہ اس گھر میں رکی اور ایک رات پھر صائمہ نے شور مچا دیا کہ ابھی ابھی ایک لڑکا نیلوفر کے کمرے سے نکل کر گیا ہے ریاض نے دیکھا کہ باہر والے گیٹ کی کنڈی کھلی ہوئی ہے اور نیلوفر کے سارے بال بھرے ہوئے ہیں اور وہ گھبرائی ہوئی ہے پس پھر صائمہ نے آؤ دیکھنا تاؤ نیلوفر کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھکے مار کے گھر سے باہر نکال دیا کتا سندھ اپنا ناپاک اور غلیظ وجود لے کر یہاں متا نا۔

اور اگلی صبح گیارہ بجے نامہ تیر سے ملنے کے لیے چلی آئی۔ وہ اس ناخوش گوار واقعے پر اظہارِ افسوس کرنے لگی۔ ریاض نے بہت افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا کہ وہ شاید سے کہیں گے کہ نیلوفر کو طلاق دے کر فارغ کرے۔ کیا فائدہ ایسی بدکار عورت کو رکھنے کا کہ اپنے ہاں پیدا ہونے والا بچہ ہی مشکوک ٹھہرے۔ اس کی لم گونی اور معصوم صورت دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ اتنے بڑے کردار کی مالک ہے۔

”ارے خواجواہ شاید اسے طلاق کیوں دے نیلوفر وہی خلع مانگتے دیں۔“ نامہ نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ ریاض نے کہا۔

”مہر کی رقم بچے گی، کیا ضرورت ہے اس بدکردار لڑکی کو مہر دینے کی۔ میں آپ لوگوں کی جانب سے کورٹ میں دعویٰ دائر کروں گی کہ نیلوفر ایک بدکردار لڑکی ہے اور وہ ہمارے گھر سے بھاگ کر اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے تاکہ آزادی کے ساتھ من مانیاں کرے اور جاتے جاتے وہ گھر سے پچاس تولے کے زیورات جس میں اس کے سسرال سے ملے زیور اس کی جیٹھائی صائمہ کے زیور اور ساس تیر سلطانہ کے زیورات بھی شامل ہیں اپنے ساتھ لے گئی ہے اور ساتھ ہی گھر میں موجود ڈھائی لاکھ کاشی بھی ساتھ لے گئی ہے۔“

”لیکن یہ سب تو جھوٹ ہے ہم نے تو خود.....“

ریاض نے حیرانی سے کہا۔

”یہ سب تو صرف اس لیے کہیں گے کہ وہ خاموشی سے خلع لے لے ہم اپنا الزام واپس لے لیں گے۔“

صائمہ نے ریاض کی بات کاٹ کر کہا تو ریاض خاموش ہو گئے۔

پھر کورٹ میں کئی ماہ یہ کیس چلتا رہا خود تیر نے کورٹ میں جھوٹی گواہی دی۔ صائمہ اس میں پیش پیش تھی ہر جگہ ان کے گھر کے چرچے تھے پھر کورٹ نے شاید کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

شاید آتا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ ”میں تو یہاں موجود نہیں تھا میری ای اور بھائی نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔“

نیلوفر نے شاید سے خلع لے لیا اور تیر کی جانب سے کیس واپس لے لیا گیا۔ اس سارے معاملے کو ختم ہونے میں صرف ایک سال کا عرصہ لگا تیر کی حالت پہلے سے زیادہ خراب رہنے لگی۔ ریاض نے واپس کویت نہ جانے کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ کویت میں اس کی جاب ختم ہوگئی تھی البتہ شاید کویت ہی میں تھا۔



# دوراہا

محمد سلیم اختر

اسلام نے عیالوں کو رحمت قرار دیا ہے اور عورت کو معاشرے میں سب سے اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے قدموں میں جنت رکھ دی ہے۔ مگر ہم اپنے دین کی تعلیمات کو بھلا کر کبھی مغربی اور کبھی ہندو تہذیب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جہاں کبھی تو عورت خود کو کھلونا بنا لیتی ہے تو کبھی والدین اسے بوجھ سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔

یہ کہانی بھی ایسے ہی لوگوں کو بے نقاب کرتی ہے

سے بے زار ہیں جو ہم رلا تعداد پابندیاں لگائے۔ یہ نہ کروڑہ نہ کروڑہ کے باہر تاک جھانک نہ کر دکتے جاہل اور پسماندہ تھے وہ لوگ جو ان اصولوں کی پیروی کیا کرتے تھے۔ اب نیاؤہن ہے نئی سوچ ہے ہم لکیر کے فقیر بن کر اپنے جد امجد کے نقش قدم پر نہیں چل سکتے۔ نئی نسل ذہین ترین نسل ہے۔ اس نے انسان کو زمین سے اٹھا کر خلا کی وسعتوں میں پہنچا دیا ہے۔ دنیا کی وسعتیں تنگ کر کے سمیٹ دی ہیں۔ فاصلے کھٹا دیے ہیں اب کسی کو بہن بھائیوں اور والدین کی ضرورت نہیں۔ نیٹ کیے اور کلب بن چکے ہیں۔ پیسہ لگاؤ اور جب تک جی چاہے ان میں الجھے رہو۔ اب کوئی قوت بازو اور لکوار کی دھار کی ضرورت نہیں رہی۔ پیسوں اور کلکاشکوف کی لمبی پرہیزی انگلی کی لمبی جنبش ہماری قوت کی مظہر ہو سکتی ہے۔ پھر ہم احمق بن کر ان فرسودہ اصولوں کا بوجھ کیوں اٹھائیں ہم نئے اور جدید معاشرے کے لوگ ہیں۔ ہم نئی سوچ کے امین اور پاسدار ہیں۔ اسلام نے عورت کو اہم مقام دیا ہے لوگوں نے عیسوی کی پیدائش پر افسردہ اور مغموں ہونا چھوڑ دیا لیکن ہم برصغیر کے مسلمان ہندو تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ کی وجہ سے اس

بیگم روزی آج پھر خاموش تھی۔ اس کی خاموشی میں ایسا کرب اور طوفان چھپا ہوا تھا جس کا اندازہ سوائے اس کے اور کسی کو بھی نہ تھا۔ وہ بادل نہیں تھی کہ برسنے لگتی۔ پھول نہیں تھی کہ مرجھا جاتی، پہاڑ نہیں تھی جو پھٹ پڑتی اور غموں کے اس لہجہ و دق صحرا میں سے نکل آتی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چکور کی مانند آسمان کی طرف پرواز کر جائے۔ کیسا عجیب زمانہ ہے یہ بھی غیر لوگوں نے اب زخم لگانا چھوڑ دیے ہیں اور اب یہ کام وہ لوگ کر رہے ہیں جنہیں ہم اپنا کہتے اور سمجھتے ہیں۔ کبھی شوہر کا رویہ دل میں گھساؤ پیدا کر دیتا ہے تو کبھی والدین اور بہن بھائیوں کا سلوک چر کے لگاتا ہے سچ ہی کہتے ہیں کہ خون سفید ہو گیا ہے۔ اپنے تو ایک طرف ہمارا معاشرہ بھی خود غرضی کی مسموم ہوا میں جھلس چکا ہے۔ معاشرے کے سنہرے اصول سوئی اور ضخیم کتابوں کی جلدوں میں دب گئے ہیں۔ نجانے تہذیب انسانیت اور شرافت کے الفاظ کن لوگوں کے تخلیق کیے ہوئے تھے۔ یہ نئی تہذیب ہے مشینی دور ہے جو اس تہذیب کا ساتھ نہیں دے گا۔ وہ پکلا جائے گا یہ یا معاشرہ ہے نئی نسل ہے۔ اب یہ جدید نسل فرسودہ اصولوں کی پیروی کیوں کرے ہم اس تہذیب

آخرت تو سنو رتی، دنیا بھی سنو ر جاتی۔ آج پچھلے دنوں شری بہت زیادہ حالت خراب ہو گئی وہ بے ہوش ہو جاتی پھر ہوش میں آ جاتی، صرف آنکھیں کھول اور بند کر سکتی لیکن زبان سے کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بار بار آنسو بہنے لگے شاید یہ آنسو دعا امت کے تھے۔

پورا ایک ماہ وہ اسی کیفیت کا شکار رہی پھر اس کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا اس کے جنازے پر کویت سے صائمہ زادہ اور شاہد تو آئے لیکن شاہد کی دوسری بیوی سلمیٰ نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یوں کا فہم اور ہدایت عطا فرمائے آمین۔

سورۃ النور کی آیت 23 تا 25

ترجمہ: ”جو لوگ پاک دامن نے خیر مومن عورتوں پر ہتھیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جب ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ نہیں بھر پور دے گا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھانے والا۔“

میں اپنی تمام قاری بہنوں سے گزارش کروں گی کہ وہ کم از کم تین مرتبہ سورۃ النور کو ترجمہ کے ساتھ سمجھ کر ضرور پڑھیں کیوں کہ آج کل کے دور میں ہمیں ان ہدایات کی شدت سے ضرورت ہے جو عورتوں کے لیے سورۃ النور میں بیان کی گئی ہیں شکر یہ۔



اس مرتبہ صائمہ نے شاہد کے لیے لڑکی دیکھی جو تعلیم یافتہ تھی اور جاب بھی کرتی تھی۔ شاہد شادی کر کے دوبارہ کویت چلا گیا۔ اس مرتبہ وہ زادہ سے بھی وعدہ کر کے گیا تھا کہ وہ بھائی کو بھی جلد از جلد کویت بلانے کی کوشش کرے گا۔

ادھر نئی آنے والی بہو کے ڈھیروں خرے تھے وہ تیر اور صائمہ کو گھاس ہی نہیں ڈالتی تھی۔ بہت اچھی سیکری پاتی تھی بہت جلد شاہد نے اسے کویت بلالیا اور چند مہینوں کے بعد زلیخا اور صائمہ بھی چلے گئے۔ اب گھر میں تیر اور دریا شہزادہ رہ گئے۔ تیر دن رات بیمار رہنے لگی۔ دل کی بیماری شوگر اور جوزوں کے درد نے اسے بستر سے لگا لیا۔

ان حالوں میں پہنچ کر تیر دن رات روتی اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ اس نے نئی لوگوں سے نیلوفر کو یہ پیغام پہنچایا کہ ایک دفعہ مجھ سے آ کر مل لو تاکہ میں تم سے معافی مانگ سکوں ان جھوٹے الزامات اور بہتانوں کی جو میں نے تمہارے پاک دامن پر لگائے تھے کیوں کہ وہ یہ بات جانتی تھی کہ جب تک نیلوفر اسے معاف نہیں کرے گی اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔

لیکن نیلوفر نے آنے اور ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی وہ اپنے بیمار والد اور اپنے بھائی اور بھائی کی خدمت کرتی ہے اور ایک وینیڈیو مدرسے میں بچوں کو ناظرہ قرآن مجیدی سیکل اللہ پڑھاتی ہے۔

تیر کو بستر پر دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی تیر ہے جس کے حسن کا ایک جہاں دیوانہ تھا۔ جو اپنی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے بلیک میل ہو کر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھی۔ کاش وہ سب کچھ اپنے شوہر کو سچ بتا کر معافی مانگ لیتی تو شاید اس کی



فیصلے کو قبول نہ کر سکتے۔ ہندو مذہب عورت کو اپنے کی نئی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ نئی سازشوں کا جال بنے لگا۔ بالآخر وہ اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گئی۔ ہم لوگ سازشوں کے اس جال میں الجھ گئے نئے لوگ بزدل ہیں اب وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن نہیں کر سکتے۔ اب جس گھر میں بیٹی پیدا ہوتی ہے والدین خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے مستقبل کا خوف اب وہ معاشرے میں جوان ہوگی۔ اس کا وجود مسلسل خطرے کا باعث رہے گا۔ اس کا تحفظ اس کی ضروریات زندگی اس کی شادی یہ سوچیں والدین کو جکڑ لیتی ہیں۔ ساری زندگی جو نہیں کیا وہ ان کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ جہیز میں ایل سی ڈی ڈی وی ڈی فریج اور اے سی ضروری ہو گئے ہیں۔ اگر یہ تعیشات فراہم نہ کی جائیں تو آپ کی بیٹی گھر بیٹھے عمر بتا دے گی نئے معاشرے کی ان گنت داستانیں اخبارات کے صفحات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ بیٹیوں کی تعلیم بھی تو ضروری ہے آپ کی استطاعت ہو یا نہ ہو موجودہ معاشرہ جاہل عورت کو قبول نہیں کرتا پر کالج جاتے وقت نئی مشکلات کیونکہ جدید نسل کے ذہین بیٹے راستے میں ان کا استقبال کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔

اسی قسم کے لاتعداد زخم تھے جو روزی بیگم سہہ رہی تھیں۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں۔ بڑی ایم اے میں چھوٹی بی اے میں اور اس سے چھوٹی ایف اے میں تھیں۔ باقی دو ابھی ہائی اسکول میں تھیں۔ آج ان کی بہن رقیہ بیگم اپنے بیٹے ندیم کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ لیکن روزی کے شوہر خاور نے صاف انکار کر دیا۔

”میں اپنی بیٹی ایک معمولی لڑکے کے حوالے نہیں کر سکتا۔“

روزی بیگم نے طرح طرح کے دلائل دیے لیکن وہ نجائے کیا دیکھ رہے تھے۔ مجبوراً روزی بیگم خاموش ہو گئیں اور وہ کربھی کیا سکتی تھیں۔ ہر نیا سال ان کے خوف میں مزید اضافہ کر جاتا اور اب تو رشتے آنے بھی بند ہو گئے اور اگر آتے بھی تو دوسری شادی کے خواہاں لوگ۔ ادھر ان کی بیٹی کی عمر تیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتہ سے کچھ آ رہے تھے۔ انہوں نے فرزانہ کو پسند کیا اور بات کچی ہو گئی لیکن فرزانہ کا رد عمل واضح تھا۔

”میں اس بوڑھے سے شادی نہیں کروں گی۔ اس سے تو بہتر تھا آپ مجھے کنوئس میں گرا دیں۔“ آنسوؤں نے اس کا چہرہ بھگو دیا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

”میں شاید سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ تین بچوں کا باپ ہے۔“

”تو کیا ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی۔ اے ہے کیا زمانہ آ گیا ہے نہ پڑھایا ہوتا تو اچھا تھا۔“ روزی بیگم نے جلدے دل کے پھپھوٹے پھوڑے۔

”امی یہ کہاں کی شرافت ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کا سہاگ اجاڑے۔ آپ بھی تو عورت ہیں کچھ خیال کریں اس بے بچاری کا کیا قصور کیا ہے اس نے۔“

”بس بس میں نے تم سے لیکچر دینے کے لیے نہیں کہا۔“

روزی بیگم نے اسے ٹوک دیا تو وہ افسردہ سی ہو کر رہ گئی۔

”تیری شادی ہوگی تو شاید سے تین بچوں کا باپ ہے تو کیا ہوا دولت مند تو ہے تجھے دوسری عورت سے کیا غرض بس میں تو یہی دعا کرنی ہوں کہ تو عزت کے ساتھ رخصت ہو کر اپنے گھر کی ہو جائے۔“ روزی بیگم نے آخری جملہ آہستگی سے کہا لیکن پھر بھی فرزانہ نے سن لیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ مستقبل کے رنگین خواب ششے کی مانند چمکتا چور ہو گئے۔ وہ خاموش ہو گئی اور اپنی ذات کے خول میں بند ہو گئی جس میں وہ بچپن سے لے کر آج تک قید تھی۔

شاید کا نام سننے ہی وہ سنائے میں آ گئی تھی۔ وہی شاید جو پینتالیس برس کا تھا اور تین بچوں کا باپ بھی تھا۔ ماں باپ اسے شاید کا ہاتھ تھامنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ مادر تھا۔ اس کی نظروں میں ماریہ کا شگفتہ چہرہ ادا اور عائب ہو جاتا۔ وہی ماریہ جو عورت ہونے کے ناتے اس سے اپنے مستقبل کی بھیک مانگ رہی تھی۔ ماریہ جو کبھی اس کی کلاس فیلو تھی۔ نجائے کیوں اسے ماریہ کا گھر اجاڑتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔ اس کا ضمیر اسے نفرین کر رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ جھجک رہی تھی۔ انجالی ان دیکھی راہوں پر ایک اجنبی کے ساتھ قدم ملانے سے ہچکچا رہی تھی۔ سب ہمیں اور رشتہ دار اسے زہر لگ رہے تھے۔ اسے ماریہ پر بے حد ترس آنے لگا تھا مگر وہ خود شرعی روایات کے سامنے بے بس تھی۔ بالآخر وہ لمحہ آپہنچا جب اسے دو ٹوک فیصلہ کرنا تھا۔ لمحوں کے فیصلے کبھی زندگی میں بہاریں لے آتے ہیں اور کبھی کبھی زندگی کو خزاں کا روپ دے دیتے ہیں۔ قطرہ قطرہ ہو جو دل سے رستا ہے وہ روح میں ہی جذب

ہو جاتا ہے اور پلکوں پر موتی بن کر ٹوٹتا ہے۔ آہ یہ ٹوٹا اور بکھڑا۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا، فیصلے کی گھڑی سر پر آن پہنچی تھی۔ اس کے والدین اس سے محبتوں کو قرض کی صورت میں مانگ رہے ہوں۔ جنم دینے کا خراج طلب کر رہے ہوں۔ تو کیا کیفیت ہو جاتی ہے؟ بار بار مرنا بار بار جینا اس کے بس میں نہ تھا۔

ڈھولک کی تھاپ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ گیتوں کی لہ بھی اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے رشتہ دار سہیلیاں شادی کے گیت گارہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھے اور اپنی کزن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیے فوزیہ کے ہاتھ پکڑے تاکہ ڈھولک کی آواز ختم جائے اور گیتوں کی آواز گھٹ جائے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے جو باتیں خیال میں بھی نہیں ہوتیں وہ ہو جاتی ہیں اور جن باتوں کے خواب ہم دیکھتے ہیں وہ تو صحرا کی صدا ثابت ہوتی ہیں۔ نکاح ایک اوٹ بندھن دو اجنبی ہستیوں کا ملن کیا مضبوط ہوگا یا کمزور؟ اس کا جی چاہا وہ آنکھیں میچ کر لب بچھن کر حوصلے سے انکار کر دیے کہ مجھے شاید قبول نہیں مگر وہ انکار نہ کر سکتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اس کے سر پر تیز کرپائیں لیے کھڑے ہیں۔ جو اس کے انکار پر اس کے وجود میں اتار دی جائیں گی۔ بس اس نے آہستہ سے شاید کو قبول کرنے کا اقرار کیا اور اقرار نامہ پر دستخط کر دیے۔ مبارک باد کی آواز اس کے کانوں میں سیسے کی طرح اترنے لگیں۔ وہ آہوں سے سارا شہر اپنے سر پر

اٹھا لینا چاہتی تھی لیکن اس نے آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے باہر نہ جانے دیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شاہد کو قبول کر کے جلتے انگاروں پر قدم رکھ لیا ہو۔



وقت جست لگا کر گزر گیا۔ وہ تین بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ سب سے بڑی بیٹی جیلہ تو شادی کے قابل بھی ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے اس کے لیے اچھے بڑ کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار اس کی بھاگ دوڑ اس کے کام آ گئی۔ بظاہر بھولا بھالا نظر آنے والا نوید اس کا داماد بن گیا۔ ہزاروں اسگوں اور حسرتوں کے ساتھ اس نے جیلہ کو رخصت کیا۔ جیلہ کو رخصت کرتے وقت وہ بہت ہی روتی تھی۔

شادی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے نوید نے گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا جب جیلہ نے اس سے باز پرس کی تو وہ بڑے رسان سے بولا۔

”جیلہ! میں نے تم سے شادی جھج کی خاطر کی تھی۔ میرا خیال تھا تم جینز میں وہ سب کچھ لاؤ گی جس کی مجھے تمنا تھی لیکن تمہارے والدین سوائے واجبی چیزوں کے کچھ نہیں دے سکے۔ لہذا میں تمہیں آزاد کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ الفاظ تھے یا جلتے انگارے جنہوں نے جیلہ کو جھلسا کر رکھ دیا۔ اس نے نوید کے پاؤں پکڑ لیے لیکن وہ وہ خود غرض بڑی ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔

”جج پوچھو تو میں تمہاری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آخر وہ بھی تو تمہارا خون ہے تمہاری رگی نہ سہی تمہاری سوتیلی بہن تو ہے۔ پھر تمہارے باپ نے بھی تو دوسری شادی کی تھی اور انہی ماریہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اگر آج میں ایسا کر

لیکن نوید تو کب کا جا چکا تھا۔ وہ دوسروں کی انا کی جھینٹ چڑھ گئی۔ روتے روتے نجانے اسے کب نیند آ گئی۔ صبح کی روشنی اس کے لیے مزید تاریکی لے آئی۔ سارے گھر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس جادو خاموشی میں کوئی طوفان مضمحل تھا اور پھر نوید کے تین الفاظ اسے ہمیشہ کے لیے برباد کر گئے۔ نوید تاشا نملہ کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرائے کو تیار ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ لحوں میں قتل کر دی گئی تھی۔ اس کی زندگی میں آندھیاں چلنے لگیں۔

”میرا جرم! میرا قصور کیا تھا؟“ وہ جج کر اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا عزم اور حوصلے کے ساتھ اور سمندر کے کنارے آ گئی۔ اس کی وسعت اسے حیران کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے تمام دکھ سارے غم اور بے چینیاں سمندر میں ڈوب رہی ہوں۔ نیلا بے کراں سمندر حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو اس کی تلاطم خیز لہروں کے سپرد کر دیا۔



## لوا نعلاج

حافظ شبیر احمد

عبدالرشید..... سرگودھا

جواب:- مسئلہ نمبر 1:- سورۃ القدریش 11 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ روزگار کے لیے کہ خوب چلے۔

بعد نماز عشاء سورۃ فلق، سورۃ الناس ایک ایک بیچ روزانہ بندش جادو ختم کرنے کے لیے۔ ساتھ ہی پانی پر بھی دم کر لیا کریں۔ صبح کیلنک جاتے ہی چھڑک دیا کرے۔

مسئلہ نمبر 2:- صبح نہار منہ یا علیم 11 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلایا کریں روزانہ۔ نمبر یاد اور..... فیصل آباد

جواب:- بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔ بعد نماز مغرب اور عشاء۔ سورۃ اخلاص، سورۃ فلق، سورۃ الناس 11، 11 مرتبہ رکاوٹ/بندش ختم کرنے کے لیے۔ وظائف پکی خود کرے یا والدہ۔ رخشندہ..... کراچی

جواب:- سونے سے پہلے اول و آخر 25، 25 بار درود ابراہیمی درمیان میں 125 بار سورۃ النضر پڑھ کر۔ معاشی حالات بہتر ہونے کی دعا کریں۔ ناعنہ ہو۔

رخشندہ پروین..... کراچی

جواب:- ان کو لال مرچ بالکل بند کر دیں اور گیس کی دوا مستقل استعمال کروائیں۔ بہتر

ہو جائیں گے۔... نوشین گل..... لاہور

جواب:- رات کو سونے سے پہلے 25، 25 بار درود ابراہیمی درمیان میں 125 بار سورۃ النضر پڑھ کر معاشی حالت بہتر ہونے کی دعا کریں۔ بیٹیوں بھائی اور والد پر بھی۔

مسرت پروین..... خوشاب

جواب:- بھائی کے لیے 11 بار اول و آخر درود ابراہیمی درمیان میں 40 بار سورۃ شمش پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر بھائی کو پلا میں۔ غصہ نکلائی بد زبانی سب بند ہو۔ اور اچھی طرح سب سے پیش آئے۔

ناہید اختر..... چیچہ وطنی

جواب:- بی بی آپ جو کچھ پڑھ رہی ہیں وہ درست ہے۔ لیکن بہر حال آپ اپنے پوزے گھر کا روحانی علاج کروائیں۔ قرب و جوار میں کوئی اچھا عامل ڈھونڈ کر۔ علاج معالج سے کروائیں۔ (خود سے نہ ہوگا)

سمیرانورین

جواب:- والد بچوں کے لیے اچھا سوچتے ہیں۔

بہر حال 40 بار سورۃ الشمس پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پانی پلا میں۔ نیت یہ کریں یہ ضد چھوڑ دیں۔ اور رشتہ کے لیے راضی ہو جائیں۔

انجم مقبول..... سیالکوٹ

جواب:- سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ ٹیوب اور تیل پر دم کر لیں۔ 1 مرتبہ ٹیوب زخموں پر لگا میں تیل کی روزانہ مالش کریں۔ رات بستر پر لیٹ کر روزانہ یہی عمل کریں نیند اور بیماریاں بھی ختم ہو جائیں



دم بھی کریں اور تیل پر دم کر کے لگائیں۔

فوزیہ رخسانہ..... سرگودھا

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70-74 مرتبہ (اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف) ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھیں، دعا بھی کریں اپنے رشتہ کے لیے بہتر اور جلد ہو جائے۔

مظہر حسین شاہ..... میانوالی

جواب: بعد نماز عشاء سورۃ القیش 111 اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ بچوں کے لیے اور روزگار کے لیے دعا کریں پانی پر دم کر کے اسٹور میں چھڑکیں۔

خالہ زاد بہن کے لیے: بعد نماز عشاء روزانہ 41-41 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس (اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھنے کے بعد سب پر دم کریں اور پانی پر دم کر کے سب کو پلائیں 3 ماہ تک یہی عمل کرنا ہے۔ اس کے بعد 21-21 مرتبہ پڑھ کر یہی عمل کریں ان شاء اللہ پریشانی نہیں ہوگی۔

ثروت خورشید..... فیصل آباد

جواب: گھر مسائل کے لیے: ہفتے میں ایک مرتبہ سورۃ بقرہ پڑھ کر پانی پر دم کر لیں روزانہ صبح اور شام پورے گھر میں چھڑکیں ہاتھ روم کے علاوہ۔

رشتہ کے لیے: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70-74 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ ہر نماز کے بعد 11-11 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس نیت جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

بھائی کے لیے: والدہ خود پڑھیں بعد نماز عشاء

نادیہ

جواب: مسئلہ نمبر 1۔ روزانہ 1 تسبیح درود شریف (درود ابراہیمی) تینوں پڑھیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھیں سورۃ آل عمران آیت نمبر 38 دونوں پڑھیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ سورۃ النصر 125 مرتبہ اول و آخر 25-25 مرتبہ درود شریف۔ دونوں پڑھیں۔

س'ش..... ملیر

جواب: رشتہ کے لیے: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70-74 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔

سحر ختم کرنے کے لیے: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہر نماز کے بعد 11-11 مرتبہ ش..... ملکوال

جواب: بعد نماز عشاء سورۃ القیش 111 مرتبہ (اول و آخر مرتبہ درود شریف)۔

نوکری رشتہ اور رکاوٹوں کے لیے: نیت بھی رکھیں اور دعا بھی کریں صدقہ بھی دیں۔

ناکملہ اشفاق..... کوٹ غلام محمد

جواب: بعد نماز عشاء سورۃ القیش 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف۔

وکان اور روزگار میں برکت کے لیے: جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کر دیں۔ چینی سب کے استعمال میں آئے۔ (گھر میں بدظنی کے لیے)

درہ سر کے لیے بعد نماز مغرب 21-21 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس سر پر ہاتھ رکھ کر

سورۃ العصر 41 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف دعا کریں فرماں بردار بن جائے۔

کرن بتول..... میانوالی

جواب: رات کو سونے سے پہلے اول و آخر 25-25 بار درود ابراہیمی اور درمیان میں سورۃ النصر 125 بار پڑھ کر معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں ناعنہ ہو۔

فاطمہ اکرام..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب: رشتہ کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 70-74 مرتبہ اول و آخر درود 11-11 مرتبہ درود شریف۔ امتحان میں کامیابی اور بیرون ملک جانے کے لیے سورۃ القیش ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔

نمرہ..... ٹنڈوالہیار

جواب: صرف آیات شفا پڑھیں بعد نماز مغرب۔ سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف زیتون کے تیل پر دم کر لیں تیل سے روزانہ صبح و شام ہلکی مالش کریں جہاں دھبے ہیں۔ (یہ وظیفہ تیل پر ایک مرتبہ ہی کرنا ہے)۔

بعد نماز عشاء روزانہ سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف اور ایک بوتل پر بھی دم کریں وہ پانی استعمال کریں زیادہ سے زیادہ۔ جب پانی ختم ہو جائے پھر سے یہ دم کریں۔

جمیل..... ساہیوال

جواب: وظیفہ جاری رکھیں کام ہو جائے گا شاء اللہ۔ سورۃ الفرقان بعد نماز فجر پڑھیں رشتہ کے لیے دعا بھی کریں۔

سورۃ عبس بعد نماز عشاء پڑھنی ہے 3 مرتبہ نیت یہ رکھنی ہے کہ جو رکاوٹ بندش ہے رشتہ میں وہ ٹوٹ رہی ہے۔ دعا بھی کریں۔

رابعہ..... فیصل آباد

جواب: نماز کی پابندی کریں۔ فجر کی نماز کے بعد 313 مرتبہ استغفار کریں۔ بعد نماز عشاء "یا قدوس" 1000 مرتبہ پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ نیت ہو کہ اللہ پاک اپنے اس نام کی برکت سے آپ کو پاک اور مبرہ بنادے۔ اپنا بنالے۔ بعد میں اپنے تمام مسکوں کے لیے دعا بھی کریں۔ جب تک مسئلہ حل نہیں ہوتے وظیفہ جاری رکھیں۔ بعد میں روزانہ 101 مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ کوئی مسئلہ اٹکے گا نہیں۔

ح..... ناظم آباد کراچی

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں کہ اگر یہاں بہتر ہے تو سب راضی ہو جائیں۔ اگر نہیں ہے تو جلد از جلد کہیں اور ہو جائے۔

نگینہ زمان..... فیصل آباد

جواب: آیۃ الکرسی سورۃ الفلق سورۃ الناس صبح و شام 11 بار اول و آخر درود شریف 3'3 بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پیئیں۔ شادی تک وظیفہ جاری رکھنا ہے۔

نورین فاطمہ..... S.K.L

جواب: مسئلہ نمبر 1۔ فجر کی سنت اور فرض کے درمیان 101 مرتبہ پڑھیں۔ "یا لطیف یا ودود" اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اللہ کے ناموں کے معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں۔ تصور ہو کہ دل میں نرمی اور الفت پیدا ہو رہی ہے۔

آپ کے لیے اور گھر کے تمام افراد کے لیے یہ وظیفہ والدہ کریں۔  
74 بعد نماز فجر سورة الفرقان (اول و آخر 11'11 بار درود براہمی)۔ پڑھ کر رشتے کی دعا مانگیں۔

مسئلہ نمبر 3: بعد نماز فجر سورة الفرقان کی آیت نمبر 74 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ (رشتے کے لیے) فجر اور مغرب کی نماز کے بعد 21'21 مرتبہ سورة الفلق اور سورة الناس رشتے میں رکاوٹیں ختم کرنے کے لیے۔ رات کو 1 تسبیح استغفار اور 1 درود شریف کی (دینی امور میں آسانی کے لیے) دعا بھی کریں۔

این..... منڈی  
جواب:- "سورة شمس" 40 مرتبہ پانی پر دم کر کے پلائیں روزانہ نیت رکھ کر پڑھیں۔  
شبانہ..... قصور  
جواب:- بعد نماز عشاء سورة ال عمران آیت نمبر 38'313 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔  
ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورة الفاتحہ پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں۔

نجمہ زردین..... لاہور  
جواب:- مسئلہ نمبر:- جادو نہیں ہے آپ آیات شفاء 11 بار پڑھ کر پانی پر پھونک کر پیئیں اور تیل پر پھونک مار کر مالش کریں۔  
مسئلہ نمبر 2:- سورة الفرقان کی آیت نمبر پورے جسم پر دم کریں۔

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے جونء

نام..... والدہ کا نام.....

گھر کا مکمل پتہ.....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں.....

## گوشیو ساخت عمر اسرار

کونسل

یہ جو تم چھپ کے اداسیوں کے گیت گاتی ہو یادوں کی گھنٹیاں من مندر میں بجا جاتی ہو رقصاں ہواؤں میں گونجتی تری آواز گھل رہے ہوں جیسے پراسرار فضاؤں کے راز پکھل جاتی ہیں پتھر بھی کیا ترے گیتوں کے انداز گھڑی بھر نیا اک جہاں من میں بسا جاتی ہو یہ جو تم چھپ کے اداسیوں کے گیت گاتی ہو سروں سے ترے محبت کی جو بارش برس رہی ہے بے قرار دلوں میں کچھ پل کو وہ دہس رہی ہے ذرا یہ تو بتا! خود کس کی دید کو ترس رہی ہے عشق لازوال کا درس من کو سکھا جاتی ہو یہ جو تم چھپ کے اداسیوں کے گیت گاتی ہو بے سمت موج زندگی میں کچھ دیر آنا ترا گیتوں سے دلی سمندر میں بالچل چھپا ترا پھر غم طوفاں میں تنہا چھوڑ کے جاتا ترا صبر و فدا کی سب دیواریں تم گرا جاتی ہو یہ جو تم چھپ کے اداسیوں کے گیت گاتی ہو حسرت ہے میری کبھی مرے سامنے بھی آ کے گا کس نے بھرا درو تیری آواز میں یہ تو بتا اپنے سروں میں کر لے شامل تو میری بھی نوا سکھت فضا میں ہوک کے دیے جب جلا جاتی ہو یادوں کی گھنٹیاں من مندر میں بجا جاتی ہو عصمت اقبال عین..... منگلا ڈیم

نظم

کبھی سوچا نہ تھا

ہوگی یوں آساں زندگی تیرے ساتھ چھوڑ دینے کے بعد تجھے بھلا دینے کے بعد ملی ہے اب یوں آزاوی کہ نہ یادوں کی بھیڑ ہے نہ ہی دھڑکنوں کا شور نہ سوچتی ہیں کچھ نکلیں نہ ہی کرتے ہیں لب کچھ باتیں اب تو یوں گزر رہی ہے تیرے ساتھ کے بنا کہ نہ ہی کچھ سوچتے ہیں ہم قوت گو بانی ہوئی یوں مفلوج کے نہ ہنستے نہ بولتے ہیں ہم نہ سوتے نہ دوتے ہیں ہم تجھ سے جدا ہونے کے ڈر سے ہی مر جاتے تھے ناہم اب تیرے ہی بن یوں جی رہے ہیں ہم کتنا بدل گئے ہیں ہم کیسے جی رہے ہیں ہم تم بن تیری جدائی میں کیا جینا آساں ہوا؟ نا.....!!

این شاہین..... کراچی

دکھ کس نے کہا تھا تم سے محبت کرو مجھ سے اب چھوڑ کر جانا چاہتی ہو کیسے سہہ سکوں گا میں یہ دکھ جو دے کر

جاؤ گی تم مجھے  
لگا ہوں سے دور رہو گی  
جہاں کہیں بھی جاؤ گی  
دل سے لیکن نہ جاسکو گی  
تم میرے.....!

وسیم اختر..... راولپنڈی

غزل

یوں لگا غم بنی میرے دکھ کی دوا ہو جیسے  
میں نے زہر اب پیا آب بقا ہو جیسے  
دل میں پیوستہ ہوئے جاتے ہیں بے کان جفا  
میرے ناکردہ جرائم کی سزا ہو جیسے  
سائیں مکی ہوئی لگتی ہے تیرے آنے سے  
دل کے آئین میں کوئی پھول کھلا ہو جیسے  
میں غم دل کو چھپا کر سر بازار پھروں  
کوئی صحرا میں سکوں ڈھونڈ رہا ہو جیسے  
سسکیاں بھرتی جبا سوئے چن آئی ہے  
اس کے دل میں بھی کوئی درد چھپا ہو جیسے  
درد سینے کا چھپایا ہے سر بزم وفا  
غم کو سینے سے لگایا ہے عطا ہو جیسے  
وہ قمر ہم پر نہیں کرتا عنایت کی نظر  
یوں کرے جور و ستم اس کی ادا ہو جیسے

ریاض حسین قمر..... منگل ڈیڑم

گیت

میں گل ہوں کسی کے ناز کا تو دیکھیے  
اور بلبل ہے نقیب میرے راز کا تو دیکھیے  
کچھ بانوری ادا میں ہیں  
مرے گداز کا آہو  
یوں جی رنگوں میں رنگی  
ہے مری آن کی خوش بو  
آپ کے ظرف سے ہے

مری ڈالی کا غور  
اک بانگن سے لپیچے  
مرے جام و بلو

میں دل ہوں کسی الفت کے خماز کا تو دیکھیے  
اور بلبل ہے نقیب میرے راز کا تو دیکھیے  
میں گل ہوں کسی کے ناز کا.....!

پھر جذبوں کی کہانی میں  
ہوئی منزل بے نشان  
کھو گئی ہے محرم ہر موع  
مری سا گر میں کہاں  
بلا کا کفر ہے اب تو  
مری آشارا ہوں میں  
سو کیا پہچان ہے اپنی

دل ملا ہے محبت ہے لامکاں

میں تسلسل ہوں کسی رشت کی آواز کا دیکھیے  
اور بلبل ہے نقیب میرے راز کا تو دیکھیے

سید عبداللہ شاہد..... حیدر آباد، سندھ

غزل

کشتہ جاں ہوں مجھے دور سے آواز نہ دو  
میں تو بکھری ہوں مجھے دور سے آواز نہ دو  
کل تو کہتے تھے بنادوں گا میں اک تاج محل  
مجھ کو دفنا دیا زندہ مجھے آواز نہ دو  
کم رنگائی کا گلہ تم کو ہے مجھ سے لیکن  
میں تو اب مریجی چکی ہوں مجھے آواز نہ دو  
جانے کس موڑ پر لے جائے مجھے میرا خدا  
ہے تصور میں نظارہ مجھے آواز نہ دو  
اشک آنکھوں سے نکلنے لگے مانند لہو  
ہے میری روح بھی گھائل مجھے آواز نہ دو  
شب تنہائی اور لحد کی آغوش غزل  
سامنے رب کے کھڑی ہوں مجھے آواز نہ دو

سملی غزل..... کراچی

غزل

مسکراتے ہوئے زیت برہم ملے  
زندگی میں بہت سے زخم ملے  
میں کیسے بتاؤں پھر اے جان وفا  
پچھڑے ہوئے لوگ بہت کم ملے  
بہار آئی تو گلشن میں پھول کھلنے لگے  
خزاں کے ساتھ بے وفا صنم ملے  
تیری دید کی طلب تھی درد میں  
سلکتے ہوئے آنسو بھی چشم غم ملے  
کوئی کہاں جدا ہوا یہ تو بتا جاوید  
امید بھی ملنے کی مگر دوست برہم ملے

محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

غزل

تیری یاد جو سینے سے لگا رکھی ہے  
ہم نے دنیا میں الگ اپنی دنیا بسا رکھی ہے  
ہم کو معلوم نہیں چاہت کے تقاضے لیکن  
ہم نے تیری باتوں کے سوا ہر بات بھلا رکھی ہے  
سفر مشکل ہے لیکن معلوم ہے ہم کو  
تو ہمارا ہے تو ہر فکر مٹا رکھی ہے  
تو بھلا دے تو بھلا دے لیکن ہم نے  
تیری خوشبو بھی تعویذ بنا رکھی ہے  
تو الگ ہو تو ہر بار یوں لگتا ہے  
زندگی موت کے پہلو میں بٹھا رکھی ہے  
تیری باتیں تیرا لہجہ تیرا چہرہ واجد  
تجھ میں خالق نے ہر چیز جدا رکھی ہے  
ڈاکٹر واجد گیلانی..... بلیر، کراچی

غزل

جب جب خیال کرتا ہے پنچھی اڑان کا  
آتا ہے اس پر تیر کسی کی کمان کا

پتلا نہیں جو آدمی اپنی زبان کا  
نذرانہ پیش خاک کرے گا وہ جان کا  
الماریوں میں روز کتابوں کو چھپاتا  
سر پر ہو جیسے بوجھ کسی امتحان کا  
چوری ہوئی زمین سے گندم کی بوریاں  
ٹوٹا مگر نہ حوصلہ بوڑھے کسان کا  
اُس کی جدائی اور میری حسرتوں کا خون  
بس اتنا مختصر ہے سفر داستان کا  
چپ چاپ لوگ ایک طرف تھے کھڑے ہوئے  
سایان جل رہا تھا کسی کی دکان کا  
عاطر کہیں وہ اپنا ارادہ بدل نہ دے  
دروازہ بند کر کے نہ سوتا مکان کا  
رانا حنیف عاطر..... جھڈو

کیسی محبتیں.....!!

دشوار ہیں بہت راستے  
بہن بسی مسافتیں  
کوئی جان نہیں پایا  
کیسی یہ محبتیں  
کہیں رونا رات رات بھر  
کہیں جاگنا رات رات بھر  
کہیں درد کی سوغات ہے  
کہیں خوشیوں کی بڑ سائیں  
کوئی جان نہیں پایا.....!!  
کوئی صحرا صحرا در بدر  
گل گئی پھرے بے خبر  
تر تہارے شام دگر  
ڈھونڈے ہم سفر دے صدائیں  
کوئی جان نہیں پایا.....!!  
ہو جدائیاں یا ملن یہاں  
ہے برا کھٹن جیون یہاں



ہجر ہو یا وصال ہو  
جنگی ہیں منزلیں  
کوئی جان نہیں پایا.....!  
یہ رنگ دہر کی بارشیں  
یونہی چاہو تم ہیں گزارشیں  
یونہی رہیں یہ چاہتیں  
ہوں الگ بھی نہ راہیں  
کوئی جان نہیں پایا  
کیسی یہ محبتیں.....!

عبدالملک کیف..... صادق آباد  
ہم لوگ!  
کسی اداس قبر کی سوچی مٹی  
کی طرح تھے  
فضائے بسیل میں بکھرے ہوئے  
زرد چوں کی طرح  
جوا!  
ٹوٹے لنگھوں کو جوڑنے کی سعی میں  
دل اپنے بھی  
زخمی کرتے رہے  
کسی ساز بہا بھرے ہوئے  
درد بھرے تنگیت تھے  
آنسوؤں سے زخم اپنے دھوتے رہے  
کیسے تھے ہم لوگ بھی  
صدیوں تک سوتے رہے  
آنکھ کھلی تو اپنے آپ کے گلے لگ کر  
پہروں بیٹھے روتے رہے  
اپنا آپ کھوتے رہے

بشری علوی..... راولپنڈی

بند لفظ بند کتابیں  
کبھی ہم بھی اپنے نرم لہجے میں

زبان پر اگستے لفظوں میں  
کبھی نظموں کبھی غزلوں کی صورت گنگنایا کرتے  
تھے

کتابوں میں لکھے حرفوں سے  
دلوں کو سحر کرتے تھے  
کہ یہاں آئے اداس لوگوں کو  
اپنی اداسی بھول جاتی تھی  
سہاں بدلا اور رت بدلی  
ہم اور وہ کتابیں نظموں کی  
اب ڈھیر ہیں فقط کاغذ کے  
پس زنداں میں  
کسی طالعے میں بند  
زبان پر اب بھی لفظ اگستے ہیں  
مگر  
طالعے کی دیمک ان کو چاٹ لیتی ہے

طاہرہ جمیل تارا..... لاہور

غزل  
اس کے ہونٹوں پر اتر آئی دعا میرے بعد  
یہ بھی صد شکر مرا نام لیا میرے بعد  
اپنی ہستی سے تو دیے ہی اسے نفرت تھی  
وہ تو کرتا ہی رہا خود سے جفا میرے بعد  
ہوش اپنا نہ کسی شخص کی پہچان اسے  
روگ ایسا ہی کوئی اس کو لگا میرے بعد  
وہ جو پتھر کے خداؤں میں رہا کرتا تھا  
اس کی آنکھوں سے کوئی اشک گرا میرے بعد  
اس کو احساس ہوا میرے پھٹ جانے سے  
اس نے محفل میں مرا ذکر کیا میرے بعد  
بعد مرنے کے اسے مانگ رہا تھا راشد  
مجھ پر ہنستا ہی رہا میرا خدا میرے بعد

راشد ترین

## ذوق نگہی

عنان احمد

### سب سے بڑا دشمن کون ہے؟

ایک بزرگ سے میں نے اس حدیث کا معنی  
دریافت کیا ”تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو  
تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔“ فرمایا: تم  
نفس کے علاوہ اس وجہ سے کہ جس دشمن کے ساتھ  
احسان کرو گے وہ تمہارا دوست ہو جائے گا اس  
(نفس) کی جتنی خاطر تواضع کرو گے وہ زیادہ مخالفت  
کرے گا۔ آدی کم کھانے سے فرشتہ صفت بن جاتا  
ہے اگر وہ چوپایوں کی طرح کھانے لگے تو جمادات کی  
طرح پڑا رہے گا یعنی بے کار ہو جاتا ہے نفس جب  
اپنی مراد پالیتا ہے تو زیادہ حکومت کرنے لگتا ہے اور  
ظلام بنالیتا ہے۔ (گلستان ص ۱۹۸)

محمد ظفر اللہ ضیا..... کمالیہ

### نصیحت کے باب میں ارشادات

☆ ایک دن دوا بیچنے والے نے نئی اچھی بات  
کہی کہ اگر تم شفا چاہتے ہو تو کڑوی دوا ضرور پی لو،  
بے غرض مخلصانہ نصیحت کی بات انسان کی اصلاح  
کے لیے بیماری کو ختم کرنے والی کڑوی دوا کی طرح  
مفید ہے۔

☆ ایسی حق بات جو علم کی چھائی میں چھپی ہوئی اور  
عبادت کے شہد میں ملی ہوئی ہو اس پر ضرور عمل کرنا  
چاہیے، باطل عالم کی بات میں خاص فائدہ اور اثر ہوتا  
ہے اس کی قدر کرنی چاہیے۔

☆ بعض مرتبہ نکتہ چینی کرنے والے جاہل کی  
ملامت عالم کی نصیحت سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔  
☆ خود پسند انسان کو نصیحت کرنے والا آدمی خود

دوسرے کی نصیحت کا محتاج ہے۔  
☆ جو شخص اپنے بڑوں کی نصیحت سننے کے لیے  
راضی نہ ہو اسے دنیا کی ملامت سنی پڑتی ہے۔  
☆ بڑے آدمیوں کو نصیحت وہی شخص کر سکتا ہے  
جس کو ان سے کوئی طبع اور خوف نہ ہو۔

☆ بزرگان دین پہلے نصیحت سے کام لیتے ہیں  
اگر وہ موثر نہ ہو تو پھر سختی کرتے ہیں۔  
☆ نیک بخت لوگ گزرے ہوئے لوگوں کے  
قصے سن کر عبرت حاصل کرتے ہیں، تم بھی دوسروں  
کے احوال سے نصیحت اور سبق حاصل کرو، تاکہ  
تمہاری حالت دوسروں کے لیے قابل عبرت نہ  
بنے۔

☆ یہ سعدی کی باتیں مثالیں اور نصیحتیں ہیں اگر  
عمل کرو گے تو تمہارے لیے مفید ثابت ہوں گی۔  
جاوید اقبال ندیم..... جھنگ صدر

### امیر المؤمنین حضرت عمر بن

#### الخطاب کی حکایت

ایک جنگ جگہ ایک فقیر کے پیر پر حضرت عمرؓ کا حیر  
پڑ گیا۔ فقیر کو معلوم نہیں تھا کہ آپؓ کون ہیں۔ رنجیدہ  
انسان کیوں کہ دشمن اور دوست میں تمیز نہیں کر پاتا وہ  
ان پر بڑ گیا کہ شاید تو اندھا ہے۔ مصطفیٰ سردار  
حضرت عمرؓ نے اس کو جواب دیا کہ میں اندھا تو نہیں  
ہوں لیکن کام غلط ہو گیا ہے مجھے محسوس نہیں ہوا میری  
خطا معاف کر دے۔

بزرگان دین کیسے انصاف پسند اور منکسر المزاج  
ہوتے ہیں سچے میوہ سے بھری شاخ زمین پر جھک  
جاتی ہے۔ تواضع کرنے والے کل قیامت کے دن  
خوش ہوں گے متکبروں کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا  
ہوگا اگر تم حساب کے دن سے ڈرتے ہو جو تم سے ڈرتا  
ہو اس کی خطا معاف کر دے طاقت ورا دی! ماتخوں

# گنلاپکاسی

ایہ حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے، ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پھر چہن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پھر محترم لے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عریق رحمت کرے ان کے بارے میں ہمہ الف کے منہر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ لے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹپٹپ برسی ہے اور جب وہ تہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو تہوہ کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جانور کہے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ زیرِ نظر ناول بھی لے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایلونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے قصائے بھی ملیں گے۔

”دروازہ کھلا ہے۔“  
میں اس عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سامنے تخت پوش پر ایک موٹا بھاری بھر کم آدمی اوٹنی چند اوٹنی ٹوٹی اور اوٹنی لہنگا پہنے بیٹھا۔ سگار پی رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے برفانی بھالو لگا۔ کمرے میں مٹی کے تیل کا بڑا لیپ روشن تھا۔ دیواروں پر سناپیوں کے بت بنے ہوئے تھے۔ جس تخت پر وہ بھالو نما انسان بیٹھا تھا اس کے پیچھے بھی دیوار پر پتھر کا ایک سیاہ سانپ پھن کھولے ہوئے تھا۔  
میں نے جاتے ہی ہندوؤں کے طریقے سے ہاتھ جوڑ کر پنام کیا۔ وہ آدمی جو یقیناً بچاری راج گروہی تھا میری طرف اپنی زرد چمکی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔  
”کیا نام ہے تمہارا؟“  
”بھیکو مہاراج۔“  
”کہاں سے آئے ہو؟“  
”مہاراج! دھنبار کار رہنے والا ہوں۔ وہاں ایک ناگ مندر میں آپ کی بڑی تعریف سنی اور دل میں چاہ پیدا ہوئی کہ جا کر آپ کے چرن چھوؤں اور آپ کی خدمت کروں۔“  
وہ سگار کا کش لگا کر بولا۔  
”جاؤ جاؤ۔ یہاں تمہارے واسطے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دُفع ہو جاؤ۔ یہاں سے..... کاچی اسے یہاں سے نکال دو۔“  
کاچی اس متقی عورت کا نام تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف چلی۔ میرے ساتھ وہ بھی راج گروہ کے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور میرے آگے بڑھے۔ میں چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے کوئی ترکیب لڑائی چاہیے۔ اس بچاری راج گروہی تو مجھے مندر میں گھسنے نہیں دیا۔ بڑا مدے بکا گے محسن تھا۔ محسن کے برفانی فرش پر چلتے ہوئے کاچی مکان یا مندر کی ڈیوڑھی میں آئی تو میں نے کاچی سے کہا۔  
”کاچی! میں راج گروہی کی سیوا کرنے یہاں آیا

پر ظلم نہ کر اس لیے کہ ایک ہاتھ تیرے ہاتھ سے بھی اوپر ہے۔ (کہ ہر سیر کے لیے سوا سیر ہوتا ہے)  
محمد جاوید بٹ..... گجرات

## انگٹھی والا قصہ

حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے والد صاحب کے زمانہ کا قصہ یاد ہے ان پر ہر دم خدا کی رحمت ہو۔ انہوں نے میرے لیے بچپن میں کتنی، کاپی اور ایک انگٹھی خریدی۔ ایک دھوکا باز نے ایک بھجور کے بدلے میرے ہاتھ سے وہ انگٹھی نکال لی۔ چھوٹا بچہ انگٹھی کی قیمت کو کیا جانے اس سے (میتھی چیز) مٹھتی چیز کے بدلے دھوکا دے کر لی جاسکتی ہے۔  
فائدہ: آج ہم بھی اپنی پیاری عمر کی قیمت نہیں سمجھتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے احکام کو بھول کر دنیا کے میٹھے عیش میں اس کو ضائع کر رہے ہیں۔

نازیہ کنول..... کراچی

## ایک بے وقوف شاگرد

ایک پہلوان کشتی لڑنے کے فن میں کمال کو پہنچا ہوا تھا، تین سو ساٹھ داؤد علی درجہ کے جانتا تھا۔ ہر روز ان داؤد میں سے ایک داؤد کے علاوہ سب داؤد شاگرد کو سکھا دیے۔ اس ایک داؤد کے سکھانے میں ٹال مٹول اور تاخیر کرتا رہا۔ خلاصہ کلام یہ کہ لڑاکا طاقت اور کشتی کے فن میں کمال کو پہنچ گیا اور زمانہ میں کسی کو اس کے ساتھ مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔

بات اس حد تک پہنچی کہ ایک دن اس نے زمانہ کے بادشاہ کے سامنے یہ کہہ دیا۔ استاد کو مجھ پر جو فضیلت حاصل ہے وہ ان کے بڑا ہونے اور تربیت کے حق کی وجہ سے ہے ورنہ طاقت میں میں ان سے کم نہیں ہوں اور کشتی کے فن میں تو میں ان کے برابر ہوں۔ بادشاہ کو یہ بات اچھی نہ گئی۔ حکم دیا کہ استاد اور

حسن اختر پریم..... کراچی



تھا۔ اگر اس کی بیوا کیے بغیر مر گیا تو میری آتما کو شانتی نہیں مل سکے گی۔“

کاپچی نے ڈیوڑھی کے دروازے کو کھولنے کے بعد میری طرف دیکھا اور سر سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں باہر نکل جاؤں۔ میں اس متقی عورت کا دل موم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

”کاپچی جی! اور اسوچان برفانی پہاڑوں میں کہاں جاؤں گا۔ یہاں تو باہر سردی سے ٹھہر کر مر جاؤں گا۔“

جب میں نے دیکھا کہ کاپچی کے چہرے پر میرے ساتھ ہمدردی کے تاثرات نمایاں ہو رہے ہیں تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”کاپچی دیوی! بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ میں مندر میں بیٹھ کر ناگ دیوتا کی بھی سیدھا کرنا چاہتا ہوں۔“

متقی عورت کے دل میں میرے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اس نے آہستہ سے کہا۔

”یہاں ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔“

میں جلدی سے دروازے کے ایک طرف ہو گیا۔ کاپچی واپس چلی گئی۔ شاید وہ راج گرد کو یہ کہنے گئی تھی کہ مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے تھوڑی دیر بعد اُس کی یاد آ جانے کیا کرنے گئی تھی۔ بہر حال اس نے میری مدد کرنے کی ہاں بھری تھی۔ واپس آئی تو یہ کہہ کر میرے آگے چل پڑی۔ ”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

اس مندر کے بازو میں تیسری چٹان کے عقب میں تیلوں کی برفوں کے درمیان ایک راستہ جاتا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس راستے پر آ گئی۔ آگے جا کر ٹیلے

کے دامن میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی جس کی ڈھلواں چھت برف میں چھپی ہوئی تھی۔ کاپچی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں باہر کھڑا رہا۔ کاپچی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

”وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اندر کیوں نہیں آتے؟“

میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ یہاں بھی فرش لکڑی کا تھا۔ جس پر خشک گھاس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا آتش دان تھا۔ کاپچی نے دروازہ بند کرنے کے بعد مٹی کے تیل والا لیمپ روشن کر دیا۔ کہنے لگی۔

”مجھے تم پر ترس آ گیا ہے بھیکو۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں کسی طرح راج گرد پجاری کو منالوں گی کہ تمہیں مندر میں نوکر رکھ لے۔“

میں نے کاپچی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔

”کاپچی جی! تم دیوی ہو۔۔۔۔۔۔“

وہ بولی۔

”لیکن اس جگہ سے باہر مت جانا۔ بہت ہی ضرورت پڑے تو پیچھے گھائی میں چلے جانا مگر اس وقت تک مندر کی طرف مت آنا جب تک کہ میں پجاری راج گرد سے تمہاری نوکری کی بات کچی نہیں کر لیتی۔“

میں بگلوں میں ہاتھ دیئے خشک گھاس پر بیٹھا تھا۔

”تمہیں کھانے پینے کو میں یہاں دے جایا کروں گی۔“

میں نے کہا۔ ”میرے خنجر کا کیا بنے گا؟ وہ مندر کے باہر تھا۔ تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔“ کاپچی کہنے لگی۔

”خنجر مندر کا ایک اصطبل ہے جہاں مندر کی گائے اور پجاری کے خنجر بندھے رہتے ہیں۔ میں تمہارا خنجر بھی وہیں لے جاؤں گی۔“

کاپچی ساتھ والے کمرے میں گئی اور وہاں سے ایک بڑا لحاف نکال کر لے آئی۔ لحاف گھاس کے بستر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ دروازہ بند کرنے سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں دن کے وقت آتی ہوں تو لیمپ جلا لیتی ہوں۔ اوپر صرف روشن دان ہے۔ ساتھ والے کمرے میں غسل خانہ بھی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

میں کاپچی کے اس فیاضانہ سلوک پر خوش بھی ہوا اور حیران بھی ہو رہا تھا کہ آخروہ مجھ پر اچانک اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ شاید اسے مجھ پر ترس آ گیا تھا کہ میں اتنی دوز سے وہاں گیان دھیان کرنے آیا ہوں اور پجاری نے مجھے دھکا دیا ہے۔ کاپچی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ اندر سے پجاری راج گرد کے خلاف ہے اور اسے پسند نہیں کرتی۔

مجھے نہ تو وہاں کوئی گیان دھیان کرتا تھا اور نہ نوکری چاکری کرنی تھی میں تو وہاں پاروتی کی تلاش میں آیا تھا اور مجھے کچھ دیر وہاں رہ کر پاروتی کا سراغ لگانا تھا۔ میرا یہ مسئلہ کاپچی نے حل کر دیا تھا۔ پھر کبھی میں نے اسے اصرار کے ساتھ کہا کہ جس طرح بھی ہودہ مجھے راج گرد کی اجازت سے مندر میں کوئی کام دلادے۔ کاپچی نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور کوشش کرے گی۔ مکان سے جاتے ہوئے کاپچی مجھے کہہ گئی کہ میں وہاں سے باہر کہیں نہ جاؤں اور جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی میں کمرے میں ہی رہوں۔ اس نے آتش دان میں دو چار موٹی لکڑیاں جلا دی تھیں۔ کاپچی کے جانے کے بعد میں آتش دان کے قریب ہو کر گھٹنوں پر لحاف ڈال

کر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاروتی کا رومال نکال کر اسے دیکھا۔ سونگھا۔ مجھے تو اس میں سے پاروتی سانپ کی کوئی بو نہیں آ رہی تھی لیکن میں انسان تھا اس بو کو صرف سانپ ہی محسوس کر سکتے تھے۔ رومال کو تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا۔

شام ہو گئی۔ میں کمرے میں ہی رہا۔ جب باہر اندھیرا ہونے لگا تو کاپچی آ گئی۔ مندر میں وہ راج گرد اور دو تین پجاریوں کے لیے کھانا وغیرہ بھی بناتی تھی۔ آتی دفعہ میرے لیے چاول رومال میں ڈال کر لے آئی۔ یہ نمکین چاول تھے۔ وہ آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر آگ تیز کرنے لگی۔ میں چاول کھانے لگا۔ پھر دوسرے کمرے میں گئی اور میرے لیے تھوہ بنا کر لے آئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ راج گرد سے اس نے میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی۔ کہنے لگی۔

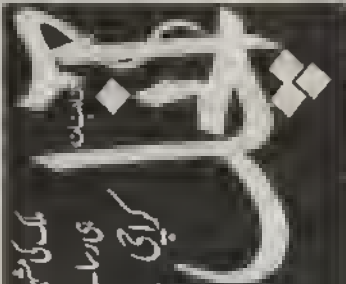
”آج موقع نہیں ملا۔ کل ضرور کروں گی۔ دے دیے بھی تمہارا مندر میں نوکر بن کر رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تم میرے ہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکو گے۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔“

اس نے بتایا کہ پجاری راج گرد نے ہر قسم کے سانپ پال رکھے ہیں جن کی وہ پوجا کرتا ہے۔ ”اس نے مجھے بھی ایک سانپ دیا تھا۔ میں تمہیں وہ دکھاتی ہوں۔ یہ سانپ شیش ناگ دیوتا کی پیڑھی سے ہے۔“

کونے میں ایک مٹی کا بڑا سا مڑکا رکھا ہوا تھا۔ وہ مٹکے میں سے ایک چھوٹی پٹاری نکال کر لے آئی۔ پٹاری سامنے رکھ کر اسے کھولا تو اس میں سے سنہری رنگ کا ایک بالشت بھر کا سانپ پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا۔ کاپچی نے سانپ کو پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

”یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔ پجاری کہتا ہے اس





ملک مشہور معروف فلاسوں کے سلسلہ وار ناول اور افسانوں سے موزون ایک جدید کھرچری کہانی جس کی صرف ایک ہی ساری ہے۔ کتاب کی آسوی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے معروف اور معروف۔ آج ہی اپنی کتاب کی کراہیں۔

جیل کمانڈر کنکر۔ سماجی رویوں پر مبنی نازیہ کنکر ناول کا کلاش سلسلہ

پہلی پبلک ایجنسی: معروف صنفی افسانہ نگار کا خصوصی سلسلہ ناول ناقابل فراموش ناول

35620774/2

جو کہیں گے میں ویسے ہی کروں گی۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ راج گرو نیچے مندر میں کسی خاص چیز کی تلاش میں گیا تھا اور جب وہ واپس آیا تو بڑا خوش تھا اور اسی روز وہ اپنی کچھا میں چلا گیا تھا۔

”اس کی کچھا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”کچھی نے کہا۔“ یہ مندر میں کسی بچاری کسی دیوداسی کو معلوم نہیں ہے۔ مگر میں سب معلوم کر لوں گی۔ آپ مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دیں۔“  
میں نے کہا۔ ”نہیں دو دن زیادہ ہیں۔ میں تمہیں کل کے دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں ایک دن میں ساری جاسوسی کرنی ہوگی۔ کیا تمہیں منظور ہے؟“  
مجھے یہ خطرہ تھا کہ راج گرو کہیں اتنی دیر میں پاروتی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ نہ پہنچا دے۔ کچھی کو میری وجہ سے سب سے بڑی بچاری بننے کا موقع مل رہا تھا کہ کہنے لگی۔

”جو حکم مہاراج! میں کل تک ساری باتیں معلوم کر لوں گی۔“  
رات گزر گئی۔ دوسرے روز کچھی نے جاتے ہوئے بڑے احترام سے میرے پاؤں چھوئے اور کہا۔

”مہاراج! میں جاتی ہوں۔“  
کچھی چلی گئی۔ اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھی اس مکار بچاری راج گرو کی بڑی چیتنی دیوداسی سے اور وہ اس کے دل کا راز معلوم کر لے گی۔ صبح کی گئی کچھی دوپہر کو بھی نہ آئی۔ شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کچھی آ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات معلوم کر کے آئی ہے۔ آتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میرے پاؤں چھوئے اور سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

لفظوں میں بات کروں گا۔ میں اپنی ایک دیوداسی ناگن کے ساتھ پرلوک سے دھرتی پر سر کر رہی تھی۔ دیوداسی ناگن کے روپ میں میرے ساتھ تھی۔ گورکھپور شہر میں اچانک وہ میری کلائی سے اتر کر باغ میں پھرنے لگی ایک آدمی نے اسے دیکھا تو لاشی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ میں نے ناگن کی لاش کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کیا اور کیلاش پر بت لے آیا۔ کیونکہ لاش کے ٹکڑوں والے ڈبے کو کیلاش پر بت کے تالاب میں دس روز لٹکا کر رکھنے کے بعد دیوداسی کو پھر سے زندہ ہو جاتا تھا۔ میں نیچے مندر میں ڈبے کو تالاب میں ڈبو کر دس دن تک بیٹھا رہا مگر تمہارے بچاری راج گرو نے اپنی طاقت کے زور سے دیوداسی ناگن کا پتا چلا لیا۔ بس وہ آخری رات کو مندر میں آیا اور بچاری سے مل کر دیوداسی والا ڈبہ نکال کر لے گیا۔ مجھے شیش ناگ دیوانے ساری بات بتادی۔ چنانچہ اب میں اپنی دیوداسی کی تلاش میں راج گرو کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دیوداسی کا سراغ لگاؤ اور پتہ کرو کہ وہ بچاری راج گرو نے اسے یہاں کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ میں تمہیں اس کے عوض شیش ناگ کا سب سے اونچا منتر بتا دوں گا اور تم سب سے بڑی بچاری بن جاؤ گی۔“

کچھی بڑے غور سے میری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی کیفیت تھی۔ سنہری سانپ اسی طرح پھن جھکائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کچھی سے کہا۔  
”سانپ کو پٹاری میں بند کر دو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟“  
کچھی نے سانپ پٹاری میں بند کر دیا اور میرے پاؤں کو چھو کر بولی۔  
”مہاراج! میں آج سے آپ کی داسی ہوں آپ

میں ایک ہزار سانپوں کا زہر ہے۔“  
اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ یہ میرے لیے عجیب نہیں تھی مگر کچھی کے لیے بڑی حیران کر دینے والی بات تھی۔ سنہری سانپ نے اپنا چھوٹا سا پھن کھول کر میری طرف دیکھا۔ پھر کچھی کی کلائی سے اتر کر میرے قریب آیا اور کنڈی مار کر سامنے بیٹھ گیا اور اپنا پھن جھکا دیا۔  
کچھی حیرت زدہ تھی ہو کر کبھی مجھے اور کبھی سانپ کو دیکھتی۔ اس نے ساری زندگی ناگ مندر میں گزاری تھی۔ سمجھ گئی کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھ پر جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔  
”تم کون ہو؟ مجھے بتا دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

مجھے اس عورت سے پاروتی کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ قدرت نے اس عورت کا اعتماد حاصل کرنے کا ایک موقع دے دیا تھا۔ میں نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ میرے پاس پاروتی ناگن کا رومال ہے جس کی وجہ سے سنہری سانپ میرے آگے جبک گیا ہے۔ میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔  
”کچھی! اب جبکہ میری طاقت کا راز تم پر اس سانپ نے کھول دیا ہے تو میں تمہیں اتنا ضرور بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں شیش ناگ کا اوتار ہوں۔ سانپ میری تعظیم کرتے ہیں۔“  
سنہری سانپ ابھی تک اپنا پھن میرے آگے جھکائے بیٹھا تھا۔ میں تو ڈر کے مارے اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگی۔  
”مہاراج! آپ شیش ناگ دیوتا کے اوتار ہیں تو آپ کو یہاں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“  
میں نے کہا۔ ”کچھی یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ دو

”مہاراج! میں نے آپ کی دیوداسی ناگن کا سراغ لگالیا ہے۔“

میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”کہاں ہے وہ؟“

”میں کاچی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ راج گرو نے پاروتی کو اوپر برف پوش پہاڑیوں کے ایک زمیں دوز تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔ جو اس کی گھبراہٹ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس عیار شخص نے پاروتی کے زندہ ہو جانے کے بعد اس پر اپنا منتر پڑھ کر اسے اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ پاروتی کی یادداشت کم ہو چکی ہوگی۔ کاچی کہنے لگی۔“

”اس بات کا سوائے راج گرو کے اور کسی کو علم نہیں ہے میں ہی جانتی ہوں کہ میں نے یہ راج گرو سے کیسے اگلوایا ہے۔“

میں نے کاچی سے کہا۔

”شاہاش! تب تم یہ معلوم کرو کہ راج گرو کی گھبراہٹ میں کس جگہ پر ہے۔“

کاچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! میں یہ بھی معلوم کر آئی ہوں۔“

میں نے کاچی کی ذہانت کی تعریف کی اور کہا۔

”اب مجھے اس گھبراہٹ تک لے چلو۔ جب میں دیوداسی کو دیکھ لوں گا تو تمہیں وہ خاص منتر بتا دوں گا جس کو پڑھنے کے بعد تم سب پجاری اور پجاریوں کی رانی بن جاؤ گی۔“

دوسرے دن جب رات آدھی گزر چکی تھی تو کاچی اور میں دو خچروں پر سوار اس گھبراہٹ کی طرف جا رہے تھے جس کے تہ خانے میں پاروتی موجود تھی۔

\*\*\*

ہم برف پوش پہاڑیوں میں چلے جا رہے تھے۔

کاچی خچر پر سوار میرے آگے آگے تھی۔ میرا خچر اس کے پیچھے تھا۔ پتھر کی پلڈنڈی پر برف جمی ہوئی تھی اگرچہ آدھی رات کا وقت تھا مگر اندھیرے میں برف کی سفیدی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اس وجہ سے سردی ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ہماریہ کے برفانی پہاڑوں میں جب تیز ہوا چلتی ہے تو سردی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ خچروں پر بیٹھے سفر کرتے رہے۔ اس دوران ہم کئی برف پوش ٹیلوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتے آ کر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بڑی بڑی برف پوش چٹانیں آٹنے سے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان ایک کچی بن گئی تھی۔ یہاں آ کر کاچی نے خچر روکنا اور نیچے اتر آئی۔ اس نے مجھے بھی خچر سے اترنے کا اشارہ کیا۔

خچروں کو چٹان کی دیوار کے پاس لے جا کر ایک پتھر سے باندھ دیا۔ میں سامنے والی چٹان کے نیچے کھڑا تھا۔ کاچی میرے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔

”ہم راج گرو کے تہہ خانے کے قریب آ گئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ تہہ خانہ کہاں ہے؟“

”جہاں یہ سامنے والی چٹان ختم ہوتی ہے وہاں چٹان کے اندر ایک شگاف ہے اس شگاف میں سے ایک راستہ نیچے پجاری کی تہہ خانے والی گھبراہٹ کو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے مہاراج! آپ کی ناگن دیوداسی وہاں موجود ہوگی۔“

میں نے کاچی سے کہا۔

”تم خچروں کے پاس میرا انتظار کرو میں پہلے خود تہ خانے میں جاتا ہوں۔“

کاچی خچروں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ ہو کر آگے چلنے لگا۔ برفانی راستہ اونچے نیچے پتھروں کی وجہ سے غیر ہموار تھا۔ میں سنبھل

سنبھل کر چل رہا تھا چٹان جہاں ختم ہوئی وہاں کاچی کے تپانے کے مطابق اندر کی جانب ایک گہرا شگاف بنا ہوا تھا۔ میں جھک کر اس کے اندر چلا گیا اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے دیواروں کو ہاتھوں سے ٹٹولا۔ ایک جگہ چٹان کے شگاف کی دیوار پر ٹاٹ کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے اوپر اٹھایا تو مجھے نیچے ہلکی ہلکی روشنی میں پتھر کا زینہ دکھائی دیا۔ یہ روشنی کی چراغ کی جی جوتے تہہ خانے میں روشن تھا۔ اس کی روشنی زینے پر پڑ رہی تھی۔

میں دبے پاؤں زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں ہوں گی۔ آخری سیڑھی کے قریب پہنچا تو ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی عورت دھیمی آواز میں منتر پڑھ رہی ہو۔ میں زینے کی دیوار کے ساتھ لگ کر آخری سیڑھی پر آ گیا اور گردن آگے کر کے دیکھنے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا۔ سامنے والی دیوار پر سانپ کا بت بنا ہوا تھا۔ اس کے آگے چوکور پتھر پر پیتل کی تھالی میں دو چراغ جل رہے تھے۔ ان کے پاس ایک عورت بیٹھی دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے بال کمر تک کھلے تھے۔

اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے پاروتی کے بال فوراً پہچان لیے۔ یہ پاروتی ہی تھی۔ میں زینے سے ہٹ کر تہہ خانے کے فرش پر دو قدم چلا ہوا گا کہ پاروتی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس نے بڑے غصے سے پوچھا۔

”کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟“

”افسوس..... اس مکار راج گرو پجاری نے پاروتی پر منتر پڑھ کر اس کی یادداشت معطل کر دی تھی۔ پاروتی میری طرف دیکھ رہی تھی اور مجھے بالکل نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے کہا۔“

”پاروتی میں ہوں۔ تمہارا پرانا ساتھی۔ کیا تم نے

مجھے پہچانا نہیں؟“

پاروتی عصبیلی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک سانپ باہر نکال لیا اور بولی۔

”اگر تم یہاں سے باہر نہ گئے تو میں سانپ سے ڈسا دوں گی۔ یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ تم کھڑے کھڑے پھل جاؤ گے۔“

پاروتی کا رد مال میرے پاس تھا۔ میں نے رد مال جیب سے نکال لیا اور کہا۔

”پاروتی! یہ دیکھو۔ یہ وہ رد مال ہے جس میں تمہاری لاش کے ٹکڑے ڈال کر کیرلاش پر بت کے تالاب پر لایا تھا۔ اس میں تمہارے جسم کی بو ہے۔ تم بے شک سانپ مجھ پر پھینک دو۔“

میں پاروتی کی طرف بڑھا تو اس نے سانپ مجھ پر پھینک دیا۔ سانپ میرے سینے سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ میں نے رد مال اس کی طرف کر دیا۔ سانپ اسی وقت کندلی مار کر ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”یہ دیکھو۔ یہ تمہارے جسم کی بو کا کرشمہ ہے کہ سانپ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم پاروتی ہو۔ راج گرو نے تم پر جادو کر کے تمہاری یادداشت غائب کر دی ہے۔“

مگر پاروتی پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اس کے لیے بالکل اجنبی بن چکا تھا۔ اس نے سانپ کو جھک کر پکڑ لیا اور بولی۔

”تم کوئی مکار سپیرے ہو۔ یہ میرا رد مال نہیں ہے۔ تم نے اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ہے جس کی وجہ سے سانپ تمہارے آگے جھک گیا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو راج گرو پجاری تمہیں جلا کر رکھ



کر دے گا۔

میں نے سوچا پاروتی کو اس حالت میں قائل کرنے کی کوشش کرنا بیکار وقت ضائع کرنے اور حالات کو مزید خطرناک بنانے کے مترادف ہوگا۔ مجھے کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہیے۔ میں نے رومال جیب میں رکھ لیا اور پاروتی سے کہا۔

”شکر کرنا دیوی جی! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں تمہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھا تھا۔ اصل میں تمہاری شکل میری دوست پاروتی سے بہت ملتی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں اٹنے پاؤں گچھا سے نکل گیا۔ باہر آ کر میں نے ساری بات کاچگی کو سنائی۔ وہ کہنے لگی۔

”میں جانتی تھی کہ تم راج گرو کے منتر کا توڑ نہیں کر سکو گے۔“

میں نے کہا۔ ”کاچگی! مجھے کوئی ترکیب بتاؤ جس سے میری دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے اور میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں۔“

کاچگی نے کہا۔ ”مہاراج! کیا آپ کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں ہے جس سے آپ کی دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”اگر میرے پاس کوئی ایسا منتر ہوتا تو میں تمہیں کیوں کہتا۔“

کاچگی خچروں کی رسی کھولنے لگی۔

”مہاراج! اس وقت یہاں سے چلے چلیں۔ مندر میں جا کر کچھ سوچیں گے۔ پیچھے بچاری راج گرو کو پیہ چل گیا کہ مین غائب ہوں تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔“

ہم خچروں پر سوار ہو گئے اور برفانی راستوں سے ہوتے ہوئے مندر واپس آ گئے۔ دوسرا دن بھی گزر

گیا۔ میں اس کے مکان پر ہی رہا۔ رات کو وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تو کچھ پریشان تھی۔ کہنے لگی۔

”راج گرو تمہاری دیوداسی کو ناگن بنا کر اپنے ساتھ ناگ پور لے جا رہا ہے جہاں وہ پاروتی کی مدد سے بڑے مندر میں جمع کیا ہوا سارو ناگ لکوا کر اپنے قبضے میں لے گا۔ اس طرح وہ آگے ترچنا پٹی کے ناگ مندر میں جا کر وہاں بھی جتنا سونا اور ہیرے جو اہرات ہیں وہ اپنے قبضے میں کر لے گا۔ یہ مہیا پاپ ہے۔ میں یہ پاپ نہیں ہونے دوں گی۔“

مجھے ناگ مندر یا ترچنا پٹی کے مندروں کے سونے اور ہیرے جو اہرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان مندروں کے خزانے چاہے چور لے جائیں یا راج گرو لے جائے۔ میں تو صرف پاروتی کو وہاں سے کسی طرح نکال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ

شہر جا کر اس کا علاج کرواؤں کہ شاید اس کی یادداشت واپس آ جائے۔ اس وقت کاچگی بھی پاروتی کو وہاں سے فرار کرانے میں میری مدد کرنے پر مجبور تھی۔ اسے

یہ دھتھا کہ اگر ان مندروں کا سارا خزانہ راج گرو نکال کر لے گیا تو دیوتا اس سے ناراض ہو کر اسے بد دعا دیں گے کہ اس نے یہ یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ راج گرو بچاری ان مندروں کا خزانہ چرانے والا ہے اس کو روکنے کا کوئی جتن نہیں کیا۔ میں نے کاچگی سے کہا۔

”اب تو پاروتی دیوداسی کا یہاں سے غائب کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

کاچگی سخت پریشان تھی کہنے لگی۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ بچاری دولت کی بوس میں پاگل ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ان مندروں کی دولت کو نہ بچایا تو مجھ کو دیوتاؤں کی بد دعا لگ جائے گی۔“

میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں نے کہا۔

”تو پھر پاروتی کو غائب کرنے کی کوئی ترکیب سوچو۔ اس کو ہوش میں ہم نکال کر نہیں لے جاسکتے۔ اسے کسی طرح بے ہوش کرنا پڑے گا اور یہ کام تم کر سکتی ہو۔“ کاچگی کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

”ناگ دیوداسی پاروتی کے لیے رات کا کھانا لے کر جاتی ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ ملائے ٹی کوشش کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اس سے کیا ہوگا؟“

کاچگی بولی۔ ”میں اس کے ساتھ مل کر پاروتی کے کھانے میں ایک ایسا سفوف ملا دوں گی جس کے بعد وہ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو تم ناگ دیوداسی کو اپنے ساتھ ملائے بغیر بھی کر سکتی ہو۔ اس کو اعتنا میں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس نے راج گرو کو بتا دیا اور وہ کھانا پاروتی کو نہ دیا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“

کاچگی غور کرنے لگی۔ بولی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ کام میں ناگ کا کو بتائے بغیر بھی کر سکتی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”راج گرو پاروتی کو یہاں سے ناگ پور کب لے جانے والا ہے؟“

اس نے بتایا کہ پرسوں رات کو وہ اسے لے کر یہاں سے نکل جائے گا۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم وہ سفوف تیار رکھو۔ کل رات ہوتے ہی جب ناگ پاروتی کے لیے کھانا لے کر جائے تو موقع پا کر کھانے میں سفوف ملا دینا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکل کر کچھ پینچ جائیں گے اور بے ہوش پاروتی کو اٹھا کر فرار ہو جائیں گے۔“

کاچگی کہنے لگی۔

”ہاں تمہارے ساتھ مجھے بھی یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیونکہ بچاری کو ضرور میری سازش کا

پتہ چل جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

ہم نے سارا پروگرام طے کر لیا۔ ایک فالتو خچر اضطبل میں پہلے سے تیار کر لیا۔ اس پر دو کھل بھی ڈال دیئے۔ رات کو کاچگی نے مجھے آ کر یہ خوش خبری سنائی کہ ناگ کھانا لے کر پاروتی کی گچھا میں چلی گئی ہے اور اس نے کھانے میں بے ہوشی کا سفوف ملا دیا ہے۔

میں نے پوچھا۔

”مجھے یہ بتاؤ کہ اس سفوف کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ پاروتی دو تین گھنٹوں کے بعد ہی ہوش میں آ جائے۔ ہم راستے میں ہوں گے۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ شور مچا کر بھاگ جائے گی اور واپس راج گرو کے پاس پہنچ جائے گی۔“

کاچگی نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ بے ہوشی کے سفوف کا اثر ساری رات اور سارا دن رہے گا۔ اتنی دیر میں ہم ان پہاڑیوں سے نکل کر نیچے کسی شہر یا قصبے میں پہنچ گئے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”تم سفوف اپنے پاس ہی رکھنا۔ اگر راستے میں پاروتی کو ہوش آنے لگا تو ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر اس کے حلق میں نیکادیں گے۔“

کاچگی بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میں بے ہوشی کا سفوف اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ ایسا کرو تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں سفوف کی ڈبی لے کر ابھی آتی ہوں۔“

کاچگی چلی گئی تھوڑی دیر بعد آئی اور کہا۔

”میں سفوف کی ڈبی لے آئی ہوں۔ چلو اب اوپر گچھا کی طرف چلتے ہیں۔“

کیلاش پر بت سے یہ میرے فرار کی رات تھی۔ ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر اوپر گچھا کی طرف



چل پڑے ایک خالی خچر ہمارے ساتھ تھا جس پر ہمیں بے ہوش پاروتی کو ڈال کر لے جانا تھا۔ جب ہم گھبراہٹ میں پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کانچی نے یہاں پہنچ کر راستہ تبدیل کر دیا۔ کہنے لگی۔

”صبح کو اگر پجاری کو ہمارے فرار کا پتہ چل بھی گیا اور وہ ہمارے پیچھے آیا تو جس راستے پر اب میں تمہیں لے جا رہی ہوں اس طرف وہ کبھی نہیں آئے گا۔“

یہ نیا پہاڑی راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ جگہ جگہ گھاٹیاں اور خشک نالے تھے۔ خچر آہستہ آہستہ سنبھل کر چل رہے تھے۔ راستے میں ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر میٹھی روٹی سے ناشتہ کیا۔ پاروتی کو ہم نے وہیں پتھروں پر لٹا دیا تھا۔ وہ بالکل بے ہوش تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

”کانچی! تمہارے خیال میں ہمیں اسے کہاں لے جانا چاہیے جہاں اس کا علاج بھی ہو سکے اور اس کی یادداشت واپس آ جائے۔“

کانچی کہنے لگی۔

”نیچے بیردج میں ایک بوڑھا سپیرا رہتا ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ وہ تبت میں دالائی لامہ کا علاج بھی کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ناگن دیوی کو ٹھیک کر دے گا۔“

مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

”تو پھر چلو ہم اسی بوڑھے کے پاس چلتے ہیں۔“

”میں نے اسی کے پاس جانے کا سوچ رکھا تھا ایک بار ناگن دیوی کی یادداشت واپس آ گئی تو پجاری کے منتر کا اثر اپنے آپ اتر جائے گا اور مندروں میں دیوتاؤں کے خزانے محفوظ ہو جائیں گے۔“

ناشتہ کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے۔ اسی طرح نئے اور دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کرتے کرتے ہم شام کے وقت بیردج پہنچ گئے۔

”تم یہاں خچروں کو لے کر ایک طرف کھڑے رہو۔ میں گھبراہٹ میں جا کر صورت حال کا پتہ کرتی ہوں۔“

میں وہیں خچروں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کانچی برف پوش پہاڑیوں کے درمیان جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

”ناگن دیوی بے ہوش پڑی ہے جلدی سے خچر لے آؤ۔“

میں خچر کی باگ پکڑ کر کانچی کے پیچھے پیچھے گھبراہٹ کے شگاف کے پاس آیا۔ خچر کو باہر چھوڑا اور ہم دونوں گھبراہٹ میں آگئے۔ دیکھا کہ چراغ جل رہا تھا اور پاروتی بے ہوش پڑی تھی۔ ہم اسے اٹھا کر باہر لے آئے۔ اسے خچر پر بڑے آرام سے اس طرح بٹھا دیا جیسے وہ ہوش میں ہو اور خود بخود چلی ہوگی۔ کانچی نے کہا۔

”مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ یہ راستے میں گر پڑے گی۔“

اس کا خیال ٹھیک ہے۔ کانچی بے ہوش پاروتی کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس نے اسے ایک ہاتھ سے تھام کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں خچر کی باگ تھام لی۔ میں دوسرے خچر پر بیٹھ گیا۔ تیسرے خالی خچر کو ہم نے وہیں چھوڑنے کی بجائے ساتھ ہی لے لیا اور یوں ہمارا قافلہ کیلاش پر بت کی پہاڑیوں سے نیچے کی طرف چل پڑا۔

بانی ساری رات ہم برفانی راستوں پر چلتے رہے۔ صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو ہم کافی نیچے اتر

گئے۔ کانچی وہاں سے مجھے سیدھا بوڑھے تپتی کے گھر لے گئی۔

ایک چھوٹی سی جھاری سفید داڑھی والا بوڑھا اپنی کونھری میں صدف پر لیمپ جلائے بیٹھا کوئی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آگے جائے کی چینک اور پیالی پڑی تھی۔ اس نے کانچی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
”بیٹی! بہت دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی۔ کی تلاش پر بت سے کب آئی ہو؟ یہ کون ہے؟ اور یہ بے ہوش لڑکی کون ہے؟“

کانچی نے بوڑھے تپتی سے میرا تعارف کرایا پھر پاروتی کے متعلق اسے سارا قصہ بیان کر دیا۔ بوڑھے نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پاروتی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر اس کی آنکھیں کھول کر غور سے ان کا معائنہ کیا اور بولا۔

”اس پر تیارے پجاری نے سنگری منتر پڑھا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتانا ہوں۔“

بوڑھے نے پاروتی کی پتیلی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور اونچی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ تین چار منٹ تک وہ منتر پڑھتا رہا اس کے بعد اس نے بے ہوش پاروتی کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولا۔

”سنگری! سنگری! میں تاجی کالا مہوں۔ تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔“

اس کے ساتھ ہی پاروتی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ جیسے کوئی بات کہہ رہی ہو۔ بوڑھے نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ اپنا کان لگا دیا۔ وہ کچھ سن رہا تھا۔ کان پیچھے ہٹا کر بوڑھے نے کانچی کی طرف دیکھا اور بولا۔

”کانچی بیٹی! سنگری نے کہا ہے کہ میں اس عورت کا جسم چھو کر جاری ہوں مگر اس کو اپنی پچھلی زندگی کی باتیں یاد نہیں آسکیں گی۔“  
میں نے کہا۔ ”بابا! اس کا کیا فائدہ ہوا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اس کی یادداشت واپس آجائے۔“  
بوڑھے نے کہا۔

”یہ بات شاید تم دونوں کو معلوم نہیں کہ سنگری پر جو منتر پھونکا گیا تھا وہ آتش ناگ کا منتر تھا۔ سنگری اسی منتر کی آتش دیوی ہے۔ ایک سال کے بعد اس منتر کی آگ نے اس عورت کو جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ میرے کہنے سے سنگری اس کے جسم سے نکل گئی ہے۔ اب اس عورت پر منتر کی آگ حرام ہو گئی ہے۔ اس کی یادداشت واپس لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہوش میں آنے کے بعد تم لوگوں کو بھی نہیں پہچانے گی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ اس پر راج گرو پجاری نے منتر پھونکا تھا اور یہ اس کے پاس رہ رہی تھی۔“

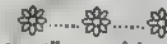
یہ ایک اچھی بات تھی مگر میں پاروتی کی یادداشت واپس لانا چاہتا تھا۔ میں اسے پھر سے پاروتی کی حالت میں نازل دیکھنا چاہتا تھا۔ کانچی نے بوڑھے سے پوچھا۔

”بابا! کیا کسی طریقے سے اس عورت کی یادداشت بھی واپس آسکتی ہے؟“  
بوڑھے نے کہا۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔“

اس نے صندوق میں سے ایک پرانی کتاب نکالی اور لیمپ کی روشنی میں اس کے ورق الٹنے شروع کیے۔ ایک جگہ اس نے انگلی رکھ کر کچھ سطریں غور سے پڑھیں اور بولا۔

”ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔“  
”وہ کیا ہے بابا؟“ کانچی نے جلدی سے پوچھا۔

بوڑھے تپتی نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بولا۔  
”اس عورت کو لے کر بنارس شہر جاؤ وہاں پتر ویدی نام کا ایک پنڈت رہتا ہے۔ وہ سنگری منتر کا توڑ جانتا ہے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو اس عورت کو وہی پنڈت ٹھیک کر سکتا ہے۔“  
ہم نے وہ رات وہاں رہنے کی بجائے بیرون گج سے ریل گاڑی پکڑی اور بنارس کی طرف روانہ ہو گئے۔



ریل گاڑی گورکھ پور پہنچی تو پاروتی کو ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی شور مچا دے گی کہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟ میں پجاری راج گرو کی دای ہوں۔ مجھے اس کے پاس پہنچاؤ۔ اس طرح لوگ اکٹھے ہو جاتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ایک عورت کو فحوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے اور میں ایک نئی مصیبت میں پھنسن جاتا مگر ایک عجیب بات ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی پاروتی نے آنکھیں کھول کر پہلے مجھے دیکھا۔ پھر کانچی کو دیکھا۔ پھر گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافر دل کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے پیاس لگی ہے۔“  
کانچی نے اس وقت تھیلے میں سے پینٹی روٹی نکال کر اسے دی۔ ایک مسافر کی صراحی میں سے پانی پیالے میں ڈال کر اسے دیا۔ پاروتی بڑے آرام سے روٹی کھانے لگی۔ میں اسے غور دیکھ رہا تھا۔ پاروتی کی اب پجاری راج گرو والی یادیں بھی اس کے ذہن سے غائب ہو گئی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ پجاری کے پاس اوپر گچھا میں رہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ مجھے بالکل ایک نئی عورت لگ رہی تھی جس کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ روٹی کھانے کے بعد پاروتی نے

پانی پیا اور بولی۔

”مجھے خینما رہی ہے۔“

اور وہ جہاں پہلے لیٹی ہوئی تھی وہیں لیٹ گئی اور سو گئی۔ کانچی کہنے لگی۔

”یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ اسے مکار پجاری راج گرو بھی یاد نہیں رہا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اس کی زندگی سنگری منتر کی آگ سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس کی پجاری نے یہی سوچا تھا کہ جتنا عرصہ میں اس کی مدد سے مندروں اور خزانوں کی دولت سمیٹ سکتا ہوں سمیٹ لوں اس کے بعد اگر سنگری منتر کی وجہ سے اس کا جسم جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو بے شک راکھ ہو جائے۔“

کانچی کہنے لگی۔ ”اب بھگوان کرے کہ بنارس والا پنڈت اس کو ٹھیک کر دے۔ اس کی پرانی یادداشت واپس آجائے۔“

میں نے کہا۔ ”اور یہ پجاری کو بھی بھول جائے۔“  
”پرانی یادداشت واپس آگئی تو پجاری کو یہ اپنے آپ بھول چکی ہوگی۔“

کانچی نے یہ کہہ کر پاروتی کی طرف غور سے دیکھا پھر کہنے لگی۔

”تم پہلے سنگری بنارس گئے ہو؟“  
میں نے کہا۔ ”شہر کے اندر کبھی نہیں گیا۔ ریل گاڑی میں ایک بار شہر کے قریب سے گزرنا ضرور تھا۔“  
کانچی بولی۔ ”میں نے بنارس میں ایک سال گزارا ہے۔ میں اس شہر کے سارے گلی کوچوں سے واقف ہوں۔ یہ پنڈت پتر ویدی ضرور کوئی مشہور پنڈت ہوگا۔ بنارس شہر میں ایسے پنڈتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہاں سے ہمیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا۔“  
میں اس اعتبار سے مطمئن ہو گیا تھا کہ پاروتی کو

ہوش آ گیا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد وہ مکار  
پجاری کی ساری یادیں بھول چکی ہے۔ ورنہ وہ شور مچا  
کر ہم سب کو حوالات میں بند کر سکتی تھی۔ یہ بہت ہی  
 سخت مرحلہ تھا جو آسانی سے گزر گیا تھا۔  
 اس کے لیے میں آج بھی جبکہ میں پاروتی ناگن  
 کی کہانی لکھ رہا ہوں اس بوڑھے مٹی کا شکر گزار  
 ہوں۔

گورکھپور سے ہم نے ٹرین بدلی اور بنارس جانے  
 والی ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس دوران پاروتی  
 جاگ پڑی تھی اور چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھی خالی  
 خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتی  
 تھی۔ اس کے لیے سارا ماحول اجنبی تھا۔ وہ کوئی بات  
 بھی نہیں کرتی تھی۔ جس وقت بات کرنے کی بہت  
 سخت ضرورت ہوتی تو صرف ایک بات کرتی اور  
 خاموش ہو جاتی۔ جب ہم گورکھپور کے اسٹیشن پر  
 بنارس جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے پاروتی  
 سے کہا۔

”پاروتی! کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟“

وہ میری طرف خالی خالی نظروں سے نکلنے لگی۔  
 میں نے اسے مامی کے کئی ایک واقعات یاد دلائے۔  
 مگر پاروتی کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ ابھرا۔ اس کا  
 چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی  
 تو وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے  
 میری کوئی بات نہ سنی ہو۔ کالجی نے مجھے آنکھ کے  
 اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور میں نے اس کے  
 بعد پاروتی سے کوئی بات نہ کی۔

ٹرین دوپہر کے بعد بنارس پہنچی۔ پاروتی جاگ  
 رہی تھی۔ اس نے نہ مجھ سے پوچھا نہ کالجی سے پوچھا  
 کہ یہ کونسا شہر ہے۔ ہمارے ساتھ خاموشی سے ڈبے  
 سے اتر کر اسٹیشن سے باہر آ گئی۔ وہ اپنے آپ

ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ  
 کہیں وہ بھاگ نہ جائے لیکن بھاگنا تو دور کی بات  
 ہے وہ ہم سے الگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ کالجی کے  
 ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ کالجی نے ایک دو بار اس  
 سے بات بھی کی لیکن پاروتی نے کوئی جواب نہ دیا  
 بنارس پہنچنے کے بعد کالجی ہمیں ایک محلے میں  
 لے گئی جس کی ایک تنگ سی گلی میں اس کی ایک سہیلی  
 رہتی تھی۔ وہاں ہم تھوڑی دیر ٹھہرے۔ کالجی نے اس  
 سے پنڈت چتر ویدی کے بارے میں پوچھا۔ اس کی  
 سہیلی نے کہا۔

”یہ پنڈت تو سانپوں کے ساتھ رہتا ہے۔ تم اس  
 کے پاس کیوں جا رہی ہو؟“

کالجی نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ اس کو بیمار  
 لگ گئی ہے یا کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ یہ کسی  
 نہیں پہچانتی۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔ پنڈت  
 سے ہم اس کا علاج کرائے آئے ہیں۔“

کالجی کی سہیلی نے بڑے غور سے پاروتی کو دیکھا  
 اور کہا۔

”یہ پنڈت شہر سے باہر دریا کی ساتویں گھاٹ  
 کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔ وہ کسی سے ملتا  
 جلتا نہیں۔ بس جھونپڑی میں ہی سارا دن گزار دیتا  
 ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ رات کے اندھیرے میں دریا  
 پر جاتا ہے اور ٹانگ دریا میں کھڑی کر کے کوئی چلہ کاٹتا  
 ہے۔“

میرے لیے یہ باتیں کوئی اتوکی نہیں تھیں۔

بھارت میں میں نے تقریباً ہر ساڑھو جوگی منیابی کو اس  
 قسم کی واہیات حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ کالجی کو بھی  
 کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے سے  
 پہلے پہلے ہم پاروتی کو لے کر دریا گنگا کے ساتویں

گھاٹ پر آ گئے۔ بنارس کے باہر دریائے گنگا کے  
 کنارے کئی گھاٹ ہیں۔ ہر گھاٹ کو کسی نہ کسی جوگی  
 نے سنبھال رکھا ہے وہیں ضعیف الاعتقاد ہندو مرد اور  
 عورتیں اس جوگی کے پاس آ کر اس کو اپنی دنیاوی  
 مشکلات بیان کرتی ہیں اور جوگی ان سے روپے پیسے  
 لے کر ان کی مشکلات کے اٹھے سیدھے حل بتا دیتا  
 ہے جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اگر ان میں سے کسی  
 ایک عورت یا مرد کی مشکل اس کی اپنی کوشش کے نتیجے  
 میں حل ہو جاتی ہے تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ جوگی ساڑھو کی  
 وجہ سے اس کی مشکل آسان ہوئی ہے اور یوں جوگی کی  
 مشہوری ہوتی رہتی ہے۔

ساتواں گھاٹ دریا کے جنوب میں درختوں کے  
 ایک جھنڈ کے قریب تھا۔ ان درختوں میں ہمیں ایک  
 جھونپڑی نظر آئی۔ کالجی نے کہا۔

”ضرور یہی پنڈت جی کی جھونپڑی ہوگی۔ چلو  
 چل کر پیٹہ کرتے ہیں۔“

پاروتی خاموش کھڑکیوں ہماری باتیں سن رہی تھی  
 جیسے اسے ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔  
 جیسے ہم کسی ایسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں جو اس  
 کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہم جھونپڑی کی طرف آ گئے۔  
 یہاں ایک بوڑھا ہمیں دریا کی طرف جاتا ملا۔ کالجی  
 نے اس سے پوچھا۔

”بابا! پنڈت چتر ویدی کی جھونپڑی یہی ہے؟“  
 بوڑھے نے کان کو ہاتھ لگا کر کہا۔  
 ”یہی ہے۔“

اور یوں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے نکل گیا  
 جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ پنڈت کی جھونپڑی کے  
 آگے ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں  
 تھا۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔  
 ”پنڈت جی پر نام!“

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بار  
 آواز دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے کالجی  
 سے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے پنڈت جی اندر نہیں ہیں۔“  
 اب کالجی نے آواز دی تو اندر سے کسی نے غصیلی  
 آواز میں جھڑک کر کہا۔

”کون ہو تم جو مجھے تنگ کرنے آ گئے ہو۔ چلے جاؤ  
 یہاں سے۔“

میں نے کہا۔ ”پنڈت جی! ہم بڑی دور سے آپ  
 کے درشن کئے ہیں۔“

کالجی نے بھی کہا۔ ”گورو دیو! ہم کیلاش پر بنت  
 سے چل کر آئے ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد پنڈت  
 جی کی آواز آئی۔

”آ جاؤ اندر۔“

میں کالجی اور پاروتی پردہ ہٹا کر جھونپڑی میں داخل  
 ہو گئے۔ جھونپڑی میں لوہان جل رہا تھا۔ ایک طرف  
 سانپوں کی بناریاں قطار میں پڑی تھیں۔ ایک مونا  
 تازہ بھاری توند والا آدی صرف دھولی باندھے شانوں  
 پر گرم چادر ڈالے چوڑی مار کر اس طرح بیٹھا تھا جیسے  
 گھیاں دھیان میں مصروف ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ  
 ہو رہی تھیں۔ رنگ گہرا سا نولا تھا۔ بال شانوں پر  
 بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پنڈت چتر ویدی تھا۔ اس  
 نے ہماری طرف بے نیازی سے دیکھا۔ ہاتھ سے  
 بیٹھے کا اشارہ کیا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے پاروتی  
 کی طرف دیکھا۔ وہ یوں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی  
 جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پنڈت نے پوچھا۔

”کس لیے آئے ہو۔ جلدی بتاؤ۔“

کالجی نے بات شروع کی۔ اس نے پنڈت کو بتایا



میں ایسے خیال دل میں مت لاؤ۔ اس کی شہرت ایسی نہیں ہے۔“

اسی آنکھوں میں رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ گھاٹ پر بھی خاموشی طاری تھی۔ دریا کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں دریا کے دوسرے کنارے پر بنارس شہر کے مکانوں کی روشنیاں کہیں کہیں جھللا رہی تھیں۔ ان کا عکس بھی دریا کے پانی میں جھللا رہا تھا۔

جب آسمان پر پچھلے پہر کی نیلی روشنی پھیلنے لگی تو مجھ سے ندر ہا گیا۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”مجھے مت روکنا۔ میں پاروتی کو دیکھنے جھوپڑی میں جا رہا ہوں۔“

اور میں اٹھ کر تیز تیز قدموں سے جھوپڑی کی طرف چلنے لگا۔ کاچی بھی میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ مجھے روک رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور جھوپڑی کے پاس جاتے ہی ٹاٹ کا پردہ اٹھا دیا۔ جھوپڑی خالی پڑی تھی۔ دیا جل رہا تھا۔ تھالی میں لوبان سلگ سلگ کر تھم ہو گیا تھا۔ ذرا نہ پنڈت تھا اور نہ پاروتی..... میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

”کاچی! جھوپڑی خالی ہے۔ تمہارا رشی مٹی پنڈت پاروتی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔“

کاچی بھی جھوپڑی میں آگئی۔ حیران نظروں سے خالی جھوپڑی کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور باہر چلے کر رہا ہوگا۔“

ہم نے دیکھا کہ جھوپڑی کی عقیں دیوار کا گھاس پھوس ایک جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ میں نے پنڈت کو گالی دے کر کاچی سے کہا۔

”وہ یہاں سے پاروتی کو بھاگ کر لے گیا ہے سامنے سے اس لیے نہیں گیا کہ ہم اسے دیکھ لیں گے۔“

ہم دیوار کے شکاف میں سے نکل کر جھوپڑی کی دوسری طرف آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں وہاں گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی کو دو تین آوازیں دیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ پاروتی میری آواز کا جواب نہیں دے گی لیکن میں سخت غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”وہ حرا پنڈت زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

کاچی بھی حیران و پریشان تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ جھوپڑی کے پیچھے اندھیرے میں کہیں کہیں درخت تھے۔ دور شاید سڑک کی بنیاں تھیں جو روشن تھیں۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”وہ کوئی سڑک معلوم ہوتی ہے۔ جلدی سداؤ۔“

ہم تیز تیز چلتے درختوں اور اونچے نیچے پلوں سے گزرتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں سخت طیش کی حالت میں تھا کہ پنڈت کہیں مل جائے تو میں اس کی گردن اتار دوں۔ مگر میں مجبور تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔

یہ ایک بس کی روشنیاں تھیں جو ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”اس بس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ پنڈت آگے گیا ہوگا۔“

بس میں مزدور پیشہ لوگ بیٹھے اوکھ رہے تھے۔ یہ بس صبح منہ اندھیرے مزدوروں کو لے کر کارخانوں کی طرف جا رہی تھی۔

کاچی نے کہا۔ ”نہیں نہیں۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

”بس بمشکل ایک دو سیکنڈ رکی اور آگے چل دی۔“

کاچی کہنے لگی۔

”ہمیں سب سے پہلے شہر چل کر پنڈت کو تلاش کرنا ہوگا۔ وہ اتنی جلدی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہمیں کیا معلوم کہ وہ پاروتی کو لے کر کہاں سے نکل پڑا ہے؟“

کاچی نے میرا بازو پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے دریا کے گھاٹ کی طرف چلنے لگی۔

”ہم شہر میں اپنی سہیلی کے پاس جا کر معلوم کرتے ہیں۔ اسے پنڈت کے ٹھکانوں کا ضرور علم ہوگا کہ وہ کہاں کہاں جا سکتا ہے؟“

ہم ایک گھاٹ پر ہشتی میں بیٹھ گئے۔ دریا پار کر کے بنارس شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کی گلیوں کے مندروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ لوگ پوجا پاٹھ کے لیے گھروں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑے تھے۔ کاچی کی سہیلی بھی جاگ رہی تھی۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ بدمعاش پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا ہے تو اسے یقین نہ آیا۔ کہنے لگی۔

”اس سے پہلے ہم نے پنڈت کے بارے میں ایسی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ آپ لوگوں کو ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ وہیں جا کر تلاش کرو۔ پنڈت دریا پر کہیں ہوگا۔“

جب میں نے اسے بتایا کہ پنڈت کی جھوپڑی کی عقیں دیوار میں شکاف پڑا ہوا ہے اور وہ وہیں سے پاروتی کو لے کر فرار ہوا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئی کہنے لگی۔

”ہم نے سنا ہے کہ پنڈت کبھی کبھی ناگ پور کے مہاناگ مندر میں یا تیرا کر نے جایا کرتا تھا۔ وہ ضرور

وہیں گیا ہوگا۔“

بھارت کے ملک میں اپنی آوارہ گردیوں اور جنگل جنگل شہر شہر پھرنے کے دوران مجھے کافی شہروں سے واقفیت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”ناگ پور تو یہاں سے بہت دور ہے۔“

کاچی کی سہیلی نے کہا۔

”میرا سن کہتا ہے کہ پنڈت ضرور پاروتی کو لے کر ناگ پور ہی گیا ہوگا۔ اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ کاچی نے پوچھا۔

اس کی سہیلی کہنے لگی۔

”ناگ پور کے مہاناگ مندر میں ایسی دیو داسیاں رکھی جاتی ہیں جو سانپوں کی پوجا کرتی ہیں۔ یہ دیو داسیاں مندر کے پجاری دوسرے شہروں سے عورتوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایسی عورتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔ مندر کا پجاری ایسی عورتوں کو بھاری رقم دے کر خرید بھی لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے پاروتی کو دیکھ کر پنڈت کے دل میں خیال آ گیا ہو کہ کیوں نہ اسے ناگ پور کے مندر میں لے جا کر فروخت کر دیا جائے۔“

کاچی کی سہیلی نے کوئی یقینی بات نہیں کہی تھی لیکن ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے کاچی کی سہیلی سے کہا۔

”کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ پنڈت یہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو؟“

اس کے جواب میں وہ عورت بولی۔

”کسی عورت کو اغوا کر کے وہ اس شہر میں کبھی نہیں رہے گا۔ میری مانو تم لوگ ناگ پور جاؤ۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔ اب یہ میں نہیں بتا سکتی کہ تمہاری پاروتی بھی اس کے پاس ہوگی یا نہیں؟“

کاچی کو بھی معلوم تھا کہ ناگ پور بنارس سے بہت دور ہے اور ہمارے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنی سیٹلی سے کچھ روپے ادھار مانگے تو وہ بولی۔

”میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ میں کسی کو ادھار بھی دے سکوں۔“

ہم ماپوس ہو گئے۔ اس کی سیٹلی نے کاچی سے کہا۔

”کاچی! تم تو مندر کی دیو داس ہو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ بھارت کی ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے سادھو جوگی اور جوگنوں سے کوئی ٹکٹ نہیں پوچھتا۔ تم لوگ جوگی جوگن بن کر ناگ پور کیوں نہیں جاتے؟“

کاچی کی سیٹلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ اس طریقے سے ہمارا حلیہ بھی بدل جاتا اور پنڈت اگر وہاں ہوا تو وہ ہمیں پہلی نظر میں پہچان کر فرار ہونے کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کاچی تمہاری سیٹلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا ہے۔ ہم جوگی جوگن بن کر سفر کریں گے۔ اس طرح پنڈت بھی ہمیں اتنی جلدی نہیں پہچان سکے گا۔“

کاچی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔“

کاچی کے گھر میں ہی ہم نے جوگی جوگنوں والا لباس پہن لیا۔ کاچی نے گہرے رنگ کی ساڑھی پہن لی۔ بال کھول لیے۔ گلے میں ریشموں کی مالا پہن لی۔ جب ہم کاچی کی سیٹلی کے گھر سے نکلے تو ان کا نکل آیا تھا۔ ہم دونوں جوگی اور جوگن بنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کرمنڈل تھے۔ میرے ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ ماتھے پر اکھیل کر کر لال تلک لگایا ہوا تھا۔

ہم وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں ایک بابو سے پوچھا کہ ناگ پور کو کونسی گاڑی جاتی ہے۔ اس نے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھ کر بتایا کہ ناگ پور کو گاڑی ایک گھنٹے بعد جائے گی۔ ٹکٹ ہم نے نہیں لیے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ کاچی کی سیٹلی نے بتایا تھا اور میرا بھی تجربہ تھا بھارت میں ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے فقیر جوگی سادھو اور اپنا پیٹا لوگ ٹکٹ نہیں خریدتے۔ انہیں ریلوے ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے پوچھتے اس پلیٹ فارم پر آ گئے جہاں سے ناگ پور جانے والی گاڑی فی چلتا تھا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔

گاڑی نے پیچھے ملکتے جبل پور سے آنا تھا۔ اپنے وقت پر گاڑی چمک چمک کرتی پلیٹ فارم میں داخل ہو کر رک گئی۔ وہاں شور مچ گیا۔ مسافروں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہم ایک ڈیپے میں داخل ہوئے۔ وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندو لوگ جوگی جوگنوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی بددعا نہ دے دیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جوگی کی بددعا بھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ کوئی جوگی کسی کے گھر چلا جائے تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہمیں کھڑے دیکھ کر دو مسافر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنی سیٹوں پر بٹھادیا۔ ہم بھی بڑے مزے سے بیٹھ گئے۔ ساہو اور جوگی لوگ ہندوستان میں ہر جگہ جاتے ہیں۔ اسی طرح گائے اور بیل بھی بھارت کے شہروں میں عام چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے ڈاڑھ بیل نظر آ جاتے تو لوگ فوراً اسے ذبح کر کے کھا جاتے۔ مگر ہندو لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ گائے کو گناتا اور بیل کو دشمنو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہندی بیل و طی

ہند میں ہندوؤں کا ایک دیوتا بھی مانا جاتا ہے جس کی پوجا ہوتی ہے۔

ٹرین چل پڑی۔ بالواسفر تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ان مسافروں کی وجہ سے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ ایک رات ایک دن اور پھر پوری ایک رات کا سفر تھا۔ دوسری رات کی صبح کو علوم ہوا کہ ناگ پور قریب آ رہا ہے۔ سارا راستہ مسافروں نے ہمیں خوب کھلایا لایا۔ پہلے مسافر اتر جاتے تو دوسرے مسافر آ کر ہماری خدمت شروع کر دیتے۔ آخر گاڑی ناگ پور پہنچ گئی۔ ناگ پور بھارت کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں کے ناگ پور سیٹلرے کسی زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ لیکن پاکستان کے کنوؤں نے اس کی شہرت ختم کر دی ہے۔ ہندو سکھ پاکستان آتے ہیں تو پاکستان کے کیونو سوغات کی طرح نوکروں میں بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں اور بھارت میں جا کر دوستوں رشتے داروں کو بطور تحفہ دیتے ہیں۔

ناگ پور کا اسٹیشن کافی وسیع تھا۔ شہر بھی کافی بڑا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو میں اور کاچی باہر آ گئے۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”اب ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں مہاناگ مندر کس جگہ پر ہے۔“

ہم نے اسٹیشن پر ہی معلوم کر لیا کہ مہاناگ مندر بھاگیری ندی کے دوسرے کنارے پر سرخ چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ ٹرین میں ہی مسافروں نے ہمیں زبردست ناشتہ وغیرہ کر دیا تھا۔ ہمیں بالکل بھوک نہیں تھی۔ ناگ پور میں رکشے چل رہے تھے۔ یہ سائیکل رکشے تھے۔ انھی وہاں موٹر رکشے نہیں آتے تھے۔ ہمارے پاس تھوڑے پیسے تھے۔ ہم نے ایک رکشے والے کو روک کر کہا کہ ہمیں مہاناگ مندر جانا ہے۔ کتنے پیسے لوگے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”مہاناگ! میں تو آپ کا سیوک ہوں۔ بیٹھے میں مندر لیے چلتا ہوں۔“

اس نے ہمیں ناگ مندر پہنچا دیا اور ایک پیسہ بھی نہ لیا۔ ہم نے دور سے ایک اونچی جگہ پر سرخ چٹانوں کے درمیان مندر کے کلس کو دیکھا تو وہیں اتر گئے۔ ہمارا ارادہ مندر کی کچھلی جانب سے داخل ہونے کا تھا۔ تاکہ اگر پنڈت مندر میں گیٹ کے پاس کہیں موجود ہو تو ہمیں نہ دیکھ لے۔ یہ جگہ غیر آباد تھی۔ سرخ چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین اونچی پتلی تھی۔ کہیں کہیں تار کے درخت بھی تھے۔ مندر کے ارد گرد اہلی کے کچھ درخت کھڑے تھے۔

مندر کے عقب میں ایک صحن تھا جہاں جگہ جگہ سانپوں کے بت بنا کر چھوٹے چھوٹے چبوترے پر رکھے ہوئے تھے۔ یاتری اور پوجا کرنے والے مرد اور عورتیں آ کر ان بتوں پر پھول چڑھاتیں اور ماتھا ٹیکتیں۔ سامنے مندر کا عقبی دروازہ تھا۔ دروازے کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کی سیڑھیوں پر مجھے کچھ عورتیں اور مرد نہاتے ہوئے نظر آئے۔ عورتوں نے باریک ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کیا خیال ہے ہمیں مندر میں داخل ہونا چاہیے یا باہر بیٹھ کر جائزہ لینا چاہیے؟“

کاچی بولی۔ ”میرا خیال ہے ہم یہاں ایک طرف تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔“

وہاں اور بھی کئی سادھو وغیرہ دھونی رما کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے دھونی تو نہ رما لی۔ بس دیے ہی ایک درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ تب کاچی کہنے لگی۔

”اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے۔ تم ٹھہرو



میں اندر جا کر حالات کا جائزہ لیتی ہوں۔“

مدد کر سکتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”مہاراج! اصلی چور کو میں جانتا ہوں۔ میں نے اسے چوری کرتے بھی دیکھا ہے۔ مگر میری بات کا کسی کو یقین نہیں آتا۔“

میں نے تعجب سے کہا۔

”کیسے پاگل آدمی ہو۔ اگر اصلی چور کو جانتے ہو اور تم نے اسے چوری کرتے بھی دیکھا ہے تو تمہارا دماغ کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ جا کر اسے کہو کہ اصلی چور کو گرفتار کر لے اور تمہارے بیٹے کو چھوڑ دے۔“

وہ آدمی بولا۔ ”مہاراج! اصلی چور ایک سانپ تھا۔ نیلے رنگ کا سانپ۔ اسے اب کون پکڑے گا۔ وہ تو چوری کر کے نکل گیا تھا۔“

میرے تھوڑے سے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

”اس نیلے سانپ نے کیا چیز چوری کی تھی؟ بھلا سانپ بھی کبھی چوری کرتا ہے؟“

اب اس آدمی نے مجھے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی۔ جس مال دار سینٹھ کے ہاں اس کا بیٹا ملازم تھا وہ شہر کا بڑا امیر آدمی تھا۔ اس کی ایک انگوٹھی تھی جس میں ایک انمول ہیرا اجڑا ہوا تھا۔ اس ہیرے کی قیمت کروڑوں روپے میں تھی۔ شہر ناگ پور میں اس ہیرے کا بڑا چرچا تھا۔ شہر میں سب کی زبان پر تھا کہ سینٹھ رام داس کی انگوٹھی میں ایک ایسا ہیرا اجڑا ہوا ہے جس کی قیمت

برطانیہ کا بادشاہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ وہ ہیرا آج تک کوئی چور یا چاکھی چوری نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ سینٹھ سارا دن انگوٹھی پہنے رکھتا تھا۔ صرف رات کے وقت

ہیرے والی انگوٹھی اتار کر اپنے کسی نوکر کے کوارٹر میں رکھ دیتا تھا کہ غریب نوکر کے بارے میں کون یقین کرے گا کہ اس کے پاس اتنی قیمتی انگوٹھی ہوگی۔ ایسا وہ

اس کے جانے کے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے ادھیڑ عمر مرد کے ساتھ میرے پاس آئی۔ دونوں نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ باری باری میرے پاؤں چھوئے اور میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے جوگی سمجھ کر آ گئے ہیں۔ میں نے بھی جوگیوں کے انداز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے بچہ۔ میرے پاس کس لیے آئے ہو؟“

مرد نے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کہا۔

”مہاراج! ہم پر بڑی پتا آن پڑی ہے۔ ہماری مدد کریں۔“

میں نے سوچا یہ خواہ مخواہ پتا سنا کر میرے کان کھائے گا میں خود پتا میں پڑا ہوا ہوں۔ میں نے اس سے چھڑکا حاصل کرنے کے لیے کہا۔

”جاؤ بابا جاؤ کسی دوسرے سادھو کو جا کر اپنی پتا سناؤ۔“

وہ بولا۔ ”مہاراج! میری پتا یہاں کوئی نہیں سنتا۔ جو سنتا ہے اسے یقین نہیں آتا۔“

مجھے تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہے تمہاری پتا؟“

وہ کہنے لگا۔

”مہاراج! امیر ایک ہی جوان بیٹا ہے۔ اس کا نام رامو ہے مہاراج۔ وہ شہر کے سب سے بڑے سینٹھ کی انگوٹھی میں ملازم تھا۔ سینٹھ نے اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر حوالات میں بند کروایا ہے۔ مہاراج میرا بیٹا بے گناہ ہے۔“

میں نے ہنسی سے کہا۔

”جا کر کسی وکیل سے بات کرو۔ میں تمہاری کیا

چوروں ڈاکوؤں کو دھوکا دینے کے لیے کرتا تھا۔ وہ ہیرے والی انگوٹھی باری باری اپنے گیارہ ملازموں کے کوارٹر میں چھپا دیتا تھا اور نوکروں کو اس نے خبردار کر رکھا تھا کہ اگر ان کے ہاں سے انگوٹھی چوری ہوئی تو وہ انہیں ساری عمر کے لیے جیل بھجوادے گا۔ ایسا وہ اس خیال سے کرتا تھا کہ اگر کسی نوکر کے دل میں خیال آجائے کہ وہ کسی چور ڈاکو کے ساتھ مل کر انگوٹھی چوری کر دے تو وہ اس ارادے سے باز رہے۔ اس کے ساتھ ہی سینٹھ نے کچھ بٹے کٹے پاؤی گاڑ ملازم رکھے ہوئے تھے جو رات کو کوارٹر کے باہر چھپ کر پہرہ دیتے تھے کہ کوئی چور انگوٹھی چرانے کے لیے وہاں نہ آجائے۔

اس آدمی نے داستان سناتے ہوئے کہا۔

”مہاراج! آج صبح صبح منیا اندھیرے کی بات کرتا ہوں۔ آج رات کو سینٹھ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہمارے کوارٹر میں رکھی گئی تھی۔ میرے بیٹے نے اسے گتے کی ایک ڈبلی میں بند کر کے اپنے سر ہانے کے پاس رکھ دیا تھا۔ اس رات ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ساری رات جاگ کر گزریں گے۔ میں میری بیوی اور میرا

اکھوتا بیٹا ہم ساری رات جاگتے رہے اور چوکی پر رکھی اس ڈبلی کی حفاظت کرتے رہے جس میں سینٹھ رام داس کی قیمتی انگوٹھی بند تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم اسے نکال کر دیکھ بھی لیتے تھے۔ جس وقت رات کا پچھلا پہر ہوا تو ایک عجیب بات ہوئی۔ میری بیوی سو گئی تھی۔ میں اور میرا بیٹا جاگ رہے تھے کوٹھری میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ ہیرے کی انگوٹھی والی ڈبلی چوکی پر ہمارے سامنے پڑی تھی کہ اچانک مجھے سر سر ہٹ کی آواز آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ پھر ملکی سی پھٹکار کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک نیلے رنگ کا لہسا سانپ پھن اٹھائے ہماری طرف بڑھ رہا

ہے۔ میں اور میرا بیٹا اٹھ کر پرے ہٹ گئے۔ میں نے بیٹے سے کہا۔ اسے مار ڈالو سانپ ہے وہ کوئی ڈنڈا وغیرہ تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں نیلے سانپ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلا۔ ہم ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ سانپ ہماری طرف آنے کی بجائے چوکی کی طرف گیا جس پر ہیرے کی انگوٹھی والی گتے کی ڈبلی پڑی تھی۔ سانپ نے ہمارے دیکھتے دیکھتے انگوٹھی والی ڈبلی کو منہ کھول کر پکڑا اور جھڑ سے آیا تھا ادھر کو واپس چلا گیا۔ ہم سہمے ہوئے سانپ کو تنکے ہی رہ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو ہم نے باہر نکل کر شور مچا دیا کہ سانپ سینٹھ صاحب کی انگوٹھی لے کر بھاگ گیا ہے۔ کوارٹر کے پاس سینٹھ کے جو خفیہ پاؤی گاڑ چھپے ہوئے تھے وہ بھی نکل آئے۔ کوارٹر کے دوسرے ملازم بھی جاگ پڑے۔ کسی نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مہاراج! یہ میری پتا ہے جو میں نے آپ کو سنائی۔ سینٹھ کو پتہ چلا تو اس نے میرے اکلوتے بیٹے کو حوالات میں بند کر دیا۔“

اپنی عجیب و غریب کہانی سنانے کے بعد وہ آدمی اور اس کی بیوی آنسو بہانے لگے۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ بھی اس کی بات پر یقین نہ کرتا اور یہی کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سینٹھ کی قیمتی انگوٹھی تم دونوں باپ بیٹے نے چرائی ہے لیکن میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ واردات ناگ پور شہر میں ہوئی تھی۔ پنڈت چتر ویدی پاروتی کو انخوا کر کے اسی شہر میں لایا تھا۔ پاروتی میں یہ طاقت تھی کہ یہ عورت سے ناگن بن جاتی تھی اور ناگن سے دوبارہ عورت کے روپ میں آ جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ناگن بنتی تھی یعنی سانپ کا روپ بدلتی تھی اس سانپ کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پنڈت سانپوں کے علم کا



ماہر ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس عورت پاروتی کو ہم اس کے پاس علاج کے لیے لے کر آئے ہیں اصل میں وہ بڑی طاقت والی عورت ہے مگر اس کی طاقت کچھ وقت کے لیے یادداشت کے ساتھ غائب ہوگئی ہے۔ پنڈت نے اپنے علم کے زور سے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ یہ عورت ناگن ہے اور ناگن کا روپ بدل سکتی ہے اور اس سے ناگن کے روپ میں بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسے اغوا کر کے ناگ پور لے آیا کیونکہ ناگ پور کا مہاناگ مندر اپنی دولت ہیرے جواہرات کے خزانے کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ پنڈت نے اسکیم بنائی ہوگی کہ وہ پاروتی کو اپنے خاص منٹروں کی مدد سے سانپ کے روپ میں بدل لے گا اور شہر میں کسی خفیہ جگہ ٹھکانہ بنا کر اس کے ذریعے ناگ مندر کے تمام قیمتی ہیرے جواہرات چوری کر لے گا۔ مہاناگ مندر کی دولت چرانے سے پہلے اس نے بطور امتحان پاروتی کو ناگن کے روپ میں سیٹھ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی چرانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ پنڈت نے معلوم کر لیا ہوگا کہ سیٹھ ہرات اپنی انگوٹھی کسی نوکر کے گھر میں رکھتا ہے اور آج رات وہ اپنی انگوٹھی اس بد نصیب آدمی کے کواڑ میں رکھنے والا ہے جو میرے پاس بیٹھا مجھے اپنی کہانی سنا کر آنسو بہا رہا تھا۔ چنانچہ پنڈت نے رات کے پچھلے پہر پاروتی ناگن کو سانپ کے روپ میں نوکر کے کواڑ میں بھیجا۔ سانپ انگوٹھی منہ میں ڈال کر پنڈت کے پاس لے گیا۔

واقعات کی کڑیاں آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی تھیں اور میرے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ بد معاش پنڈت اسی شہر میں کسی خفیہ جگہ پر موجود ہے۔ کم از کم وہ اس مندر میں نہیں ہے اور پاروتی ایک سانپ کی شکل میں اس کے پاس دی ہے۔ اس دوران کاچھی بھی

واپس آگئی۔ اس نے میرے پاس ایک بوڑھی عورت اور مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کوئی خاص خیال نہ کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

”میں نے سارا مندر چھان مارا ہے۔ وہ آدمی جس کی ہمیں تلاش ہے کہیں نہیں ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جس آدمی کی ہمیں تلاش ہے اس کا سراغ مل گیا ہے۔“

کاچھی حیرت سے مجھے تنگنے لگی۔

”کہاں ہے وہ؟“

”بیٹھو ہمیں سب کچھ بتانا ہوں۔“

کاچھی حیرت سے عورت بنی میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں کاچھی کو وہ ساری کہانی سنانے لگا جو مجھے اس بوڑھے آدمی نے سنائی تھی تو مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے سامنے مجھے پاروتی کے بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے دونوں بوڑھے میاں بیوی سے کہا۔

”تم سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہیں بلاؤں گا۔“

دونوں نے چارے میرے اور کاچھی کے پاؤں چھو کر اٹھے اور سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے جس طرح ان لوگوں کی چپتاسنی تھی اور جس قسم کے ان سے سوال پوچھتے تھے اس سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو امید پیدا ہوگئی تھی کہ میں ان کے دکھ کا علاج کر سکوں گا۔

تب میں نے نیلے سانپ کے ہیرے کی انگوٹھی چرا کر لے جانے کی ساری کہانی کاچھی کو بیان کر دی۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی کہنے لگی۔

”ہونہ ہو یہ تمہاری ناگن دیوی ہی سانپ کے

روپ میں انگوٹھی چرانے ان لوگوں کے کواڑ میں گئی پڑے۔“

کاچھی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔ مگر اس کو بھی دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مکار پنڈت کو اتنے بڑے شہر ناگ پور میں تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا اور اگر فرض کر لیا جائے اگر ہم اس کو ڈھونڈھ بھی لیتے ہیں تو وہ پاروتی ناگن کو جو یقیناً سانپ کے روپ میں ہوگی چھپا دے گا اور کبھی ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ اس لیے سب سے بہتر ترکیب یہی تھی کہ مکار پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے کاچھی سے کہا۔

”ہمیں کوئی ایسا سانپ حاصل کرنا ہوگا جس کی عمر دوسرے سانپوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔“

کاچھی کہنے لگی۔

”یہاں مہاناگ مندر میں بڑے بڑے پرانے سانپ ہیں چل کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہ کوئی بوڑھا سانپ مل جائے گا۔“

دونوں بوڑھے میاں بیوی کچھ فاصلے پر درخت کے نیچے بیٹھے ہمیں باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ کاچھی نے کہا۔

”ان دونوں کو تم نے کس لیے بٹھا رکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی بتانا ہوں۔“

میں نے اشارے سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو بلایا۔ وہ ہاتھ باندھے جلدی سے ہمارے پاس آ کر ادب سے بیٹھ گئے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”تم یہاں ٹھہرو۔ تم تمہارے ساتھ تمہارے کواڑ میں جا کر وہ جگہ دیکھیں گے جہاں سے نیلے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی چرائی تھی۔“

”جو حکم مہاراج!“

ہم دونوں میاں بیوی کو وہیں چھوڑ کر مہاناگ

روپ میں انگوٹھی چرانے ان لوگوں کے کواڑ میں گئی پڑے۔“

کاچھی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔ مگر اس کو بھی دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مکار پنڈت کو اتنے بڑے شہر ناگ پور میں تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا اور اگر فرض کر لیا جائے اگر ہم اس کو ڈھونڈھ بھی لیتے ہیں تو وہ پاروتی ناگن کو جو یقیناً سانپ کے روپ میں ہوگی چھپا دے گا اور کبھی ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ اس لیے سب سے بہتر ترکیب یہی تھی کہ مکار پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے کاچھی سے کہا۔

”ہمیں کوئی ایسا سانپ حاصل کرنا ہوگا جس کی عمر دوسرے سانپوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔“

کاچھی کہنے لگی۔

”یہاں مہاناگ مندر میں بڑے بڑے پرانے سانپ ہیں چل کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہ کوئی بوڑھا سانپ مل جائے گا۔“

دونوں بوڑھے میاں بیوی کچھ فاصلے پر درخت کے نیچے بیٹھے ہمیں باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ کاچھی نے کہا۔

”ان دونوں کو تم نے کس لیے بٹھا رکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی بتانا ہوں۔“

میں نے اشارے سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو بلایا۔ وہ ہاتھ باندھے جلدی سے ہمارے پاس آ کر ادب سے بیٹھ گئے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”تم یہاں ٹھہرو۔ تم تمہارے ساتھ تمہارے کواڑ میں جا کر وہ جگہ دیکھیں گے جہاں سے نیلے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی چرائی تھی۔“

”جو حکم مہاراج!“

ہم دونوں میاں بیوی کو وہیں چھوڑ کر مہاناگ

مندر کی طرف چلے۔ مندر میں یاتریوں اور پوجا کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ہم دونوں جوگیوں کے بھیس میں تھے۔ کاچی مجھے مندر کے پیچھے جو صحن تھا وہاں لے گئی۔ یہاں پتھروں کے سانپوں کے بڑے بڑے نمسے لگے تھے جن کے درمیان ہر قسم کے سانپ رینگ رہے تھے۔ کاچی کہنے لگی۔  
”مہاراج! تمہیں سانپ کچھ نہیں کہتے۔ تم کوئی سانپ جو راز زیادہ عمر کا ہو پکڑ لو۔ اگرچہ اس مندر کے سانپوں کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ کسی کو نہیں ڈستے مگر پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔“

پاروتی کا رومال میرے پاس تھا۔ میں ایک ایسی جگہ پر آ گیا جو ایک اونچے پتھری اوٹ میں تھی۔ یہاں قسم قسم کے رنگوں اور سائز کے سانپ ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔ میں نے ایک سانپ کو دیکھا جو سب سانپوں سے الگ چھوٹے سے پتھر کے پاس کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ مجھے یونہی محسوس ہوا کہ یہ سانپ باقی سارے سانپوں سے سمجھدار اور سنجیدہ سانپ ہے۔ یقیناً اس کی عمر بھی زیادہ ہوگی۔ اسی لیے یہ سب سے الگ بیٹھا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اچانک سانپ نے اپنی گردن اونچی کی۔ پھر ہلکی سی پھٹکار مار کر اپنا چھن کھول دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ سانپ نے آہستہ سے اپنا چھن میرے آگے کر کے جھکا دیا۔

سانپ نے ناگن پاروتی والے رومال کی بو محسوس کر لی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کو پکڑا اور اسے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کاچی دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔  
”یہ سانپ ٹھیک رہے گا ناں؟“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ ان سب سانپوں کا جوگی سانپ ہے۔ سب سے الگ گیان دھیان

میں لگا تھا۔ چلو اب دونوں میاں بیوی کے ساتھ ان کے گھر چلتے ہیں۔“  
سانپ کو میں نے کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ زیادہ لمبا سانپ نہیں تھا۔ ہم مندر کے صدر دروازے والے صحن میں درخت کے پاس آ گئے۔ دونوں اوپر عمر میاں بیوی ہمیں دیکھ کر ادب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔  
”چلو ہمیں اپنے کوارٹر میں لے چلو۔“

اس کا کوارٹر مہانگ مندر سے کوئی ایک میل فاصلے پر تھا۔ یہ شہر کے شمال کا علاقہ تھا۔ کھیتوں کے پاس غریبانہ سے سات کوارٹر تھے۔ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنے کوارٹر میں لے گئے اور کوشری میں دو چار پائی دکھائی جس کے پاس وہ چوکی پڑی تھی۔ چہاں سے سانپ نے ہیرے کی انگلی والی ڈبی اٹھا لی تھی۔

اس کوشری میں پاروتی کی بوا بھی تک موجود تھی۔ یہ ہمیں محسوس نہیں ہوا تھا مگر میری کلائی کے ساتھ لپٹے ہوئے سانپ کو فوراً محسوس ہو گیا۔ وہ میری کلائی سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سانپ کی یہ کیفیت دیکھ کر کاجی سے کہا۔  
”کاچی اس سانپ نے پاروتی کی بو محسوس کر لی ہے۔ یہ رومال والی بو کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔ کیونکہ پاروتی نیلے سانپ کے روپ میں پچھلی رات کو یہاں آئی تھی۔“

وہ بولی۔ ”تو پھر اپنا عمل شروع کر دو۔“  
میں نے سانپ کو نیچے چوکی کے پاس اتار دیا اور اس کی طرف ذرا سا جھک کر کہا۔  
”اگر تم میری زبان سمجھ رہے ہو تو سنو! یہاں تمہاری دیوی رات کو آئی تھی۔ یہاں اس کی بوتم نے سو گئی ہے۔ ہمیں اس کے پاس لے چلو۔“

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا لیکن مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ سانپ نے میرے الفاظ سمجھے ہوں گے۔ مگر میں حیران رہ گیا جب سانپ نے چوکی کے ساتھ اپنا منہ لگا دیا۔ جیسے وہ چوکی کو سونگھ رہا ہو۔ اس کے بعد کوشری کے صحن میں نکل گیا۔ میں اور کاچی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دونوں میاں بیوی پر میرے اس عمل کا بہت اثر ہوا۔ وہ ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنے کوارٹر میں ہی رہیں اور ہمارے ساتھ نہ آئیں۔

”سانپ ہمیں وہاں لے جا رہا ہے جہاں سیٹھ کے ہیرے کی انگلی چرانے والا سانپ رہتا ہے۔ ہم انگلی لے کر تمہارے پاس آ جائیں گے۔“  
دونوں میاں بیوی ہمیں دعا میں دیتے وہیں بیٹھ گئے۔ اس دوران سانپ کوارٹر کے صحن میں سے گزر کر باہر نکل چکا تھا۔ کاچی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا میں تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے پاس آ گیا۔ ہم نے دیکھا کہ سانپ کوارٹروں کے آگے جو کچا راستہ تھا اس کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ رات کو پاروتی نیلے سانپ کے روپ میں قیتی انگلی لے کر اسی راستے سے گزری تھی۔ ہمارا سانپ اسی راستے پر پاروتی کی بولیتا چلا جا رہا تھا۔

دوسرے کوارٹروں میں سے کچھ مرد و عورتیں اور بچے باہر نکل کر یہ تماشا دیکھنے لگے کہ ایک سانپ زمین پر رینگتا ہوا آگے جا رہا ہے اور ایک جوگی اور جوگن اس کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ سانپ ایک جگہ پہنچ کر کھیتوں میں اتر گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے کھیتوں میں اتر گئے۔ کچھ دور تک تماشا دیکھنے والے مرد اور بچے ہمارے ساتھ آئے پھر وہ واپس چلے گئے۔ اس وقت سانپ کھیتوں میں سے نکل کر ایک کھلے میدان میں آ گیا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ہم

بھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کاچی کہنے لگی۔  
”اب مجھے پورا وشواش ہے کہ یہ سانپ ہمیں ناگن دیوی کے پاس لے جائے گا۔“  
میں بھی بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

سانپ میدان میں سوکھی گھاس اور جھاڑیوں میں سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ میدان ختم ہوا تو سامنے ریلوے لائن آ گئی۔ سانپ ریلوے لائن پر چڑھ گیا۔ اس وقت ایک ٹرین ناگ پور ریلوے اسٹیشن کی طرف آ رہی تھی۔ انجن ڈرائیور نے لائن کے قریب نہیں دیکھ کر زور سے دبل دیا۔ سانپ ریل کی پٹری پر چڑھ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف جانا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ گاڑی کے نیچے نہ آ جائے۔ کیونکہ گاڑی بہت قریب آ گئی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم دونوں لائن پار کرتے۔ ہم دین ریلوے لائن سے چند قدم دور زمین پر بیٹھ گئے۔ ہماری نظرس ریل کی پٹری پر لگی تھیں۔ میں نے سانپ کو لائن کے اوپر سے بڑی تیزی سے گزرتے دیکھا۔ اتنے میں ٹرین آ گئی اور شور مچانی دھڑ دھڑاتی ہمارے سامنے سے گزرنے لگی۔ ریل گاڑی کے گزرتے ہی ہم نے دوڑ کر ریلوے لائن پار کی اور سانپ کو تلاش کرنے لگے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سانپ لائن کی دوسری طرف نیچے ایک جھاڑی کے پاس کنڈلی مار کر یوں بیٹھا تھا جیسے ہمارا انتظار کر رہا ہو۔

ہم اس کے قریب آئے تو وہ آگے چل پڑا۔ میں نے کاچی سے کہا۔  
”کاچی! لگتا ہے سانپ کو پتہ چل گیا ہے کہ ہمیں ناگن دیوی کی تلاش ہے۔“  
کاچی پہلے ہی تو ہم پرست تھی کہنے لگی۔



”مباراج! یہ سانپ ضرور کوئی رشی منی ہے۔ اس سے کوئی باپ ہو گیا ہوگا کہ اس نے سانپ کے روپ میں جنم لیا۔“

میں ان باتوں پر یقین رکھتا تھا نہ مجھے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ ہم سانپ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ سانپ کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ بھی بکھی وہ کسی جگہ رک جاتا۔ گردن اٹھا کر اپنی زبان بار بار باہر نکالتا۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سانپ اپنی زبان کے ذریعے فضا کو سونگھتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر آگے چل پڑتا۔ اسی طرح سانپ کے پیچھے پیچھے چلتے جب ہمیں گھنڈہ ڈبڑھ گھنڈہ گز رہا تو ہم تھک گئے۔ ہم ناگ پور شہر کے جنوب کی جانب کافی دور نکل آئے تھے۔ آہستہ آہستہ شہر ناگ پور کی آبائیاں پیچھے پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ کاچی بہت تھک گئی تھی۔ کہنے لگی۔

”سانپ کو پکڑلو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔“

میں نے آگے بڑھ کر سانپ کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ سانپ کو میں نے کالی کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ وہ اپنا سر اٹھائے منہ سامنے کی طرف کیے بار بار زبان باہر نکال رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے سامنے کی جانب سے پاروتی کی مسلسل بو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے وہ بد معاش پنڈت پاروتی کو لے کر شہر سے بہت دور نکل گیا ہے۔“

کاچی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”کہیں وہ اوتار گئے نہ نکل جائے؟“

مجھے بھی فکر لگی کہ اگر پنڈت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو ہماری ساری محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ دیا۔ سانپ تیزی سے آگے چل پڑا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ آگے ایک ندی آ گئی۔ ندی

پر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزر کر ندی پار کر گئے۔ آگے ایک میدان تھا۔ میدان میں کہیں کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہم میدان سے بھی گزر گئے۔ اس کے بعد ویران علاقہ شروع ہو گیا۔ ہماری بائیں جانب کچھ کارخانوں کی چیمیناں آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتی چلی گئیں۔ ایک کچا راستہ تھا جس پر کچھ آدی سائیکلوں پر سوار جا رہے تھے۔ ایک تیل گاڑی گزری۔ سانپ اس کے رستے کو پار گزرنے کے سامنے کی جانب جا رہا تھا۔ جدھر جھڑیاں تھیں اور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔

سانپ رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ زمین مکان تھے۔ سانپ ان کے قریب سے نکل گیا۔ ہمیں سانپ کے پیچھے پیچھے چلنے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک اوچی جگہ جیسے کسی نے بند باندھا ہوا ہو۔ اس کی دوسری جانب آئے تو دیکھا کہ سامنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ یہ وہی جھنڈ تھے جو ہمیں دور سے نظر آ رہے تھے۔ کاچی کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے آگے کوئی جنگل ہے۔“

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ناگ پور کے جنوب میں آگے جا کر گھنا جنگل آ جاتا تھا۔ یہ جنگل اس قدر گھنا اور ویران تھا کہ دن کے وقت بھی ادھر لکڑیاں کاٹنے والے چھ سات آدمیوں کی ٹولی بنا کر جاتے تھے کہ اگر کوئی جنگلی درندہ حملہ کر دے تو اس کا مقابلہ کر سکیں۔

سانپ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا تھا۔ کاچی کا سانس چلتے چلتے پھول گیا تھا۔ کہنے لگی۔

”سانپ کو روک لو۔ مجھ سے اب چلنا نہیں جاتا۔“

میں نے دوڑ کر سانپ کو زمین پر سے اٹھالیا۔ ہم ایک بار پھر وہیں بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ہم اونچے اونچے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس جنگل کے درختوں کی یہ پہلی نظر تھی۔ آگے اوچی اوچی جنگلی

جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کاچی کے چہرے پر فکر مندگی کے آثار تھے۔ کہنے لگی۔

”مجھے تو اس جنگل میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن سانپ اندر جا رہا ہے۔ مجھے تو اس کا پیچھا کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا کرتے ہیں۔ تم ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں سانپ کے ساتھ جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مکار پنڈت نے اس جنگل میں ہی کہیں ٹھکانہ بنایا ہوا ہوگا۔“

کاچی نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔

”نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی میں یہاں اکیلی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہاں مجھے بہت ڈر لگے گا۔“

دس پندرہ منٹ تک ہم وہاں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ دیا اور اس کے پیچھے چلنے لگے۔ آگے اوچی اوچی گھاس تھی۔ سانپ کو نگاہ میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمیں سانپ کے بالکل ساتھ لگ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ خطرہ تھا کہ سانپ ایک بار نظروں سے اوجھل ہو گیا تو گھنی گھاس میں وہ پھر دکھائی نہیں دے گا۔

ہم گھاس کو ادھر ادھر ہٹا کر سانپ پر نگاہ رکھے آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل میں عجیب و غریب دہشت ناک قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی درخت پر سے پرندے کی بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہم جنگل میں آگے جا رہے تھے جنگل زیادہ سنسان اور گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ کاچی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”کہیں یہ سانپ بھی ہمیں دھوکہ نہ دے رہا۔ کہیں یہ خود کو نہیں جھک گیا۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔ سانپ اس وقت سے بالکل سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔“

”تم پیچھے کیوں دیکھتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”مجھے ڈر ہے پیچھے سے کوئی شیر چیتا حملہ نہ کر دے۔“

اس کا ڈر خوف حق بجانب تھا۔ مجھے خود کسی وقت ڈر لگنے لگا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر پاچیتا نکل آیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو پتل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ ہم جنگل میں جب کالی دور نکل آئے تو اچانک سانپ رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر پھن کھول لیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے بار بار پھنکارنے لگا۔

سامنے اوچی اوچی جنگلی جھاڑیوں نے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کاچی! میرا خیال ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔“

میں نے سانپ کو اٹھالیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھاڑیوں کی دیوار کو ایک جگہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آگے ایک پرانا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے کسی حویلی کا بوسیدہ گھنڈر تھا۔ تالاب کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ کاچی بھی میرے پاس

ہے۔ اگر وہ جھک گیا ہوتا ہے پاروتی کی بونٹا رہی ہوتی تو سیدھا جانے کی بجائے ادھر ادھر دوڑ جاتا۔“

اوچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو پتھر کی زمین شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ہے ہو کر سانپ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ ایک دو اوچی اوچی چٹانوں کے قریب سے گزرے پھر ایسے درخت دیکھے کہ جن کی جڑیں زمین سے بارہ فٹ کی ہوئی تھیں۔ ان کی گھنی ٹہنیاں نیچے تک آ گئی تھیں۔ ان کے تنوں پر جنگلی سیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ڈر کے مارے بالکل میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پیچھے گردن پھیر کر دیکھ لی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”تم پیچھے کیوں دیکھتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”مجھے ڈر ہے پیچھے سے کوئی شیر چیتا حملہ نہ کر دے۔“

اس کا ڈر خوف حق بجانب تھا۔ مجھے خود کسی وقت ڈر لگنے لگا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر پاچیتا نکل آیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو پتل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ ہم جنگل میں جب کالی دور نکل آئے تو اچانک سانپ رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر پھن کھول لیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے بار بار پھنکارنے لگا۔

سامنے اوچی اوچی جنگلی جھاڑیوں نے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کاچی! میرا خیال ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔“

میں نے سانپ کو اٹھالیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھاڑیوں کی دیوار کو ایک جگہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آگے ایک پرانا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے کسی حویلی کا بوسیدہ گھنڈر تھا۔ تالاب کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ کاچی بھی میرے پاس

ہے۔ اگر وہ جھک گیا ہوتا ہے پاروتی کی بونٹا رہی ہوتی تو سیدھا جانے کی بجائے ادھر ادھر دوڑ جاتا۔“

اوچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو پتھر کی زمین شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ہے ہو کر سانپ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ ایک دو اوچی اوچی چٹانوں کے قریب سے گزرے پھر ایسے درخت دیکھے کہ جن کی جڑیں زمین سے بارہ فٹ کی ہوئی تھیں۔ ان کی گھنی ٹہنیاں نیچے تک آ گئی تھیں۔ ان کے تنوں پر جنگلی سیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اب ڈر کے مارے بالکل میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پیچھے گردن پھیر کر دیکھ لی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”تم پیچھے کیوں دیکھتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”مجھے ڈر ہے پیچھے سے کوئی شیر چیتا حملہ نہ کر دے۔“

اس کا ڈر خوف حق بجانب تھا۔ مجھے خود کسی وقت ڈر لگنے لگا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر پاچیتا نکل آیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو پتل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ ہم جنگل میں جب کالی دور نکل آئے تو اچانک سانپ رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر پھن کھول لیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے بار بار پھنکارنے لگا۔

سامنے اوچی اوچی جنگلی جھاڑیوں نے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کاچی! میرا خیال ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔“

میں نے سانپ کو اٹھالیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھاڑیوں کی دیوار کو ایک جگہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آگے ایک پرانا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے کسی حویلی کا بوسیدہ گھنڈر تھا۔ تالاب کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ کاچی بھی میرے پاس



میں نے کہا۔ ”وہاں راج گرو پنڈت تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کو بیتہ چل چکا ہوگا کہ اس کو قیمتی سانپ سے تم نے ہی محروم کیا ہے۔“

کاچی نے کہا۔ ”میں اس کے مندر میں نہیں جاؤں گی میں کیلاش پر بت ستا آگے تبت اپنے آبائی وطن چلی جاؤں گی۔“

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ کاچی نے مجھ سے پوچھا۔

”تم کہاں جاؤ گے؟ کیا پاروتی دیوی پھر سے انسانی شکل میں واپس آ جائے گی میرا تو خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ اگر انسانی شکل میں واپس آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو تمہیں دیکھ کر جب اس کی یادداشت واپس آ گئی ہے تو وہ انسانی شکل میں بھی واپس آ جاتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ پنڈت نے اس پر کچھ ایسا منتر پھونکا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دوبارہ انسانی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔“

کاچی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ پاروتی کی یادداشت کسی بھی وجہ سے واپس آ گئی تھی مگر انسانی شکل میں واپس آنے یا سانپ کے روپ میں ہی مجھ سے باتیں کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ پہلے جب بھی وہ نیلے سانپ کا روپ بدلتی تھی تو مجھ سے انسانی آواز میں باتیں کیا کرتی تھی لیکن اب اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ان خیالات کا اظہار کاچی سے کیا تو وہ بولی۔

”تم اس سے بات کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے تمہارے بات کرنے سے اس کے اندر کی جچی ہوئی طاقت بیدار ہو جائے وہ انسانی آواز میں باتیں کرنے لگے۔“

ہم وہیں رک گئے۔ میں نے جیب سے نیلے

سانپ کو نکال کر اپنے سامنے کیا اور کہا۔

”پاروتی! مجھے یقین ہے کہ تم ہی پاروتی ہو تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے اور تم مجھے پہچان رہی ہو۔ مجھ سے بات کرو۔“

نیلے سانپ اپنی گردن اٹھا کر جیسے نمکنی باندھے میری طرف تنکے لگا۔ مجھے پاروتی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔

”پاروتی! میں تمہارا دیرینہ ساتھی ہوں مجھ سے پلیز اپنی آواز میں بات کرو۔“

میں نے دو تین بار یہ جملہ دہرایا مگر نیلے سانپ نے کوئی بات نہ کی۔ بس اپنی گردن میری کلائی کے ساتھ بے بسی کے عالم میں بار بار لگاتا رہا۔ کاچی بولی۔

”یقین کرو پاروتی دیوی تمہاری بات سن رہی ہے۔ سمجھ رہی ہے مگر وہ پنڈت کے طلسمی منتر کی وجہ سے کچھ بولنے سے معذور ہے۔ وہ بات نہیں کر سکتی۔ نہ انسانی شکل میں واپس آ سکتی ہے۔ تمہیں سب سے پہلے پاروتی پر جو طلسم کیا گیا ہے اسے توڑنا ہوگا۔“

میں نے نیلے سانپ کو جیب میں رکھا اور کہا۔

”پہلے یہاں سے نکلو۔ یہاں سے نکلنے کے بعد سوچیں گے کہ پنڈت کے طلسم کو کس طرح توڑا جاسکتا ہے؟“

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب کھڈ کی اونچی دیواریں تھیں۔ ان دیواروں پر جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم کافی دیر تک اس گھاٹی کے اندر چلتے رہے۔ آخر ایک جگہ باہر نکلے تو سامنے کچھ فاصلے پر ریلوے سنگل نظر پڑی۔ کاچی اسے دیکھ کر بولی۔

”یہ ریلوے لائن ناگ پور سے اوپر کی جانب صوبہ بہار کو جاتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم اسی طرف چلتے ہیں۔ لیکن ہمیں کسی اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہوگی ہم پیدل کب تک چلتے نہیں گے۔“

ہم ریلوے لائن کے ٹریک پر چڑھ گئے اور مشرق کی طرف چلنے لگے۔ ناگ پور کا اسٹیشن ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک ہمیں گر گر کر ڈی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ریلوے لائن پر ایک ٹرالی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اوپر سرخ جھنڈی لہرا رہی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”رک جاؤ! ہم اس ٹرالی پر آ گئے سفر کریں گے۔“

میں نے ٹرالی کو ہاتھ دیا۔ ٹرالی میں ریلوے کے افسریا مکینک ٹاپ آ دی سوار تھے۔ دو آ دی ٹرالی کو دھکا لگا رہے تھے۔ جوگی اور سادھو لوگوں کی بھارت میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ٹرالی پر بیٹھے ہوئے ریلوے افسروں نے ایک جوگی اور جوگن کو ہاتھ اٹھائے دیکھا تو اس نے ٹرالی رکوائی اور ہم سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔

”ہم جوگی لوگ ہیں۔ یا ترا کو ادھر آئے ہیں۔ چلتے چلتے تھک گئے ہیں۔ ہمیں اپنی ٹرالی پر بٹھالو۔“

ریلوے افسر نے کہا۔ ”بیٹھو مہاراج! بیٹھ جاؤ۔“

میں اور کاچی ٹرالی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرالی ریلوے لائن پر آگے چل پڑی۔ ریلوے افسر نے پوچھا۔

”مہاراج! آپ کہاں جائیں گے؟“

میں نے اس سے سوال پوچھا۔

”آگے کونسا شہر ہے؟“

وہ کہنے لگا۔ ”مہاراج آگے تو رائے پور کا شہر ہے مگر وہ شہر تو یہاں سے بہت دور ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھیا ہم صوبہ بہار کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ وہاں کے مندروں کی یا ترا کرنے کا ارادہ

ہے۔“

ریلوے افسر نے کہا۔

”مہاراج! صوبہ بہار تو رائے پور کے آگے شروع ہوتا ہے اور پہلے بڑا شہر رانچی آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بس ہمیں رانچی ہی پہنچا دو۔“

ریلوے افسر ہنسنے لگا۔ بولا۔ ”مہاراج میری ٹرالی تو اگلے اسٹیشن گڑھ تک جائے گی۔ وہاں سٹاپ کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں اور رائے پور چلے جائیں۔ رائے پور سٹاپ کو رانچی کی گاڑی مل جائے گی۔“

مجھے اطمینان ہو گیا۔ ریلوے افسر نے ہمیں اس علاقے سے نکل کر بہار پہنچنے کا راستہ دکھایا تھا۔ ٹرالی ایک خاص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ اس کی اسپیڈورا ٹم ہونے لگتی تو دو فلی ریلوے لائن پر اتر جاتے اور لائن پر دوڑتے ہوئے اسے دھکا لگانا شروع کر دیتے۔ جب ٹرالی اپنی خاص رفتار پکڑ لیتی تو وہ ایک کر ٹرالی پر بیٹھ جاتے۔ اسی طرح کوئی آدھے گھنٹے کے ٹرالی سفر کے بعد گڑھ کا مضامانی ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ ہم ٹرالی سے اتر کر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے اور رائے پور جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک قلی نے ہمیں بتایا کہ رائے پور گاڑی شام کو جائے گی۔ ہم نے وہیں ٹھوڑا بہت ٹھکانا کھایا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ نیلا سانپ میری جیب میں تھا اور بڑے سکون کے ساتھ تھا۔

جیسے سو رہا ہو۔ میں نے کاچی سے کہا۔

”کاچی! تمہارے خیال میں مجھے پاروتی کو پھر سے انسانی روپ میں لانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ تم اس قسم کی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ تم کیلاش پر بت کے ناگ مندر میں بھی رہ چکی ہو۔ کیا تمہیں کوئی ایسا چلہ یا وہ ہے جس کو کر کے پاروتی سانپ سے واپس انسانی شکل اختیار کر لے؟“

کاچی کچھ دیر غور کرتی رہی پھر بولی۔  
”مجھے ایسا کوئی چلہ نہیں آتا۔ یہ باتیں میری طاقت سے باہر ہیں۔“

وہ اتنا کر کہ خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔  
”کیا بہار کے کسی مندر میں کوئی ایسا سا دھون نہیں ہے جو اپنا منتر پھونک کر پاروتی پر کئے گئے طلسم کو ختم کر دے۔“

اچانک کاچی کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔  
”ایک بات ہو سکتی ہے۔“

”میں نے پوچھا۔“ وہ کیا؟“  
اس نے کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا۔ راچی میں سنا ہے

ایک باوی ہے جہاں ایک مسلمان درویش رہتا ہے۔  
وہ بڑا کرنی والا فقیر ہے۔ لوگ بڑی دور دور سے اپنی

مرادیں پوری کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔ اس  
کے پاس چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پاروتی کو سانپ

سے دوبارہ انسانی شکل میں لاتے۔“  
”اس بزرگ کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

کاچی نے کہا۔  
”نام تو مجھے معلوم نہیں سنا ہے اسے باوی والا فقیر

کہتے ہیں۔ راچی چل کر اس کا پتہ پوچھ لیں گے۔“  
مجھے تھوڑی سی امید پیدا ہو گئی۔ جب رائے پور

جانے والی ریل گاڑی آئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔  
نکلت تو ہمیں لگتی نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔

مسافروں نے ہمارے لیے جگہ بنادی اور سارا راستہ  
خدمت کرتے رہے۔ رائے پور کا شہر وہاں سے بہت

دور تھا۔ دوسرے دن ہم رائے پور پہنچے۔ وہاں سے  
گاڑی بدلی اور راچی والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اس

طرح سفر کرتے کرتے ہم جس وقت راچی کے  
ریلوے اسٹیشن پر اترے تو دن کافی نکل آیا تھا۔ ہم

نے اسٹیشن سے باہر آ کر ایک آدمی سے بادی والے  
فقیر کے بارے میں پوچھا۔ وہ آ دی بولا۔

”تمہیں باوی والے باباجی کے درشنوں کو جانا  
ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں بھیا! ہم جوگی لوگ ضرور ہیں  
مگر باوی والے باباجی کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں۔

وہ بڑی کرنی والے فقیر ہیں۔ ہم ان کے درشنوں  
کو جا رہے ہیں۔“ وہ آدمی کہنے لگا۔

”یہاں سے یکے میں بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں باوٹی  
والے باباجی کے استھان پر پہنچا دے گا۔“

ساتھ ساتھ لوگوں کا ڈھونڈنا۔ وہاں ہمارے پنجاب کی  
طرح کے تانگلے نہیں تھے بلکہ یکے تھے جو بڑھئی

طرح کے تھے مگر ان پر چار شیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ میں  
نے یکے والے سے کہا۔

”بابا لوگ ہمیں باباجی باوی والے کے استھان  
پر پہنچا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔“

یکے والا نیچے اتر آیا۔ کہنے لگا۔  
”پدھارے مہناراج۔“

میں اور کاچی یکے پر سوار ہو گئے۔ یکے والا آگے  
ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور یکے روانہ ہو گیا۔ سڑک غیر ہموار

تھی۔ یکے خوب ہچکوکے لے کر ہاتھ اٹھا۔ کوئی آدھے گھنٹے  
بعد دور سے ہمیں ایک ٹیلہ نظر آیا۔ یکے والا کہنے لگا۔

”مہناراج! اس ٹیلے کے پاس باباجی رہتے  
ہیں۔“

سارا راستہ کوچان ہمیں باباجی کی کرامتیں سناتا آیا  
کہ انہوں نے کس طرح ایک کوڑھی کے جسم پر ہاتھ

پھیرا اور کوڑھی ٹھیک ہو گیا۔ کس طرح ایک نابینا کی  
آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کی بینائی واپس آ گئی۔ ہم

خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔  
ٹیلے کے پاس جا کر یکے ایک پتیل کے درخت

کے پاس رک گیا۔ وہاں پہلے سے دو تین یکے کھڑے  
تھے۔ عورتیں اور مرد ایک طرف بیٹھے تھے۔ سامنے

پتھر کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جہاں  
ایک دربان پہرہ دے رہا تھا۔ جو کوئی آدمی یا عورت

اندر جانے کی کوشش کرتی وہ اسے پیچھے ہٹا کر کہتا۔  
”ابھی تمہاری باری نہیں آئی کل آتا۔“

ہم یکے سے اتر کر دربان کے پاس گئے۔ دربان  
نے ایک جوگی اور جوگن کو دیکھا تو کسی قدر تعجب سے

پوچھا۔  
”آپ تو ہندو ہیں۔ باباجی مسلمان ہیں آپ کس

لیتے ہیں؟“  
دربان مسلمان تھا۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا

تھا۔ سر پر سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ میں اسے یہ نہیں  
بتا سکتا تھا کہ بھائی میں بھی مسلمان ہوں۔ کیونکہ کاچی

پر میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں  
نے کہا۔

”بھیا! ہم باباجی کے درشن کرتے آئے ہیں۔“  
دربان بولا۔ ”بابا لوگ آپ اپنی باری کا انتظار

کریں۔ جو لوگ پہلے آئے ہوتے ہیں وہ بھگت لیں تو  
پھر آپ کا اندر جانے کی اجازت ملے گی۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بھیا! ہم اپنی باری  
کا انتظار کر لیتے ہیں مگر ہماری باری کب آئے گی؟“

دربان نے حساب لگا کر کہا۔  
”شام تو پڑ جائے گی۔“

عین اس وقت بڑے زور سے پھنکار کی آواز آئی  
اور ٹیلا سانپ میری جیب سے اچھل کر زمین پر

آ گیا اور پھن لہراتے ہوئے پھنکارنے لگا۔ دربان  
ڈر کر پرے ہو گیا اور بولا۔

”اس کو پکڑو۔ اس کو پکڑو۔“  
میں نے جلدی سے نیلے سانپ یعنی پاروتی کو

پکڑا اور جیب میں ڈالنے ہوئے دربان سے کہا۔  
”بھائی ہمیں معاف کر دینا۔ ہم تمہیں ڈرانا بالکل

نہیں چاہتے تھے۔ یہ سانپ اپنے آپ باہر نکل آیا  
ہے۔ ہم اپنی باری پر ہی باباجی کے درشن کریں گے۔“

میں اور کاچی واپس جانے ہی لگے تھے کہ اندر  
سے ایک آدمی دوڑتا ہوا دروازے پر آیا اور دربان سے

بولا۔  
”رجو! باباجی کا حکم ہے کہ جو جوگی اور جوگن آئے

ہیں انہیں میرے پاس بھیج دو۔“  
میں تو حیران رہ گیا۔ کاچی نے میری طرف بڑے

فخر کے ساتھ دیکھا اور ہستہ سے کہا۔  
”دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ باوی والے باباجی بڑی

کرنی والے فقیر ہیں۔ دیکھ لو انہیں ہمارے آنے کی  
فورا خبر ہو گئی۔ حالانکہ انہیں کسی نے اندر جا کر نہیں

بتایا۔“  
دربان نے اسی وقت ہمیں اندر جانے کی اجازت

دے دی اور دروازے سے پرے ہٹ گیا۔ جتاو  
بیغام لے کر آیا تھا اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

”تشریف لائیے۔ باباجی آپ کا انتظار کر رہے  
ہیں۔“

ہم اس آدمی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آگے  
ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی۔ دونوں جانب جھونپڑیاں

بنی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر میں بھی ایک چھوٹی سی  
جھونپڑی بنی ہوئی تھی اس جھونپڑی کے باہر آگ پر

دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ شاید زائرین کے لیے بھنڈار  
پک رہا تھا۔ جھونپڑی کے باہر دو فقیر آسنے سامنے

سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے مراقبے میں ہوں۔ ہمیں  
وہیں رکے کا اشارہ کر کے وہ آدمی خود جھونپڑی کا ٹاٹ

اٹھا کر اندر چلا گیا۔ فوراً ہی باہر آیا اور اشارے سے  
ہمیں اندر جانے کو کہا۔ خود ایک طرف ہٹ گیا۔ میں

آگے آگے تھا۔ کانچی میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں ٹاٹ اٹھا کر اندر گیا تو دیکھا کہ فرش پر بھی ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سفید ریش بزرگ بیٹھا ہے۔ سر پر سبز عمامہ ہے۔ بدن پر سبز رنگ کا چنڈ ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر جاتے ہی انہیں کہا۔  
 ”السلام علیکم!“  
 ”وعلیکم السلام۔“

بزرگ نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور کانچی بزرگ کے قدموں میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ باباجی نے مجھ پر بھرپور نگاہ ڈالی اور بڑی نرم آواز میں کہا۔  
 ”بیٹا! مسلمان ہو تو مسلمان بن کر دکھاؤ۔ ہمیشہ مسلمان بنے رہو۔ ہندو کیوں بنتے ہو؟“  
 میں نے دیکھا کہ کانچی چونک کر مجھے تنکے لگی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ میں ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہوں۔ مجھے کانچی کی پروا نہیں تھی۔ میں صرف پارونی کی خاطر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”باباجی! آپ میرے دل کا حال جانتے ہیں کہ میں نے ہندوؤں دالا بھیس کس لیے بدلا۔“  
 باباجی نے کہا۔

”چاہے کچھ بھی ہو۔ تمہیں اللہ کا دروازہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔“  
 وہ چپ ہو گئے۔ جھونپڑی میں خاموشی چھا گئی۔ مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ باباجی شاید میرے دل کا حال جان گئے ہیں۔ کانچی بھی چپ چاپ بڑے ادب سے بیٹھی تھی۔ اتنے میں باباجی کہنے لگے۔

”میں جانتا ہوں تم کس لیے میرے پاس آئے ہو۔ میں تمہاری ضرورت مدد کروں گا۔ لیکن جتنا مجھے

میرے خدا نے اختیار دیا ہوا ہے اتنی ہی مدد کروں گا۔ تمہاری جیب میں جو سانپ ہے اسے باہر نکالو۔“  
 میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلا سانپ نکال کر وہیں بیچا اپنے سامنے ٹاٹ پر رکھ دیا۔ پارونی یعنی نیلے سانپ پر بھی باباجی کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ بھی ادب سے سر جھکا کر سمٹ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ نہ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور نہ پھنکار ماری۔ باباجی نے گہری نگاہ سانپ پر ڈالی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

”ہم اس قسم کی شعبہ بازیوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ ہم تو یہاں دھمی اور بیمار لوگوں کی خدمت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جس سانپ کو تم ہمارے پاس لائے ہو۔ یہ ایک ایسی عورت ہے جس کے دل میں ہمیں اسلام کے نور کی کرن چھوٹی نظر آ رہی ہے۔“

مجھے یاد آ گیا کہ پارونی کو شروع ہی سے بتوں کی پوجا سے نفرت تھی اور وہ مجھے کہا کرتی تھی کہ ایسا لگتا ہے کسی روز میں ان سب بتوں کو توڑ پھوڑ کر تمہارے مذہب اسلام میں داخل ہو جاؤں گی۔ میں باباجی کی روشن ضمیری کا زبردست قائل ہو گیا تھا۔ میں کچھ کہنے لگا تو باباجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور کہا۔

”میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اس سانپ کو پھر سے عورت کی شکل میں لے آئیں۔“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں باباجی!“  
 باباجی نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

(باقی آئندہ ماہ)

